سلسلہ ندوۃ المصنفین ۱۳۶

عثمان ذوالنورینؓ

(رضی اللہ عنہ)

تالیف

پروفیسر مولانا سعید احمد اکبر آبادی

صنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

باہتمام:

عثمان ذوالنورین رض

یعنی

مظلوم خلیفۂ سوئم حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا نہایت مفصل اور مبسوط تذکرہ، جس میں آپ کے ذاتی حالات وسوانح، عظیم الشان دینی وسیاسی اور اصلاحی کارناموں اور خدماتِ جلیلہ کے علاوہ اُس عہد میں جو فتنہ پیدا ہوا اس کے اسباب وعلل اور اس سلسلہ کے تمام واقعات وحوادث پر نہایت جامع اور محققانہ بحث وگفتگو کرکے احقاقِ حق کیا گیا ہے۔

تالیف
پروفیسر مولانا سعید احمد اکبر آبادی

ندوۃ المصنفین جامع مسجد، دہلی

طبع اول تعداد ——— ۱۱۰۰
مورخہ محرم ۱۴۰۴ھ
مطابق اکتوبر ۱۹۸۳ء

قیمت غیر مجلّد — بیالیس روپے -/42
قیمت مجلّد —

باھتمام: عمید الرحمن عثمانی

مطبوعہ نیو پبلک آفسٹ پریس دہلی

ناشر

ندوۃ المصنفین — اردو بازار — دہلی

فہرست مضامین

تعارف

از مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شخصیت تاریخ اسلام میں جس درجہ اہم اور نہایت عظیم الشان ہے اسی درجہ میں ان کا واقعۂ شہادت اسلام کا سب سے بڑا المیہ ہے، لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ تاریخ میں غلط سلط اور صحیح روایات کچھ اس طرح گڈمڈ ہوگئی ہیں کہ دودھ کا پانی سے الگ کرلینا آسان نہیں رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دریدہ قلم مورخین و ارباب قلم کا ذکر نہیں محتاط اور ثقہ مصنفین بھی حضرت عثمان پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا جواب دیتے ہیں تو اس طرح گویا معذرت کر رہے ہیں۔ حضرت عثمان پر پورا لٹریچر، خواہ کسی زبان میں ہو پڑھ جائیے آپ کو یہی عام فضا قائم نظر آئے گی، اس بناء پر بڑی سخت ضرورت تھی ایک ایسی جامع اور محققانہ کتاب کی جو تمام روایات متعلقہ کا دقت نظر سے تنقیدی جائزہ لے کر حقیقت کے اصل رخ روشن اور اس کے خد و خال کو بے نقاب کر سکے۔

برادر عزیز مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے قیام کلکتہ (از فروری ۴۹ء تا مارچ ۵۹ء)

کے زمانہ میں جب اپنی شہرۂ آفاق کتاب "صدیق اکبر" لکھی تھی تو اسی وقت ان کا منصوبہ تھا اور اس کا اعلان کر بھی دیا تھا کہ اب علی الترتیب وہ حضرت عثمان اور حضرت علی پر الگ الگ ایک مستقل کتاب لکھیں گے، چنانچہ جن حضرات نے صدیق اکبر کا مطالعہ کیا تھا وہ اب حضرت عثمان پر کتاب کے لیے چشم براہ ہو گئے، لیکن برادر عزیز کلکتہ سے منتقل ہو کر علی گڑھ آئے اور یہاں یونیورسٹی کے چند در چند فرائض منصبی اور ان کے ساتھ ہی ملکی اور غیر ملکی اسفار اور ان کی علمی اور تعلیمی مصروفیتوں میں اس درجہ منہمک ہو گئے کہ اگرچہ اس عرصہ میں ان کا قلم برابر رواں دواں رہا اور سیرت عثمان پر کتاب لکھنے کے خیال سے ان کا ذہن کبھی غافل نہیں ہوا لیکن منصوبہ کی تکمیل کے لیے جو فرصت اور یکسوئی درکار تھی وہ میسر نہیں آئی۔ عجب صورت حال تھی، ایک طرف برصغیر کے ارباب ذوق دوستوں کے ہر طرف سے تقاضے ہو رہے تھے اور دوسری طرف مصنف مصروفیات کے ہجوم میں پراگندہ دماغی کے باعث قلم اٹھا اٹھا کر رکھ دیتا تھا۔

آخر مارچ ۱۹۷۶ء میں مصنف ایک برس کے لیے کالی کٹ یونیورسٹی (کیرالا) کے شعبۂ عربی میں وزٹینگ پروفیسر ہو کر چلے گئے، اول تو کیرالا خود بہت خوب صورت علاقہ ہے، یہاں کا موسم معتدل اور خوش گوار رہتا ہے اور پھر یونیورسٹی ایک نہایت پرفضا مقام پر آباد ہے، یہاں لائبریری بھی بڑی شاندار ہے اور تنہائی اور فرصت بھی تھی اس لیے مصنف نے سیرت عثمان کا کام پابندی اور باقاعدگی سے شروع کر دیا اور کتاب کا ایک بڑا حصہ مکمل کر لیا، لیکن کتاب کے مکمل ہونے پر بھی تاخیر اس لیے ہوئی کہ مصنف کو بعض چیزوں کی جستجو تھی وہ ادھر ادھر انھیں تلاش کرتے رہے مگر افسوس کہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ بہرحال کتاب اب ندوۃ المصنفین کی طرف سے شائع ہو رہی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی پیش رو کتاب صدیق اکبر کی طرح اسے بھی حسن قبول کی دولت سے سرفراز فرمائے، آمین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کا شکر گزار ہوں کہ ان کو جو تعلق خاطر ندوۃ المصنفین

سے شروع ہے اس کی وجہ سے انھوں نے اس کتاب پر ایک فاضلانہ پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی، فجزاہُ اللہ

(مفتی) عتیق الرحمٰن عثمانی

ناظم ندوۃ المصنفین، دہلی

۱۰ اکتوبر ۸۲ء

پیش لفظ

از پروفیسر خلیق احمد نظامی، صدر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"بعلم الیقین دانستہ شد کہ اثبات خلافت ایں
بزرگواران اصلی ست از اصول دین، تا وقتے کہ ایں
اصل را محکم نگیرند، ہیچ مسئلہ از مسائل شریعت محکم نشود"

اس حقیقت کے پیش نظر خلفاء راشدین کی زندگی کا ہر ہر گوشہ، ان کی فکر اور عمل کے انفرادی اور اجتماعی پہلو، ان کا انداز جہاں بینی، ان کا سلیقۂ جہانبانی، ان کی دینی بصیرت، ان کا فقہی اجتہاد ـــــ سب پر گہرے غور اور فکر کی ضرورت ہے تاکہ دین و شریعت کی روح کو سمجھا جا سکے اور صحیح تفسیر و تعبیر کی راہیں سامنے آ جائیں۔ یہ کام صرف اس صورت میں ممکن ہے جب تاریخی ماخذ پر کامل عبور کے ساتھ ساتھ، رجال و اسناد پر گہری نظر ہو، عوامل و محرکات کے ہر ہر پہلو کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور حالات و واقعات کو تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر صحیح پس منظر میں دیکھنے کی جستجو کی جائے۔ اس کے بغیر کوئی علمی کاوش بارآور

نہیں ہو سکتی اور خلافت راشدہ کی اہمیت کا وہ پہلو جس کی طرف شاہ صاحبؒ نے اشارہ کیا ہے، سامنے نہیں آسکتا۔ ہمارے فاضل دوست اور صدیق محترم مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے "صدیق اکبرؓ" لکھ کر جو علمی خدمت انجام دی ہے، وہ اس طرزِ تحقیق کی بہترین مثال ہے۔ اس سے نہ صرف حضرت ابو بکر صدیقؓ کی حیات طیبہ اور عہد خلافت کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے، بلکہ بہت سی تاریخی گتھیاں خود بخود سلجھ جاتی ہیں۔ مولانا اکبر آبادی کے علمی تبحر، صلابت فکر، محققانہ انداز، شگفتہ اسلوب بیان نے "صدیق اکبرؓ" کو شاندار علمی شاہ کار بنا دیا ہے۔ اِدھر چند سال سے وہ عہد عثمانی کے تاریخی ماخذ کو دن رات اس طرح کھنگالنے میں مصروف تھے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے تصوّر نے اس عہد کی ایک ایک کڑی کو مربوط کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان کی اس شبانہ روز محنت کا ثمر اس وقت پیش نظر ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں مولانا اکبر آبادی نے ماضی کے علمار اسلام کی بصیرت اور عہد جدید کے مورخین کی بصارت (جو انھوں نے تاریخی روایات کی تنقید میں دکھائی ہے) دونوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ ان کے وسیع مطالعے اور تاریخی ژرف نگاہی نے اس موضوع کو بڑا دلکش بنا دیا ہے۔ قدیم وجدید ماخذ و طریقہ ہائے تحقیق و تنقید پر ان کے یکساں عبور نے ان کے انداز بیان میں غیر معمولی تاثیر اور علمی گہرائی پیدا کر دی ہے۔ وہ رائے قائم کرنے سے پہلے اپنے مواد کو بڑی احتیاط سے تحقیق اور تنقید کی چھلنی میں چھانتے ہیں اور پھر جو کچھ لکھتے ہیں اس کے پیچھے دلائل کا زور اور ماخذ کی سند ہوتی ہے۔

حضرت عثمانؓ کی سیرت کے سلسلے میں مولانا اکبر آبادی نے سب سے پہلے تاریخی مواد کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ مورخین کی نفسیات، ان کے محرکاتِ ذہنی، ان کے ماحول اور حالات گرد و پیش کا جائزہ لیئے بغیر خام تاریخی مواد کو صحیح تاریخی تصویر بنانے میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جو رائے بھی قائم کی ہے

وہ تاریخی تحقیق اور تنقید کے پیمانوں پر پوری اترتی ہے۔

حضرت عثمان کو صحابۂ کرام میں جو فضیلت اور عظمت حاصل ہے وہ اظہر من الشمس ہے، وہ "السابقون الاولون" میں تھے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، اور حضرت زید بن حارثہ کے بعد وہ شخص تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ "ذو النورین" تھے کہ حضور سرور کائنات نے یکے بعد دیگرے اپنی دو صاحبزادیوں کو ان کے نکاح میں دیا، اور فرمایا: "اگر میری چالیس بٹیاں بھی ہوتیں تو انھیں یکے بعد عثمان کے نکاح میں دے دیتا"۔ وہ "غنی" تھے کہ انھوں نے اپنی ساری دولت کو دین اور ملت کی نذر کر دیا۔ غزوہ تبوک میں جب سامان رسد کے لیۓ انھوں نے ایک ہزار اونٹ، ۵۰ گھوڑے، اور ایک ہزار دینار پیش کئے تو حضور سرورِ کائنات بے اختیار پکار اٹھے "ماضر عثمان ماعمل بعد ہذا الیوم"۔ ان ہی کے لیے رسول اکرمؐ نے "بیعۃ الرضوان" لی۔ انھیں کاتب وحی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کو مسجد الحرام کی توسیع کرانے کی سعادت میسر آئی، انھوں نے تمام عالم اسلام کو ایک مصحف اور قرأت پر جمع کیا اور "جامع القرآن" کے لقب سے مشہور ہوۓ۔ ان کی سیرت کے غیر معمولی اوصاف کے پیش نظر امت نے ان کے لیۓ "کامل الحیاء والایمان" کے الفاظ استعمال کئے۔ زندگی کے یہ کتنے مختلف النوع گوشے ہیں جہاں انھوں نے اپنی سیرت کا غیر فانی نقش چھوڑا ہے ان کے سیرت نگار کو ان تمام اوصاف و کمالات کا ایک ایک پہلو اجاگر کرنا ہوگا جب ہی ان کی شخصیت اور کارناموں کی حقیقی نوعیت واضح ہو سکے گی۔ مولانا اکبرآبادی نے یہ کام جس عالمانہ بصیرت کے ساتھ انجام دیا ہے اس کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں جنھوں نے تحقیق کے خارزار میں سفر کی صعوبتیں برداشت کی ہوں۔

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ملتِ اسلامیہ کو فتنوں نے ہر طرف سے گھیر لیا تھا سازشوں کا جال ہر طرف بچھا ہوا تھا۔ باغی آمادۂ پیکار گھوم رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے مختلف اوقات میں باغیوں کے سامنے جو تقریریں کی تھیں وہ طبری، ابن اثیر، مسند ابن حنبل، ابن سعد میں

میں نقل ہوئی ہیں۔ ان سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ملت کو انتشار اور ابتری سے بچانے کے لیے نہ صرف ہر صعوبت اور اذیت کو برداشت کیا بلکہ بخوشی اپنا سر دے دیا۔ ایک بار باغیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں کسی کو تم سے لڑنے کی اجازت نہ دوں گا جو ایسا کرے گا وہ میرے حکم کے خلاف کرے گا۔ اگر میں جنگ ہی کرنا چاہتا تو میرے حکم پر ہر طرف سے فوجوں کا ہجوم ہو جاتا، یا میں خود کسی محفوظ مقام پر چلا جاتا۔"

باغیوں کا مقابلہ نہ کرنے کا فیصلہ عدم استطاعت کی بناء پر نہیں بلکہ ملت کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر تھا۔ باغیوں کو در پے شہادت پا کر ایک بار کہا:

"یاد رکھو، بخدا اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر تا قیامت نہ ایک ساتھ نماز پڑھو گے نہ ایک ساتھ جہاد کرو گے۔"

ان کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی وحدت ملی کا شیرازہ بکھر گیا۔ حضرت علیؓ کو جب مسجد نبوی میں شہادتِ عثمانؓ کی خبر ملی تو پکار اٹھے:

"جاؤ اب ہمیشہ کے لیے تمہارے واسطے ہلاکت اور بربادی ہے"

اسی طرح حضرت عبداللہؓ بن سلام نے ان کی شہادت پر کہا تھا "آج عرب کی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔"

عہد عثمانی کے ان واقعات کا تاریخی تجزیہ اسلامی تاریخ کے مبصر کا سب سے اہم لیکن دشوار کام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اور مورخین دونوں نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ ان کے عہد کے فتنوں کے جائزے میں الجھ کر ان کی سیرت اور کارناموں کے بہت سے پہلو نظروں سے اوجھل ہو رہے ہیں۔ ان کے عہد کی فتوحات تاریخ اسلام کا ایک شاندار باب ہیں۔ انھوں نے آرمینیہ، آذربائیجان، ایشیائے کوچک، ترکستان، کابل، سندھ، قبرص

اسپین وغیرہ میں عربوں کے سیاسی اقتدار کے لیے راہیں ہموار کردی تھیں، ان ہی کے زمانے میں بحری طاقت منظم ہوئی۔ بتیترنظام حکومت کے معاملات میں گو وہ حضرت عمرؓ کے نقشِ قدم پر چلے لیکن طبیعت کی نرمی اور غیر معمولی حلم سے مخالفین نے فائدہ اٹھاکر طرف سازشوں کا جال بچھادیا۔

مولانا اکبرآبادی نے ان تمام مسائل پر غور وفکر کیا ہے اور ہر ہر واقعہ کی تحقیق میں مغز سوزی کی ہے۔ مولانا کے متعلق کچھ لکھنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ ان کا مطالعہ وسیع، نگاہ عمیق، اور ذہن کھلا ہوا ہے۔ جس کے کاروان علمی کا رخت سفر یہ تین چیزیں ہوں اس کے نتائج فکر سے تحقیق کی گزرگاہوں کا روشن ہوجانا تعجب کی بات نہیں۔ یقین ہے کہ علماء ومورخین سب ہی ان کی تحقیقات علمی سے مستفید ہوں گے اور قرونِ اولیٰ کی تاریخ پر کام کرنے کے لیے نئے زاویہ ہائے نگاہ سامنے آجائیں گے۔ مولانا اکبرآبادی اس عظیم الشان کارنامے پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مقدمہ

گزشتہ زمانے کے لوگوں کے حوادث و واقعات سننے کا شوق ہر ایک انسان کو فطری طور پر ہوتا ہے، پھر عرب کا حال تو یہ تھا کہ شعر و شاعری کی طرح تاریخ کا ذوق بچہ بچہ کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ان کے اشعار اور قصائد خود عرب قبائل کے تاریخی واقعات کا آئینہ ہوتے تھے۔ اسی بناء پر ان کے اشعار کو دیوان العرب کہتے تھے، اگرچہ عرب فن کتابت سے بالکل ناآشنا نہ تھے، تاہم ان کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ یہاں تک کہ قبائل اور ان کے اشخاص و افراد تو کیا گھوڑوں تک کے انساب و اسماء، مقامات، وادیوں اور پہاڑوں تک کے نام اور ان کا جغرافیہ زبانی یاد رکھتے اور اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے کو سناتے اور ان سے لطف اٹھاتے تھے، جب اسلام آیا تو چونکہ قرآن مجید میں قدیم قوموں اور مختلف لوگوں کے حالات و واقعات کثرت سے بیان کئے گئے ہیں، اور دنیا میں گھوم پھر کر عبرت پذیری کی غرض سے پرانے لوگوں کے تاریخی واقعات و حوادث کے مطالعہ

مشاہدہ کی تلقین کی گئی ہے اس بنا پر اب عربوں کا شوق تفحص و تجسس اور تاریخی ذوق تیز تر ہو گیا ہے۔

لیکن اسلام میں باقاعدہ تاریخ کی تدوین کا آغاز ۱۶ھ میں ہوا۔ جب کہ حضرت عمر نے حضرت علی اور دوسرے اکابر صحابہ کے مشورہ اور رائے سے رومی اور ایرانی سن جو اب تک عرب میں عام طور پر استعمال ہوتے تھے انھیں ترک کر کے سن ہجری کا آغاز کیا اور تمام ممالک محروسہ میں اس کا اعلان فرمایا۔ بروکلمان کے قول کے مطابق تاریخ اسلام میں یہ بڑا اہم واقعہ تھا، امیر معاویہ کے زمانہ تک گذشتہ بادشاہوں کے حالات و واقعات، ان کی جنگوں اور کارناموں کو باقاعدہ قلمبند کرنے کا رواج عرب میں عام ہو گیا تھا، مسعودی کی روایت ہے کہ امیر معاویہ کو عرب و عجم کی تاریخ سے واقف ہونے کا بڑا شوق تھا۔ انھوں نے چند لوگوں کو تنخواہوں پر اسی کام پر معمور کر رکھا تھا کہ یہ لوگ شب میں امیر معاویہ کو تاریخ پڑھ کر سناتے تھے۔[۱] ان باتنخواہ لوگوں کے علاوہ امیر معاویہ ان لوگوں کو بھی وقتاً فوقتاً طلب کرتے رہتے جو عربوں کی گذشتہ تاریخ کے عالم ہوتے اور رات رات بھر ان سے عرب کے قبل اسلام کی تاریخ پر گفتگو کرتے، انھیں لوگوں میں ایک شخص دغفل المتوفی ۶۰ھ تھا جو انساب کا بہت بڑا ماہر تھا۔ دغفل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، عصر حاضر کے نامور محقق ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کو اٹلی کے ایک کتب خانہ میں اس کتاب کا ایک جز ۱۹۵۷ء میں دستیاب ہوا تھا، اس جز میں ان واقعات کا ذکر ہے جو عہد نبوی میں پیش آئے۔[۲]

---

[۱] مروج الذہب ج ۲ ص ۵۲

[۲] الذکری الالفیہ للشیخ الطوسی، ایران ص ۴۰۳

دغفل کے علاوہ عبید بن شریہ کا ذکر عام مورخین کرتے ہیں کہ یہ شخص امیر معاویہ کے دربار میں اکثر آمد و رفت رکھتا اور یمن اور وہاں کے قبائل کے حالات و واقعات بیان کرتا تھا۔ عبید بن شریہ کی طرف ایک کتاب بھی منسوب ہے جو ہندوستان میں طبع ہو چکی ہے۔ لیکن محققین کو اس کے اصلی ہونے میں شبہ ہے۔

وھب بن منبہ جو علمار یہود میں ایک ممتاز مقام رکھتے اور مسلمان ہو گئے تھے ان کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک کتاب "حمیر کے بادشاہوں کے حالات و واقعات، اور ان کے زمانہ کے شاعروں وغیرہ کے تذکرہ میں لکھی تھی۔ وھب بن منبہ کا سن وفات ۱۱۰ھ ہے۔ ابن خلکان نے اس کتاب کو دیکھا تھا۔[1] لیکن اب یہ معدوم ہے، بہر حال عرب کی تاریخ نویسی کا یہ پہلا دور تھا جس میں یمن اور اس کے ملوک و قبائل کا تذکرہ قصہ کہانیوں کے انداز میں ہوتا تھا اور دور از کار باتیں لکھی جاتی تھیں، اس بنا پر روایت اور درایت کے اعتبار سے ان کو استناد کا درجہ حاصل نہیں تھا۔

اموی عہد یعنی پہلی صدی ہجری کے نصف میں تاریخ نویسی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ خلافت راشدہ کا عہد ختم ہو چکا تھا۔ صحابہ اٹھنے لگے تھے، اس بنا پر جن وجوہ سے جمع و ترتیب قرآن اور تدوین حدیث کا داعیہ پیدا ہوا انھیں وجوہ سے اولاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور غزوات اور ثانیاً اسلام کی تاریخ اور صحابہ کے حالات زندگی کو قلم بند کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ داعیہ تاریخی ذوق و شعور کے علاوہ اس شدید احساس پر مبنی تھا کہ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوۂ حسنہ فرمایا گیا اور اس کے اتباع اور آپ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس بنا پر ضروری تھا کہ آپ کا ایک ایک عمل اور قول مدون ہوتا کہ اس کی روشنی میں قرآن مجید کی آیات احکام

---

[1] وفیات الاعیان ج ۵ ص ۸۸

اور اوامر و نواہی کی تشریح و تفسیر اور احکام فقہیہ کا استخراج و استنباط ممکن ہوا۔ اور چونکہ صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین تربیت یافتہ اور محرم اسرار و احکام شریعت تھے اس بنا پر ضروری تھا کہ صحابہ کرام کے سوانح حیات کو بھی مدون کیا جائے، لیکن اس مرحلہ پر ارباب تدوین تین قسموں پر منقسم ہو گئے، محدثین، ارباب سیرت اور اصحاب مغازی اگرچہ حدیث، سیرت اور مغازی یہ تینوں مضامین ایک دوسرے سے ملے جلے اور باہم مخلوط تھے۔ تاہم ان طبقات میں فرق یہ تھا کہ محدثین کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو مدون کرنا ارباب سیرت کا مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ کو از ولادت تا وفات اور اسی ضمن میں آپ کا خاندان، اور اس سے متعلق دوسرے احوال و کوائف کو قلم بند کر کے محفوظ بنانا تھا۔ چونکہ غزوات سیرت کا بہت اہم جز تھے اور محدثین و ارباب سیرت نے ان کے ساتھ کم اعتنا کیا تھا اس بنا پر ارباب مغازی نے خاص طور پر غزوات کو اپنا موضوع بنایا۔ اگرچہ سیرت نبوی کے دوسرے واقعات کا بھی اس میں تذکرہ ہوتا تھا۔

تاریخ نویسی کے اس دور ثانی میں حضرت عروۃ بن زبیر المتوفی ۹۴ھ کا نام سرفہرست ہے آپ حضرت زبیر بن عوام کے فرزند ارجمند اور حضرت ابوبکر کے نواسے تھے، کاشانۂ نبوت سے قریبی تعلق کے باعث سیرت اور مغازی[1] کی روایات کثرت سے آپ سے مروی ہیں، آپ نے المغازی کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو[2] اگرچہ اب نایاب ہے، لیکن طبری نے اس سے استفادہ کیا ہے اور ندیم صاحب الفہرست کی نظر سے بھی اس کا نسخہ گذرا تھا۔

---

[1] وفیات الاعیان ج ۵ ص ۸۸

[2] کشف الظنون حاجی خلیفہ ج ۵ ص ۶۴۶

اسی طرح ابان بن عثمان بن عفان المتوفی ۱۰۵ھ جو مدینہ کے مشہور فقیہ اور امام زہری کے شیخ تھے انھوں نے بھی سیرت نبوی پر ایک کتاب لکھی تھی، جو اگرچہ اب معدوم ہے لیکن ابن سعد نے حضرت عمر کی وفات کے سلسلہ میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ عروۃ بن زبیر اور ابان بن عثمان ان دونوں حضرات کی تصنیفات نے مدینہ میں سیرت نگاری کا ذوق عام کر دیا اور ان کے تتبع میں عبداللہ بن ابی بکر بن حزم، عاصم بن عمر بن قتادہ، محمد بن مسلم الزہری۔ اور موسیٰ بن عقبہ[1] اور آخر میں محمد ابن اسحاق نے سیرت پر کتابیں لکھیں۔

مدینہ کی روش پر بصرہ میں بھی سیرت نگاری کی تحریک شروع ہوئی اور متعدد حضرات نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں۔ ان میں مشہور یہ نام ہیں۔ سلیمان بن طرخان المتوفی ۱۴۳ھ اور معمر بن راشد المتوفی ۱۵۴ھ، اگرچہ ان حضرات کی کتابیں بھی آج معدوم ہیں، لیکن طبری، ابن سعد اور بلاذری نے ان کتابوں سے بہت کچھ نقل کیا ہے، لیکن جامعیت کے باعث جو شہرت اور مقبولیت سیرت محمد بن اسحاق کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہ ہو سکی۔

سیرت پر جو کتابیں لکھی جاتی تھیں ان میں گفتگو عہد نبوی تک محدود رہتی تھی۔ لیکن تاریخ نویسی کا تقاضہ تھا کہ اسلام کی پوری تاریخ قلم بند کی جائے۔ چنانچہ سیرت نگاری کا یہ خاص عہد ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ عام تاریخ نویسی کا دور شروع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں اولیت اور کثرت تصنیف کا سہرا ابو مخنف لوط بن یحییٰ الازدی

---

[1] ڈاکٹر احمد امین نے فجر الاسلام کے صفحہ ۱۵۸ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی کا ایک جزو دستیاب ہو گیا تھا اور اسے ۱۹۰۴ء میں طبع کر دیا گیا تھا۔

المتوفی سنہ ۱۳۰ھ کے سر ہے، حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جو واقعات و حوادث پیش آئے ابو مخنف نے ان پر بڑی وسعت اور افراط سے لکھا چنانچہ جنگ جمل و صفین، جنگ نہروان، خوارج، حضرت علی کی شہادت، حجر بن عدی کا محمد بن ابی بکر اور اشتر نخعی کا قتل، محمد بن ابی حذیفہ کا قتل، ان سب پر انھوں نے رسالے تحریر کیے۔ اسی طرح ان کی کتابیں حضرت عثمان کی شہادت، امام حسین کی شہادت، امیر معاویہ اور یزید کی ولایت پر بھی ہیں، جن میں ابو مخنف نے واقعہ حرہ اور عبداللہ بن زبیر کے مکہ میں محصور ہونے کا بھی تذکرہ کیا ہے، علاوہ ازیں اخبار الازارقہ، ودیر الجماجم اور اخبار مصعب بن زبیر وغیرہ پر بھی کتابیں لکھیں، اس طرز کی تاریخ نویسی کو اسحاق بن بشر، مدائنی، بلاذری، اور ابن عبدالحکم نے مزید ترقی دی اور اسلامی فتوحات کے حوادث و واقعات قلم بند کیے۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری کا زمانہ تاریخ اسلام پر تصنیف و تالیف کے عروج و ارتقا کا زمانہ ہے، اس دور میں جو نامور مؤرخ پیدا ہوئے ان کے مختصر حالات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

محمد بن اسحاق دوسری صدی ہجری کے مورخین میں محمد بن اسحاق مطلبی کا نام سر فہرست ہے، یہ تابعی تھے، مدینہ ان کا وطن تھا۔ آخر میں بغداد میں آبسے تھے، وہیں ۱۵۸ھ میں انتقال ہوا، ان کی کتاب السیرۃ والمبتدا والمغازی سیرت میں نہایت اہم اور قدیم ترین ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ طبری اور دوسرے مورخین نے اس پر پورا اعتماد کیا اور اس کے حوالے دیے ہیں۔

ابن ہشام عبدالملک بن ہشام المتوفی سنہ ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ، نے سیرت ابن اسحاق کی از سر نو ترتیب و تہذیب کی، جن باتوں کا تعلق سیرت سے نہ تھا یا جو روایات ناقابل اعتبار تھیں انھیں ترک کر دیا، مشکل اور غریب الاستعمال الفاظ کے

معانی لکھے، سیرت میں جو اشعار منقول تھے ان کی صحت و عدم صحت کے متعلق اپنی رائے لکھی، سیرت ابن ہشام کے نام سے جو کتاب مقبول عوام و خواص ہے وہ یہی سیرت ابن اسحاق کی تلخیص و ترتیب ہے، ابوالقاسم عبدالرحمٰن سہیلی المتوفی ۵۸۱ھ نے جن کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا ہے اس کتاب کی شرح لکھی تھی جو مصر میں ۱۹۱۴ء میں طبع ہو چکی ہے یہ عجیب و غریب شرح ہے۔ خود شارح نے مقدمہ کتاب میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے یہ شرح ایک سو بیس کتابوں کی مدد سے لکھی ہے،

اس دور کے مورخین میں ابن الکلبی المتوفی ۲۰۶ھ اور ابوعبیدۃ المتوفی ۲۱۱ھ کا بھی شمار ہے۔ لیکن ان کی شہرت زیادہ تر ان کے اسی کام کی وجہ سے ہے جو انھوں نے انساب پر کیا ہے، جہاں تک تاریخ اور خصوصاً مغازی کا تعلق ہے۔ اس دور کی سب سے اہم مگر مختلف فیہ شخصیت محمد بن عمر الواقدی المتوفی ۲۰۷ھ کی ہے، محدثین کے نزدیک ان کی ثقاہت مجروح ہے۔ لیکن بحیثیت مورخ کے ان کی عظمت میں کلام نہیں ہو سکتا، ندیم نے الفہرست میں اور یاقوت حموی نے معجم الادبا میں ان کی تصانیف کی تعداد بیس کے لگ بھگ بتائی ہے اور ان کے نام گنائے ہیں، یہ سب کتابیں تاریخ اور غزوات پر ہیں، جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ان کی تین کتابیں، کتاب المغازی، فتوح الشام اور کتاب العردہ ہم تک پہنچی ہیں، پروفیسر عنایت اللہ سابق صدر شعبۂ عربی پنجاب یونیورسٹی، لاہور لکھتے ہیں: "بعد کے زمانہ میں بعض لوگوں نے فتوحاتِ اسلامیہ کی افسانہ آمیز تاریخیں لکھ کر انھیں واقدی کی طرف منسوب کر دیا اور ان کی صداقت اور شہرت کو داغ لگایا۔ مستشرقین کی تحقیق یہ ہے کہ واقدی نے ملکی فتوحات اور دیگر تاریخی واقعات کے جو سنین لکھے ہیں، ان کی تصدیق سریانی تاریخوں سے بھی ہوتی ہے"[1]

---

[1] ترجمہ ابن خلدون حصہ اول، مطبوعہ لاہور ص ۲۲

طبری اور دوسرے مورخین نے ان پر اعتماد کیا اور ان کی روایات نقل کی ہیں۔

محمد بن سعد المتوفی سنہ ۲۳۰ھ واقدی کے شاگرد اور ان کے کاتب تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے، مگر بغداد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کی کتاب الطبقات الکبیر جو عام طور پر طبقات ابن سعد کے نام سے مشہور ہے، صحابہ اور تابعین کے حالات و سوانح پر نہایت جامع اور مستند کتاب ہے، جرمنی کے پروفیسر سخاؤ (Sachau) نے اس کو اڈٹ کیا اور بارہ جلدوں میں شائع کر کے عالم اسلام پر احسانِ عظیم کیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ دلچسپی سے سنا جائے گا کہ مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری نے اپنی کتاب اصح السیر کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چونکہ طبقات ابن سعد کو ایک غیر مسلم نے ایڈٹ کر کے چھاپا ہے، اس لئے یہ اڈیشن معتبر و مستند نہیں، کیونکہ اس میں ایڈیٹر نے کمی بیشی کردی ہوگی، مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی جو اس زمانہ کے نامور محقق اور محدث ہیں، میں نے ایک خط کے ذریعہ ان سے اس بارے میں استصواب کیا تو مولانا نے تحریر فرمایا: پروفیسر سخاؤ پر یہ شبہ اور بدگمانی بالکل بیجا ہے، میں نے خود طبقات کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ اس کے اصل مخطوطہ کے ساتھ حرفاً حرفاً کیا ہے اور کہیں میں نے دونوں میں عدم مطابقت نہیں پائی، ؎

تیسری صدی ہجری کے مورخین میں المدائنی، ابن جتبہ الدینوری۔ احمد بن یحییٰ البلاذری اور ابن الواضح الیعقوبی اور ابن جریر طبری کے نام بہت مشہور ہیں اور اس عہد کے بلند پایہ مورخ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ علی بن محمد المدائنی المتوفی سنہ ۲۲۵ھ کی طرف چھوٹی بڑی ۲۳۰

؎ اسی خط میں مولانا محمد بن اسحاق اور واقدی سے متعلق اپنی رائے لکھتے ہیں: اگرچہ یہ دونوں حضرات بحیثیت محدث کے متکلم فیہ ہیں لیکن بحیثیت مورخ کے ان کی عظمت مسلم ہے اور اس میں کلام نہیں ہوسکتا،

کتابیں منسوب ہیں جن کی فہرست ندیم نے کتاب الفہرست میں نقل کی ہے، لیکن یہ کتابیں اب تک پردہ خفا میں ہیں، البتہ طبری اور دوسرے مورخین مابعد نے کثرت سے مدائنی کی روایات نقل کی ہیں۔

ابن قتیبہ الدینوری المتوفی سنہ ۲۷۰ھ کی متعدد تاریخی کتابوں میں سے عیون الاخبار اور کتاب المعارف طبع ہوچکی ہیں، کتاب الامامتہ والسیاستہ بھی اس کی طرف منسوب ہے لیکن یہ کتاب رطب ویابس دونوں کا مجموعہ ہے اور اس سے تشیعت کی طرف مصنف کا رجحان ظاہر ہے،

احمد بن یحییٰ البلاذری المتوفی سنہ ۲۷۹ھ کی تاریخ میں دو کتابیں فتوح البلدان اور انساب الاشراف بہت مشہور ہیں، پہلی کتاب متعدد بار طبع ہوچکی ہے۔ دوسری کتاب متعدد جلدوں میں ہے۔ ان میں سے اب تک پہلی اور پانچویں جلدیں شائع ہوئی ہیں۔

ابن واضح الیعقوبی متوفی سنہ ۲۸۴ھ نے ایک تاریخ لکھی تھی جو تاریخ یعقوبی کے نام سے مشہور ہے اور متعدد جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔ یعقوبی مسلکاً شیعہ تھا، اسی لئے ائمہ اطہار، اور آل ابی طالب کا تذکرہ بڑے اہتمام والتزام کے ساتھ کیا ہے۔

بہرحال تیسری صدی ہجری کا نہایت عظیم الشان مورخ ابن جریر طبری ہے جس کو نہایت جامع اور مفصل ومبسوط تاریخ لکھنے میں اولیت وتقدم کا شرف حاصل ہے۔

ہم نے اب تک جن مورخین کا ذکر کیا ہے، درحقیقت تاریخ اسلام کی بنیاد یہی حضرات ہیں، ان کی تصنیفات تاریخی روایات وواقعات کا اصل سرچشمہ اور ماخذ ہیں، بعد کے مورخین نے جو کچھ لکھا ہے انھیں کتابوں کی اساس پر لکھا ہے۔ اس بنا پر اسلامی تاریخ کا احتساب کرنے اور اس کا ایک تنقیدی جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ان مورخین کی کتابوں پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر ان کی روایات کی صحت وسقم کی حیثیت کو واضح کیا جائے۔

اس سلسلے میں پہلے یہ معلوم کرلینا ضروری ہے کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمادیا تھا کہ جو شخص جان بوجھ کر آپ کی طرف کوئی بات منسوب کرے گا اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا، لیکن اس کے باوجود وضع حدیث کا فتنہ عہد صحابہ میں ہی پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں عبداللہ بن عباس سے روایت ہے، فرماتے ہیں: جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت غلط بیانی نہیں کی جاتی تھی ہم احادیث نبوی کی روایت کرتے تھے، لیکن جب سے لوگ الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے ہیں، ہم نے حدیث کا روایت کرنا ترک کردیا ہے اس فتنہ کے اسباب ووجوہ حسب ذیل تھے۔

(۱) انسان کی فطرت ہے کہ جب اپنے کسی خیال یا رائے کو موثر طریقہ پر اور قوت کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہے تو بعض بڑے لوگوں کے اقوال کو اپنی تائید میں پیش کرتا اور ان کا حوالہ دیتا ہے اور اگر سچ مچ کوئی ایسا قول موجود نہیں ہوتا۔ تو خود کوئی قول اپنے جی سے گھڑ کر کسی بڑی شخصیت کی طرف اسے منسوب کردیتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ عہد صحابہ میں ایمان وعمل کے اعتبار سے سب لوگ یکساں نہیں تھے، بلکہ اس عہد میں وہ لوگ بھی تھے جن کی نسبت قرآن میں فرمایا گیا تھا۔

قالت الاعراب آمنا۔ قل:	عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے آپ
لم تؤمنوا ولکن قولوا:	(اے پیغمبر) ان سے کہدیجئے کہ تم ایمان نہیں
اسلمنا ولما یدخل الایمان	لائے ہو، البتہ ہاں یہ کہو کہ ہم نے اطاعت قبول
فی قلوبکم	کی، اور ایمان کا تو ہنوز تمہارے دلوں میں
(سورۃ الحجرات)	گذر بھی نہیں ہوا۔

پس جو لوگ اس آیت کا مصداق تھے وہ مسلمان ضرور تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملاقات ہونے کے باعث صحابہ میں شمار بھی ہوتے تھے، لیکن طویل صحبت وتربیت یافتہ نبوی صحابہ جیسا ان میں نہ ورع وتقویٰ تھا اور نہ اپنے قول وعمل

میں ان کی طرح محتاط تھے، اسی بنا پر (بنیک نیتی سے سہی) جب کبھی ان کو اپنی کسی رائے یا خیال کو موکد کرنا ہوا انھوں بے تکلف ایک قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا۔ خواہ انھوں نے یہ قول اپنے جی سے گھڑا ہو، یا انھیں کی طرح کسی غیر ذمہ دار شخص سے سنا ہو۔

(۲) منافقین کا طبقہ جس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے، عہد نبوی کے بعد ختم نہیں ہوا۔ بلکہ تاریخ کے ہر دور میں مسلم سماج کا مارِ آستیں بنا رہا ہے۔ یہ طبقہ عہد صحابہ و تابعین میں تھا۔ اور اس نے مسلمانوں میں انتشار خیال اور پراگندگی فکر و نظر پیدا کرنے کی کوششوں میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اس مذموم مقصد کے پیش نظر یہ لوگ کثرت سے وضع حدیث بھی کرتے تھے، چنانچہ اس جماعت کا ایک فرد عبدالکریم بن ابی العوجاء الوضاع جب گرفتار کیا گیا اور اس سے باز پرس کی گئی تو اس نے کہا: میں نے حلال و حرام کی چار ہزار احادیث وضع کر کے مسلمانوں میں شائع کر دی ہیں، یہ شخص معنی بن زائدہ جو حضرت عمر کے عہدِ خلافت میں جعلی فرامین بناتا اور ان کے ذریعہ روپیہ وصول کرتا تھا[۱] اس کا ماموں تھا، اور فرقہ مانویہ سے تعلق رکھتا تھا۔[۲]

(۳) علاوہ ازیں مسلمانوں میں ایک طبقہ قصّاص (قصہ گو) و واعظین کا بھی تھا جو گرمیٔ محفل کی غرض سے ترغیب و ترہیب کی خاطر غلط سلط روایات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے نقل کر دیتا تھا۔ تمیم داری کا تعلق اسی طبقہ سے تھا۔ جب انھوں نے جمعہ جمعہ وعظ کہنے کی اجازت حضرت عمر سے طلب کی تو شروع عہد خلافت میں آپ نے ان کو اجازت

۱؎ فتوح البلدان بلاذری ص ۴۵۰

۲؎ فجر الاسلام، احمد امین ص ۲۱۱

۳؎ فجر الاسلام ص ۲۱۱

نہیں دی اور اخیر میں آپ نے اجازت عطا فرمائی بھی تو اس شرط کے ساتھ کہ جب تک میں مسجد میں موجود ہوں بس اسی وقت تک تم وعظ کہہ سکتے ہو، حضرت عثمان کے عہد خلافت میں ان کی اجازت سے تمیم داری نے ہفتہ میں دو مرتبہ وعظ کہنا شروع کر دیا تھا[۱]

قصاص و واعظین کی یہی وہ جماعت ہے جس کی نسبت امام مسلم نے مشہور محدث و ناقد حدیث یحیی بن سعید القطان کا قول ان کے صاحب زادے محمد کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:

لم نر الصالحين في شيء اكذب منهم في الحديث	صالحین جتنی کذب بیانی حدیث کے معاملہ میں کرتے ہیں کسی اور معاملہ میں اس درجہ کذب بیانی کرتے ہم نے نہیں دیکھا۔

یہ اس زمانہ کی خصوصیات تھیں۔ اس جماعت کا حال ہمیشہ یہی رہا ہے اور آج تو وہ حال ہے کہ خدا کی پناہ!

(۴) یہ سب کچھ تو تھا ہی، اس صورتِ حال میں شدت کا باعث یہ ہوا کہ عہد فاروقی اور عہد عثمانی میں فتوحات کی کثرت و وسعت کے سبب مختلف قومیں (جن کی تفصیل آپ کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے) عرب اقوام و قبائل کے ساتھ خلط ملط ہو گئیں، ان کی تہذیب، روایات، مذاہب، میلانات و رجحانات اور طریق فکر و زندگی جدا جدا تھے، اگرچہ ان کی غالب اکثریت حلقہ بگوش اسلام ہو گئی تھی۔ لیکن ان کے قومی خصائص و خصائل یک قلم متروک نہیں ہو سکتے تھے، اس بنا پر قومی اور نسلی عصبیت نے سر اٹھایا، باہمی رنجشیں اور عداوتیں پیدا ہو گئیں، ایک فرقہ دوسرے کا حریف ہو گیا، یوں تو ان رنجشوں کا دامن بہت وسیع ہے، لیکن قبائلی عصبیت کے دائرہ میں بنو امیہ اور بنو ہاشم اور عقیدہ و فکر کے میدان میں اہلسنت والجماعت

---

[۱] فجر الاسلام ص ۲۱۱

اور شیعہ کے اختلافات نے وہ رنگ دکھایا کہ اسلام کا پورا نظام زندگی ہی اس کی زد میں آگیا۔ اس صورتِ حال نے وضع حدیث کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ ایک فریق دوسرے فریق کے بالمقابل اپنی راست بازی ثابت کرنے کے لیئے روایات کے جعل و تخلیق میں تامل نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ ابن ابی الحدید نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ شیعہ حضرات نے ائمہ کے فضائل میں کثرت سے احادیث وضع کی ہیں اور ان کی مثالیں لکھی ہیں ؎۱ احمد امین نے دوسرے فرقوں کی وضع احادیث کی مثالیں بھی لکھی ہیں ؎۲ وضع حدیث کی تاریخ اور اس کے وجود و اسباب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لیے علامہ ابن جوزی اور ملا علی قاری کی کتب تذکرۃ الموضوعات کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

اب غور کرنا چاہیے کہ حدیث جس کی شرعی اور دینی حیثیت نہایت اہم ہے اور جس میں کذب بیانی کے خلاف سخت وعید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، جب اہوا و خواہشات نفس کے زیر اثر اس میں وضع اور دجل و فریب کا یہ عالم ہے تو تاریخی روایات جن کا تعلق امویوں اور عباسیوں، شیعوں اور سنیوں، اہل کوفہ اور اہل شام وغیرہم کے باہمی اختلافات و نزاعات سے ہے ان میں کذب بیانی، اور وضع و دجل کا کتنا اور کیسا کچھ دخل نہ ہوگا۔

اگرچہ حدیث اور تاریخ میں جعل و وضع کی وبا سے کسی ایک فریق کو متعین طور پر محفوظ و مامون قرار نہیں دیا جا سکتا، تاہم اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اس میں جتنا بڑا حصہ حضرت عثمان کے مخالفین، یعنی حامیان و شیعیان حضرت علی کا ہے اتنا کسی کا نہیں، جیسا کہ ابن ابی الحدید کے حوالہ سے گذر چکا ہے ان لوگوں نے ایک طرف اپنے ائمہ کے فضائل و مناقب

؎۱ شرح نہج البلاغۃ ج ۳ ص ۱۷

؎۲ فجر الاسلام ص ۲۱۳

ہیں اور دوسری جانب حضرت شیخین اور حضرت عثمان کی تنقیص اور ان پر الزام تراشی میں کثرت سے احادیث اور تاریخی روایات وضع کیں اور چونکہ ان لوگوں کی پروپیگنڈہ مشین بہت طاقت ور تھی، جس کے باعث اموی خلافت ختم ہوئی اور بنی عباس برسر اقتدار آئے اس بنا پر ان کی موضوع احادیث اور روایات اس کثرت سے پھیلیں کہ تاریخ اسلام کا جزء بن گئیں اور صحیح و سقیم کا امتیاز دشوار ہو گیا، اس سے یہ قیاس کرنا مشکل نہیں ہے کہ پہلی اور دوسری صدی کے جو مورخین بصرہ یا کوفہ کے ساکن اور حضرت عثمان کے مخالف گروہ سے متعلق تھے ان کی کتابوں یا رسالوں میں حضرت عثمان اور ان کی خلافت سے متعلق کیسی کچھ غلط اور الٹی سیدھی روایات نہ ہوں گی۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے (یعنی باہمی اختلافات و نزاعات اور وضع حدیث و روایات) اب آیئے اس کو پیش نظر رکھ کر تاریخ اسلام کے متداول مآخذ کا تنقیدی جائزہ لیں اور چونکہ ہر ماخذ پر گفتگو کرنا یہاں ممکن نہیں ہے، اس بنا پر ہم تاریخ طبری کو جو سب سے زیادہ متداول جامع، مرتب اور قدیم تر ہے، بطور ایک ماڈل کے استعمال کرتے ہیں، اس سلسلے میں ہم پہلے طبری کے ذاتی حالات و سوانح، علمی فضائل و کمالات اور ان کی تاریخ کے امتیازات و خصوصیات بیان کریں گے اور پھر اس کے ماخذ و مصادر کا تنقیدی جائزہ لیں گے۔

ابن جریر طبری ابو جعفر کنیت، محمد نام، والد کی نسبت سے ابن جریر کہلاتے ہیں، طبرستان (فارس) کے ایک گاؤں میں ۲۲۴ھ - ۸۳۹ء میں پیدا ہوئے اور ۳۱۰ھ - ۹۲۳ء میں بغداد میں وفات پائی، طبرستان کی نسبت سے طبری کہلاتے ہیں، ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی، ذہانت کے ساتھ حافظہ بھی غیر معمولی تھا، سات برس کی عمر میں حافظ قرآن ہو گئے، مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اولاً رے اور پھر بغداد، شام اور مصر کا سفر کیا، یہاں انھوں نے کیسے کیسے اکابر علم و ادب

سے استفادہ کیا؟ اس کا اندازہ ان شیوخ کے ناموں سے ہوتا ہے جن کا تذکرہ وہ اپنی تفسیر و تاریخ کے اسانید میں کرتے ہیں، حصول تعلیم سے فارغ ہوکر وہ مستقلاً بغداد میں سکونت پذیر ہو گئے، اور یہیں سنہ ۳۱۰ھ / سنہ ۹۲۳ء میں وفات پائی، ابن جریر تفسیر و تاریخ، اور فقہ تینوں میں حجت تھے، وسعت علم کے باوصف اخلاق میں بھی نہایت مضبوط تھے، ان کو حق بات کہنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی تھی، [1]

ابن جریر کی تفسیر تیس جلدوں میں اور ان کی تاریخ تیرہ جلدوں میں ان کے غزارت علم و جلالت مقام کی شاہد عدل ہیں، اختلافات الفقہا کے نام سے ایک کتاب فقہ میں بھی لکھی تھی، اس معاملہ میں وہ کسی امام کے پیرو نہیں تھے، بلکہ خود صاحب مذہب تھے، ان کی کتاب "البیان فی تفسیر القرآن جو تیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ تفسیر میں ہر لیکن اس میں دوسرے علوم و فنون کی سیکڑوں بحثیں جو پھیلی ہوئی ہیں وہ اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ ابن جریر علوم مذکورہ بالا کے علاوہ حدیث، صرف و نحو، شعر و ادب اور طب و ریاضی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، یہاں چوں کہ ہم کو غرض صرف تاریخ سے ہے اسی لیے اس پر کسی قدر تفصیل سے کلام کریں گے۔

تاریخ ابن جریر کی خصوصیات

ابن جریر طبری نے نہ صرف تاریخ اسلام، بلکہ تاریخ اقوام و ملل عالم کا مطالعہ وسعت و دقت نظر سے کیا تھا۔ اس بنا پر جب انھوں نے تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تو اس کا آغاز آفرینش عالم سے کیا اور اس وقت سے لے کر اسلام کے ظہور تک انبیا و رسل، ایرانی، رومی، یونانی اور مصری و چینی جو قومیں گذری ہیں۔ کسی کی مفصل اور کسی کی مختصر، حسب ذرائع و وسائل معلومات، ان کی تاریخ قلم بند کی، اس حیثیت سے ابن جریر پہلے مسلمان مورخ ہیں جنھوں

---

[1] ظہر الاسلام ج ۲ ص ۲۰۳

نے عرب اور ان کے قبیلوں اور خاندانوں کے علاوہ دیگر اقوام و امم عالم کی تاریخ پر بھی توجہ کی اور اس کو مرتب کیا، اس کے بعد ظہور اسلام سے ۳۰۲ھ تک کی جو تاریخ لکھی ہے وہ سنہ وار مرتب کی گئی ہے، جیسا کہ طبری سے پہلے بعض دوسرے مورخین مثلاً عبداللہ بن ابو بکر بن حزم، ہثیم بن عدی، اور جعفر بن محمد بن الازہر المتوفی ۲۷۶ھ نے بھی کیا تھا۔

اس تاریخ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ابن جریر نے جن لوگوں سے براہ راست سماع کی یا جن لوگوں کی کتابوں سے مواد جمع کیا ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان میں ثقہ غیر ثقہ، معتبر نامعتبر، اور جھوٹے سچے ہر قسم کے لوگ شامل ہیں ابن جریر نے جو مواد ان لوگوں سے حاصل کیا تھا، تنقید اور کسی بحث و تمحیص کے بغیر، اس سب کو یکجا کر دیا ہے اس بنا پر یہ تاریخ صحیح اور موضوع، ہر قسم کی روایات کی کھتونی اور ان کا مجموعہ بن گئی ہے[1]

ابن جریر طبری کے مآخذ

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، ابن جریر نے ہر قسم کے لوگوں سے روایات اخذ کیں اور جس کی روایات جس موقع کے لیے موزوں اور مناسب تھیں ان کو وہاں اپنی تاریخ میں درج کر دیا، چنانچہ آفرینش عالم کے سلسلہ میں وہب بن منبہ سے اور ابن جریج الرومی سے نصرانیت سے متعلق کثرت سے روایات نقل کی گئی ہیں، علاوہ ازیں ابن جریر کے راویوں میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو اصلاً یہودی یا عیسائی تھے جیسے عبدالرحمٰن بن دانیل اور اسباط کبھی سلسلہ روایت

---

[1] تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ابن جریر طبری عظیم المرتبت محدث تھے، اسی لیے تاریخ بھی انھوں نے حدیث کے طرز پر لکھی ہے۔ یعنی روایات کے ساتھ انھوں نے اسانید کا التزام کیا ہے اور راوی کے لیے وہی الفاظ بولتے ہیں جو محدثین کے معمول ہیں، مثلاً: اخبرنا، حدثنی، ذکر وغیرہ

اس طرح ہوتا ہے عمر د عن اسباط عن السدی کبھی ابن جریر کسی راوی کا نام نہیں لیتے، بلکہ صرف "ذکر العلماء باخبار الامم السالفۃ من العرب والعجم" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں جہاں تک اسلام کی ابتدائی تاریخ اور سیرت نبوی کا تعلق ہے ابن جریر کے ماخذ یہ ہیں، ابو معشر نجیح عبد الرحمٰن السندی المدنی المتوفی ۱۷۰ھ عروۃ بن زبیر، محمد بن المثنی، ابان بن عثمان بن عفان، ابن اسحاق مطلبی متوفی ۱۵۰ھ محمد بن عمر الواقدی م ۲۰۷ھ ابن سعد المتوفی ۲۳۰ھ علی بن محمد المدائنی م ۲۲۵ھ مذکورہ بالا ماخذ پر الگ الگ گفتگو کرنا ہمارے لیے سخت دشوار بھی ہے اور غیر ضروری بھی، البتہ حضرت عثمان کے عہد خلافت کی تاریخ کے لیے ابن جریر طبری نے جو مآخذ اختیار کئے ہیں ان پر کلام کرنا ازبس ضروری ہے، لیکن یہ کلام ہم آخر میں کریں گے۔

طبری اور تشیع بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابن جریر طبری شیعہ تھے، اس خیال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھیں کے ہم نام ابو جعفر محمد بن علی بن مسلم الطبری (جو ۵۵۳ھ میں موجود تھے) ایک شیعہ عالم تھے۔ انھوں نے شیعہ مذہب سے متعلق "بشارۃ المصطفیٰ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی [۱] ہم نامی وہم وطنی کے باعث بعض لوگوں نے غلطی سے اس کتاب کو ابن جریر طبری کی طرف منسوب کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن جریر طبری فارس کے تھے جو تشیعت کے لیے ایک زرخیز سرزمین تھا اسی لئے ماحول کے اثر سے ممکن ہے ان کا رجحان حضرت علی اور آل بیت کی طرف زیادہ ہو، اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ میں حضرت علی کے نام کے ساتھ متعدد مواقع پر "علیہ السلام" لکھا ہے۔ لیکن ان کو شیعہ کہنا، یا بمعنی اصطلاحی تشیع کی نسبت ان کی طرف کرنا سر تا سر غلط اور نا درست ہے اس کی دلیل اس سے بڑھ کر

---

[۱] الذریعہ الی مصنفات الشیعہ ج ۳ ص ۱۱۷

اور کیا ہو سکتی ہے کہ بغداد میں ایک عرصہ قیام کرنے کے بعد جب وہ طبرستان آئے تو دیکھا کہ یہاں رفض کا بہت زور ہے اور صحابۂ کرام کا سب وشتم عام ہو گیا ہے ابن جریر طبری کو اس سے سخت وحشت اور اذیت ہوئی، انھوں نے خلفائے اربعہ کے فضائل و مناقب میں کتاب الفضائل" کے نام سے ایک نہایت مدلّل اور مفصل کتاب لکھی، طبرستان کے شیعہ حلقوں میں اس کتاب نے آگ لگا دی اور وہ لوگ مصنف کی جان کے درپے ہو گئے، علامہ ابن جریر طبری نے یہ رنگ دیکھا تو طبرستان کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ کر بغداد واپس آ گئے [۱]

امام مجتہد واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ شیعہ تھے اور نہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مقلد تھے بلکہ خود مجتہد اور فقہ میں ایک خاص مکتبۂ فکر کے موجد تھے، اس سلسلے میں انھوں نے ایک کتاب "اختلاف الفقہا" لکھی اور اس میں فقہا کے اختلاف کے وجوہ اسباب ان کے طرق استدلال و استنباط اور ان کے مسالک و مذاہب سے مفصل بحث کی، ساتھ ہی انھوں نے دو کتابیں تصنیف کیں جن میں انھوں نے خود اپنے فقہی مسلک و مذہب کی تشریح توضیح کی، ان میں سے ایک کتاب کا نام ہے صریح السنہ، جو ۱۳۱۱ھ میں بمبئی سے شائع ہوئی تھی، اس کے علاوہ دوسری کتاب کا نام ہے، لطیف القول فی احکام شرائع الاسلام [۲]

اخلاق و عادات ایک فقیہہ، ایک عالم اور مصنف اور ایک مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ حکومت کا وظیفہ خوار نہ ہو اور نہ حکومت کے کسی دفتر یا شعبہ سے ملازمت کا تعلق رکھتا ہو، تاکہ وہ اپنی تحریر کا استعمال و اظہار آزادی سے کر سکے،

---

[۱] تاریخ طبری مطبوعۂ دار المعارف قاہرہ جلد اول مقدمہ محمد ابو الفضل ابراہیم

[۲] ایضاً

اس اعتبار سے بھی ابن جریر طبری کا مقام بہت اونچا ہے ان کا سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ طبری کے والد بڑے آسودہ، خوش حال اور صاحب املاک وجائداد تھے، جب ابن جریر طبری بارہ برس کی عمر میں حصول علم کی غرض سے وطن سے روانہ ہوئے تو وہ جہاں کہیں بھی رہے ان کے والد ان کے امیرانہ اخراجات کے متکفل رہے اور وہ طالب علمی کے بعد بھی کسی ریاست یا حکومت کی سرپرستی کے شرمندہ احسان نہیں ہوئے، خاقانی جو ابن جریر طبری کا بڑا مداح اور قدردان تھا اس نے اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں بہت کوشش کی کہ موصوف قضا یا کوئی اور بڑے سے بڑا عہدہ قبول کرلیں لیکن وہ رضامند نہیں ہوئے، اور ہمیشہ دربار شاہی اور امراء و وزراء کے قرب سے دور رہے، اس بنا پر ان میں خودداری، عزت نفس اور آزاد طبعی کے اوصاف بدرجہ کامل پائے جاتے تھے اور ہر معاملہ میں وہ اپنی رائے کا اظہار برملا کرتے تھے، ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ علامہ ابن جریر طبری کا جو مرتبہ و مقام تفسیر، حدیث اور فقہ و علم قرأت میں ہے۔ ان کا وہی مرتبہ و مقام بحیثیت ایک جلیل القدر مورخ کے ہے۔ چنانچہ جس طرح ان کی تفسیر کا شمار امہات کتب تفسیر میں ہے، اسی طرح تاریخ ان کی نہایت ضخیم تاریخ اسلام کا نہایت اہم ماخذ ہے۔ امام ابوحنیفہ کی نسبت امام شافعی کا مشہور قول ہے "الفقہا کلھم عیال علی ابی حنیفہ" تمام فقہا ابوحنیفہ پر بھروسہ کرتے ہیں، تاریخ میں یہی حیثیت ابن جریر طبری کی ہے۔ چنانچہ ان کے بعد جتنے مورخین پیدا ہوئے انھوں نے ان پر اعتماد کیا اور ان کی تاریخ کو اپنے لیے بطور ماخذ کے استعمال کیا ہے یہاں تک کہ ابن اثیر جو خود ایک بلند مرتبہ مورخ ہیں، ان کی تاریخ تو ایک بڑی حد تک تاریخ ابن جریری کا ایک چربہ ہے، چنانچہ مقدمہ کتاب میں وہ خود

۱؎ محمد ابوالفضل ابراہیم نے تاریخ طبری ج ۱ کے اپنے مقدمہ میں علامہ ابن جریر طبری کی چھبیس ۲۶ کتابوں کی نشاندہی کی ہے جو مختلف موضوعات پر تھیں

لکھتے ہیں: میں نے اپنی تاریخ کا آغاز اس عظیم الشان تاریخ سے کیا ہے جس کو امام ابوجعفر الطبری نے تصنیف کیا ہے، کیوں کہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس پر سب نے اعتماد کیا ہے" اس کے بعد کہتے ہیں: میں نے ابوجعفر طبری کے تمام تراجم (حالات و واقعات) کو لے لیا ہے، اور ان میں کہیں بھی اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی، ڈاکٹر صلاح الدین المنجد اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ابن اثیر خود جلیل القدر مورخ تھے، ان کا طبری پر یہ اعتماد اس بات کی دلیل ہے کہ تاریخ ابن جریر طبری کا بعد کے مورخین پر کس درجہ عمیق اثر تھا۔ [1]

تاریخ طبری کا اثر

لیکن تاریخ طبری کی اس اہمیت و عظمت کے باوجود یہ یاد رکھنا چاہیے کہ طبری نے اپنی تاریخ میں تنقید و تنقیح کے بغیر وہ تمام روایات یکجا کر دی ہیں جو ان کو پہلی اور دوسری صدی کے مورخین کی کتابوں میں (جو اب معدوم ہیں اور ہم تک نہیں پہونچیں) دست یاب ہوئیں یا جن کو انھوں نے اپنے ہم عصر راویوں سے سنا [2] یہ ظاہر ہے کہ طبری کے یہ سب ماخذ یکساں نہیں تھے بلکہ مختلف امیال و عواطف اور رجحانات کے لوگ تھے، ان میں وہ بھی تھے جو تاریخ کے مدنی اسکول سے تعلق رکھتے تھے اور وہ بھی تھے جن کا تعلق کوفہ، بصرہ سے (جو حضرت عثمان کی مخالفت کا مرکز تھے) یا ایران سے تھا جہاں شیعیت کا زیادہ زور تھا، پھر ان راویوں میں وہ بھی تھے جن کو علمائے اسماء الرجال نے ثقہ اور معتبر تسلیم کیا ہے اور وہ بھی تھے جن کی روایات کو موضوع اور ناقابل اعتبار قرار دیا گیا ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تفصیل سے ہوگا۔ اس میں ہم

---

[1] الذکری الالفیہ للشیخ الطوسی، طبع ایران ص ۴۱۱

[2] تاریخ طبری کے مآخذ پر "موارد تاریخ الطبری" کے زیر عنوان ڈاکٹر جواد علی نے ایک نہایت محققانہ اور بصیرت افروز مقالہ لکھا ہے جو المجمع العلمی العراقی کی جلد سوم میں قسط وار شائع ہوا ہے، آگے اسی کے حوالے آئیں گے

صرف ان راویوں کا ذکر کریں گے جن کو طبری نے خلافت عثمانی کے تذکرہ میں بطور اپنے ماخذ کے استعمال کیا ہے۔

واقدی

ان میں ایک اہم ماخذ محمد بن عمر الواقدی ہیں، جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں بحیثیت محدث کے ان کا مرتبہ و مقام خواہ کچھ ہی ہو، ایک نہایت وسیع المعلومات اور بلند مرتبہ مورخ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا، مامون الرشید کے عہد میں یہ قاضی بھی تھے، تاہم کبر سن، عوارض و اسقام اور بعض حوادث کے باعث واقدی میں سوءِ حفظ، نسیان اور عدم تثبت کے جو امراض پیدا ہو گئے تھے، حدیث کی طرح ان کی تاریخ بھی اس سے غیر متاثر نہیں رہ سکتی تھی۔

ابن سعد

دوسرا ماخذ محمد بن سعد (۱۶۸ھ تا ۲۳۰ھ) ہیں۔ اپنے شیخ محمد بن عمر الواقدی کی طرح انھوں نے بھی تحصیل علم اولاً مدینہ میں اور پھر بغداد میں کی، واقدی کے شاگرد بھی تھے اور کاتب بھی، محدثین نے ان کی مدح کی ہے۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

محمد بن سعد ہم لوگوں کے نزدیک ارباب عدالت میں سے ہیں اور ان کی روایات ان کے صدق پر دلالت کرتی ہیں کیوں کہ وہ روایت میں چھان بین بہت کرتے ہیں"[1]

علی بن محمد المدائنی

تیسرا ماخذ علی بن محمد المدائنی ہیں، ان کی پیدائش بصرہ میں ۱۳۵ھ میں ہوئی، مدائن میں جا بسے تھے، اسی لئے مدائنی کہلاتے ہیں، ۲۲۵ھ میں وفات ہوئی۔ نہایت فاضل اور کثیر التصانیف بزرگ تھے، ان کی کوئی کتاب اب کہیں دستیاب نہیں، لیکن طبری، بلاذری، ابن عبدربہ، اور ابو العباس المبرد، ابو الفرج اصفہانی اور مسعودی وغیرہم نے ان کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں، مدائنی ایام الناس، اخبار و انساب عرب، فتوح و مغازی، اور شعر و ادب کے بڑے عالم اور ان کی

---

[1] تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۲۱

روایت کرنے میں سچے تھے، [1] محدثین ان پر طعن نہیں کرتے، یحییٰ بن معین جو مشہور ناقد حدیث ہیں مدائنی کو ثقہ تسلیم کرتے ہیں [2]

ابو مخنف لوط بن یحییٰ طبری کے ایک اہم ماخذ یہ بھی ہیں، ان کے دادا جن کا نام مخنف تھا، صحابی اور اصحاب حضرت علی میں سے تھے، اس بنا پر صاحب الفہرست ندیم کے قول کے مطابق پوتے میں بھی تشیع تھا۔ صاحب القاموس کی رائے ہے کہ وہ داستان گو (اخباری) اور شیعی المسلک تھے، ان کی روایات متروک تھیں، محدثین نے بھی ان کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے، ان کا بیان ہے کہ ابو مخنف مجہول و نامعلوم افراد سے روایات نقل کرتے تھے، ۱۵۷ھ میں انتقال کیا [3] ان وجوہ کے باعث جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ اگرچہ ابو مخنف کثیر التصانیف والرسائل تھے ان کی روایات کو قبول کرنے میں ارباب علم و بصیرت بہت محتاط رہے ہیں۔ احمد امین لکھتے ہیں: طبری نے ابو مخنف کی جو روایات نقل کی ہیں قاری کو چاہیئے کہ وہ روایات طبری سے الگ کرلے اور پھر دیکھے کہ ان سے کیا نتیجہ اخذ ہوتا ہے، [4] چنانچہ مشہور جرمن مستشرق ولہاوزن (J. Wellhansen) جس نے اپنی کتاب "عرب سلطنت اور اس کا سقوط" (The arab Kingdom and its Fall) میں ابو مخنف سے روایات نقل کی ہیں لیکن ساتھ ساتھ اس پر جرح اور تنقید بھی کرتے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۲۱

[2] ایضاً ج ۱۲ ص ۵۵

[3] ضحی الاسلام احمد امین ج ۲ ص ۳۴۴

[4] ضحی الاسلام ج ۲ ص ۳۴۲

[5] ایضاً۔

گئے ہیں، ولہازن کی کتاب جرمنی سے انگریزی میں منتقل ہوئی اور اس کا عربی ترجمہ براہِ راست جرمنی زبان سے ڈاکٹر یوسف العش نے سقوط الدولۃ العربیۃ کے نام سے کیا، فاضل مترجم بھی موقع بموقع حواشی میں ولہازن کے بعض بیانات پر کلام کرتے گئے ہیں۔

سیف بن عمر طبری کے ایک نہایت اہم مآخذ سیف بن عمر الکوفی الاسدی التیمی المتوفی ۱۸۰ھ میں ڈاکٹر جواد علی کے بیان کے مطابق تاریخ طبری میں سیف بن عمر کا نام تین سو مرتبہ سے بھی زیادہ آیا ہے۔ سیف بن عمر نے عہد صدیقی میں فتنۂ ارتداد، فتوح ومغازی اور حضرت عثمان وحضرت علی کی خلافت کے واقعات اور جنگ جمل وصفین پر متعدد رسالے لکھے تھے جو ہم تک نہیں پہونچے، طبری نے ان سے استفادہ کیا ہے لیکن سیف بن عمر کا شیخ جابر الجعفی الکوفی تھا جو ایک شیعہ عالم تھا اور خود سیف کا تعلق قبیلۂ تمیم سے تھا۔ اس لیے سیف بن عمر کی روایات میں تشیعیت اور قبیلۂ تمیم کے لیے شدید عصبیت پائی جاتی ہے، اس بنا پر محدثین اور ارباب تحقیق نے سیف بن عمر کی روایات کو مجروح اور ضعیف ہی نہیں بلکہ من گھڑت قرار دیا ہے، حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ محدثین سیف بن عمر کو ضعیف قرار دیتے ہیں، وہ حدیث وضع کرتے تھے یہاں تک کہ بعض لوگوں نے ان کو زندقہ سے منسوب کیا ہے [۱] مستشرقین میں ولہازن، کائتانی اور بروکلمن کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اگرچہ سیف بن عمر کی روایات نہایت مفصل اور مرتب ہوتی ہیں لیکن ان میں صحت کا وہ اہتمام نہیں ہوتا جو دوسروں کے ہاں ہوتا ہے اور اس میں عصبیت بھی پائی جاتی ہے علاوہ ازیں اس میں دقت نظر بھی ہے [۲]

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۹۵۔ [۲] ملاحظہ کیجئے المجمع العلمی العراقی ج ۳ جز اوّل ص ۴۹ وضحی الاسلام ج ۲ ص ۳۴۳

السری پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ طبری سیف بن عمر کی جو روایات نقل کرتے ہیں اکثر و بیشتر السری سے بواسطۂ شعیب نقل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کبھی وہ "کتب الی السری" کہتے ہیں، کبھی "حدثنا عن السری" اور کبھی عن شعیب کہتے ہیں۔ یہ السری اور شعیب کون ہیں؟ السری کے والد کا نام یحییٰ تھا اور طبری کے شیخ تھے، رہے شعیب! تو حافظ ابن حجر ان کے متعلق کہتے ہیں: یہ شخص معروف نہیں مجہول ہے، یہ بہت سی روایات اور اخبار کا راوی ہے، لیکن ان میں نکارت پائی جاتی ہے، اس کا پورا نام شعیب بن ابراہیم الکوفی ہے، ڈاکٹر جواد علی اس قدر لکھنے کے بعد تحریر کرتے ہیں، ہم کو اس بات کا افسوس ہے کہ اگرچہ السری بن یحییٰ اور شعیب بن ابراہیم الکوفی راویہ سیف بن عمر کے نام طبری میں بڑی کثرت اور افراط سے آئے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ان سے واقف نہیں ہیں۔ [1] اس سے اندازہ ہوگا کہ جب صورت حال یہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی تو پھر سیف بن عمر کی روایات جو طبری میں منقول ہیں صحت اور استناد کے اعتبار سے وہ کس پایہ اور مرتبہ کی ہوں گی۔

عمر بن شبتہ طبری کے ایک ماخذ عمر بن شبتہ بن عبیدہ بن ریطہ ابوزید البصری المتوفی ۲۶۲ھ ہیں، یہ اپنے عہد کے مشہور مورخ ہیں۔ انھوں نے حدیث کا سماع ابن مہدی، طیالسی اور قطان سے کیا تھا۔ ادب اور تاریخ میں ان کے شیخ اصمعی تھے، علی بن محمد المدائنی سے بھی تاریخ میں اکتساب فیض کیا تھا۔ ندیم نے ان کی تصنیفات کی تعداد بیس بتائی ہے، جن لوگوں نے ان سے روایات لی ہیں ان میں مشہور محدث ابن ماجہ، احمد بن یحیی الثعلب النحوی، احمد بن یحیی البلاذری، اور ابن ابی الدنیا ابوبکر عبداللہ بن محمد شامل ہیں، طبری نے عمر بن شبتہ کی تمام کتب پڑھی تھیں اور ان سے روایات سنی بھی تھیں۔

---

[1] المجمع العلمی العراقی ج ۳ جزء اول ص ۵۰

طبری میں سو مرتبہ ان کا نام آیا ہے[1]

روایات میں تضاد

خلافت عثمانی سے متعلق طبری کے ماخذ چند اور افراد بھی ہیں. لیکن وہ چنداں اہم نہیں ہیں، ہم نے اوپر جن ماخذ کا ذکر کیا ہے، ان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ طبری نے روایات کے اخذ و نقل کرنے میں کسی ایک مکتبۂ خیال کی پیروی نہیں کی، بلکہ ان کو کسی بھی قسم کی جو روایت کسی سے ملی ہے اس کو تحقیق و تنقید کے بغیر اپنی تاریخ میں درج کر دیا ہے، کیوں کہ قدماء کی کتابیں ناپید ہوتی جاتی تھیں اور توقع نہیں تھی کہ آئندہ نسلیں ان سے بہرہ یاب ہوسکیں گی، اس بنا پر کوئی شبہ نہیں امام ابوجعفر طبری کا یہ کارنامہ نہایت عظیم الشان ہے اور وہ اس پر عالم اسلام کے شکریہ کے بجاطور پر مستحق ہیں. لیکن تاریخ کی اس جامعیت و ہمہ گیری کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ تاریخ طبری ہر قسم کی صحیح اور موضوع، مستند اور غیر مستند، قوی اور ضعیف روایات کا سنگم ہوگئی، اور اس میں ایسی روایات جمع ہوگئیں جن کی تردید و تغلیط خود طبری کی دوسری روایات یا بعض دوسرے معتبر مورخین کے بیانات سے ہوتی ہے ہم ذیل میں اس کی چند مثالیں نقل کرتے ہیں.

روایات میں تضاد کی چند مثالیں

(۱) ایک روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے سوال کے جواب میں جب حضرت عثمان نے اتباع سیرت نبوی و سیرت شیخین کا حتمی وعدہ کرلیا تو خود حضرت علی نے عبدالرحمٰن بن عوف سے کہا، بس! اب جب کہ عثمان اس کا وعدہ کرتے ہیں تو پھر دیر کیا ہے؟ بسم اللہ کیجیے، چنانچہ عبدالرحمٰن بن عوف نے بیعت خلافت کی اور آپ کے بعد فوراً حضرت علی نے بیعت کی. لیکن اس کے بالمقابل دوسری روایت ہے کہ جب عبدالرحمٰن

---

[1] مجلۃ المجمع العلمی العراقی ج ۳ جزء اول ۳۰ و ۳۱

بن عوف نے حضرت عثمان کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تو حضرت علی نے بیعت نہیں کی اور ناراض ہو کر جانے لگے، اس پر اہل شوریٰ نے ان کو پکڑ لیا اور دھمکی دی کہ فوراً بیعت کیجئے، ورنہ ہم سختی سے پیش آئیں گے،، اس پر حضرت علی نے بیعت کی، یہ دونوں روایتیں طبری میں ہیں اور انساب الاشراف بلاذری ج ۵ ص ۲۲ میں بھی ہیں، انساب الاشراف میں مذکورہ بالا روایت کے فوراً بعد ایک روایت عبداللہ بن عباس کی یہ بھی ہے کہ: ان علیا اول من بایع عثمان من اصحاب الشوریٰ بعد عبد الرحمٰن بن عوف لم یتلعثم۔ یعنی علی ہی پہلے ممبر شوریٰ تھے جنھوں نے عثمان سے عبدالرحمٰن بن عوف کے بعد بیعت کی اور اس میں ذرا نہیں ہچکچائے، ان دونوں قسم کی روایتوں میں چونکہ باہم تناقض ہے اس لیے یقیناً ایک روایت صادق ہوگی اور دوسری کاذب، اس سلسلے میں ڈاکٹر طہٰ حسین لکھتے ہیں کہ جس روایت میں عبدالرحمٰن بن عوف کے بعد فوراً بے چوں چرا بیعت کر لینے کا ذکر ہے وہی صحیح ہے۔ کیونکہ دوسری روایت حضرت علی کی شان اور مرتبہ سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔[1]

(۲) اسی طرح طبری نے سیف بن عمر کے حوالہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عثمان نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کی گورنری سے جو معزول کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ موخر الذکر نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے جو خزانچی تھے بیت المال سے ایک رقم بطور قرض لی تھی، لیکن جب عبداللہ بن مسعود نے رقم کی واپسی کا تقاضا کیا تو مقروض نے کچھ مہلت طلب کی، عبداللہ بن مسعود اس پر راضی نہیں ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جھگڑا بڑھا اور نوبت سخت کلامی اور سب و شتم تک پہونچی، پبلک میں کچھ لوگ ادھر ہو گئے اور کچھ اُدھر، صورت فساد کی ہو گئی، حضرت عثمان کو اطلاع ہوئی تو آپ نے عبداللہ بن مسعود سے کوئی تعرض نہیں کیا، لیکن سعد بن ابی وقاص کو گورنری سے معزول کر دیا؛ طبری کے تتبع میں ابن اثیر نے الکامل

---

[1] عثمان ص ۴۴

ہیں اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں بھی معزولی کا سبب یہی لکھا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ سیف بن عمر کا یہ بیان درست نہیں ہے، اور اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت سعد بن وقاص خود صاحب دولت و ثروت تھے اور اس وقت گورنر بھی تھے اس بنا پر اولاً تو ان کو بیت المال سے قرض لینے کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی، اور اگر انھوں نے قرض ادھار لیا بھی تھا تو مقررہ وقت پر قرض کی ادائیگی نہ کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی۔

(۲) پھر حضرت سعد بن وقاص کا مزید مہلت طلب کرنا۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کا اس پر رضامند نہ ہونا اور نتیجۃً دونوں میں سب وشتم جس کا ذکر روایت میں ہے، یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن مسعود ایسے اکابر صحابہ کی شان سے فروتر اور مستبعد ہے، چنانچہ ڈاکٹر طہ حسین نے بھی انھیں وجوہ کے باعث اس روایت کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے [1]

اب سوال یہ ہے کہ اچھا! اگر کوفہ کی گورنری سے معزولی کا سبب یہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ جیسا کہ بلاذری نے فتوح البلدان کے باب تمصیر الکوفہ میں لکھا ہے، کوفہ کے لوگ عجیب وغریب فطرت کے انسان تھے عہد فاروقی میں بھی ان کا معمول یہ تھا کہ جب ان کے ہاں کوئی گورنر مقرر ہو کے آتا تھا تو ابتدا میں یہ اس سے خوش رہتے تھے، اور کچھ مدت گزرنے کے بعد اس کے خلاف اس کثرت سے شکایت دربار خلافت میں پہونچانی شروع کر دیتے تھے کہ حضرت عمر بھی گورنر کو معزول کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے، چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ ان کو حضرت عمر نے کوفہ کا گورنر مقرر کیا، ابھی ان کو یہاں آئے ہوئے ایک برس چند ماہ ہوئے تھے کہ اہل کوفہ نے ان کی نہایت لغو اور بیہودہ شکایات پہونچانی شروع کر دیں۔ حضرت عمر نے تحقیق کی تو معلوم ہوا

---

[1] عثمان ص ۱۴۴

کہ سب شکایات بے سروپا اور بے بنیاد ہیں۔ تاہم انتظامی مصلحت سے حضرت سعد بن ابی وقاص معزول کر دیے گئے۔ اس وقت انھوں نے اہل کوفہ کے حق میں بددعا کی اور زبان سے بے ساختہ نکلا: اللّٰھم لا ترض عنھم امیرا ولا ترضھم بامیر: اے اللہ! ایسا کر کہ نہ کوئی گورنر اہل کوفہ سے خوش رہے اور نہ یہ کسی گورنر سے مطمئن رہیں؛

حضرت عمر نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو محض انتظامی مصلحت سے معزول کیا تھا ورنہ ان پر کوئی کسی قسم کا الزام نہیں تھا اسی بنا پر آپ نے اپنے جانشین کو حضرت سعد کی گورنری کی وصیت کی تھی، اس وصیت کا ہی پاس و لحاظ تھا کہ حضرت عثمان نے حضرت سعد کو پھر دوبارہ کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا، لیکن ظاہر ہے، یہ کوفہ کے لوگ آخر وہی تو تھے جنھوں نے غلط سلط شکایات کا طومار باندھ کر عمر فاروق ایسے خلیفہ کو حضرت سعد کے عزل پر مجبور کر دیا تھا، اب حضرت عثمان کے عہد میں وہ ان کو کس طرح گوارا کر سکتے تھے! اس بنار پر ہمارا قیاس ہے کہ اہل کوفہ نے اس مرتبہ پھر حضرت سعد کی شکایات پہونچانی شروع کر دی ہوں گی اور خلیفۂ دوئم کی طرح خلیفۂ سوئم نے بھی محض انتظامی مصلحت سے ان کو معزول کیا ہوگا، اس قیاس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ بلاذری نے عہد فاروقی میں حضرت سعد کی کوفہ کی گورنری سے معزولی کی داستان تو بڑی تفصیل سے لکھی ہے لیکن عہد عثمانی کے سلسلے میں صرف اتنا مذکور ہے کہ حضرت عثمان نے سعد بن ابی وقاص کو گورنر بنایا اور ایک زمانہ بعد انھیں معزول کر دیا۔ کیوں؟ اس کا کوئی تذکرہ نہیں؛ علاوہ ازیں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ عزل عمال و امرا کے بارہ میں حضرت عثمان کی پالیسی کیا تھی؟ اس کے متعلق خود طبری کا بیان ہے:

کان لا یعزل احداً الا عن شکاۃ او استعفاء من غیر شکاۃ؛	حضرت عثمان کسی عہدہ دار کو اسی وقت معزول کرتے تھے جب کہ اس کے خلاف شکایت ہوتی تھی یا شکایت کے بغیر وہ خود مستعفی ہو جاتا تھا۔

اس سے بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ اہل کوفہ نے حسب عادت حضرت سعد کی شکایات کی ہوں گی اور اس بنا پر حضرت عثمان نے ان کو معزول کیا ہوگا۔

(۳) طبری نے ایک روایت لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مدینہ بھی حضرت عثمان سے ناخوش اور ان کے خلاف باغیوں سے سازباز کئے ہوئے تھے، اور انھوں نے باغیوں کو خطوط لکھ کر مدینہ پر چڑھائی کی دعوت دی تھی، ابن کثیر نے مفصل بحث کر کے اس افسانہ کی نہایت پرزور تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ باغیوں نے خود صحابہ کرام کے نام سے جعلی خطوط لکھ کر اطراف واکناف ملک میں روانہ کئے تھے [1]

حضرت عثمان کے عہد خلافت سے متعلق روایات کس درجہ گوناگوں اور رطب ویابس کا مجموعہ ہیں! اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اگرچہ طبری کا مطمح نظر جمع اقوال و روایات تھا، لیکن اس کے باوجود بہت سی روایات اس درجہ شنیع اور ناقابل ذکر و بیان تھیں کہ خود ابن جریر طبری بھی ان کو نقل کرنے کی جرأت نہ کر سکے، چنانچہ لکھتے ہیں: "مدینہ پر مصریوں کی چڑھائی کے اسباب کے بارہ میں واقدی نے بہت کچھ کہا ہے، ہم نے ان میں سے بعض چیزیں بیان کی ہیں، لیکن بعض چیزیں نظر انداز بھی کر دی ہیں، کیونکہ اپنی شناعت و قباحت کے باعث وہ ناگفتہ بہ تھیں" [2] اسی طرح ایک اور موقع پر لکھتے ہیں: حضرت عثمان کے قاتلین اسباب قتل کے بارہ میں جو باتیں بیان کرتے ہیں ان میں سے اکثر چیزوں کا ذکر ہم نے اسی لئے نہیں کیا کہ وہ سب بے سروپا اور نظر انداز کر دینے کے قابل تھیں" [3]

طبری کے اس بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ طبری کے عہد میں اس قسم کی بے سروپا

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۱۷۵

[2] ج ۴ ص ۳۵۶

[3] ایضاً ص ۳۶۵

اور بے بنیاد روایات عام طور پر رائج اور زبان زد خلائق نہیں، طبری نے ان کو شائستہ اعتنا نہیں سمجھا، لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ بعض اور مورخین نے ان کو اپنی تاریخ کا جزنہ بنایا ہوگا!

ہم نے اب تک تاریخ طبری کا مجمل اور مختصر جائزہ لیا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اسی نوع کا ایک مختصر جائزہ بعض دوسرے مورخین کا بھی لے لیا جائے جن کا شمار ثقہ اور مورخین میں ہوتا ہے، اس جائزے سے یہ معلوم ہوگا کہ پبلسٹی (Publicity) اور پروپیگنڈہ ایسی بلا ہیں کہ بالکل جھوٹی اور ناقابل یقین کی خبر کی بھی اگر بڑے پیمانہ پر اشاعت کی جائے تو بڑے سے بڑے محتاط، ثقہ اور معتبر راوی کے لیے بھی اس کو یک قلم نظرانداز کر دینا ممکن نہیں ہوتا، چنانچہ کون نہیں جانتا کہ جن روایات کا نام اسرائیلیات ہے ان کی حیثیت مجموعۂ اکاذیب واباطل کے سوا اور کیا ہے؟ لیکن یہ پروپیگنڈہ کا اثر تھا کہ باایں ہمہ یہ روایات گھر گھر پھیل گئیں اور ثقات مورخین ومفسرین کی کتابیں ان سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

طبقات ابن سعد

ابن سعد کا شمار ثقہ اور معتبر مورخین اسلام میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب "الطبقات الکبریٰ" کا مرتبہ ومقام بحیثیت ایک قدیم تر ماخذ اور مستند ہونے کے سب اہل نظر کے نزدیک مسلم اور ثابت ہے لیکن اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ الطبقات میں کمزور اور بے بنیاد روایات بھی کم نہیں ہیں، چند روایات ملاحظہ کیجئے۔

(۱) ابن سعد نے ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ سورۂ والنجم کی تلاوت کے وقت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "افرأیتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ" کی آیت پر پہونچے تو شیطان نے آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری کرا دیے: "تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی"۔ کفار ومشرکین اپنے معبودان باطل کی یہ تعریف سن کر بہت خوش ہوئے چنانچہ سورت کے اختتام پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ تلاوت کیا تو آپ

کے ساتھ ان لوگوں نے بھی کیا، پھر ابن سعد نے صرف ایک روایت کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس سلسلہ کی چند اور روایات بھی ذکر کی ہیں[1] حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ یہ اور اس سلسلے کی تمام روایات محدثین کے نزدیک قطعاً موضوع اور جعلی ہیں۔

(۲) ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس وقت دفن کیا گیا ہے آپ کے جسم پر تغیر کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے،[2] محدثین کے نزدیک یہ روایت بھی مجروح اور ناقابل اعتبار ہے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جو غلط سلط اور الٹی سیدھی روایت آپ کی بعثت سے قبل کے دور کے متعلق ابونعیم اور جلال الدین سیوطی اور ان جیسے دوسرے مصنفین کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں اور جو نہایت کمزور اور مجروح ہیں ان کا ایک بڑا حصہ الطبقات میں بھی موجود ہے۔

(۴) واقعۂ جنگ صفین کے سلسلہ میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کا آمنا سامنا ہوا تو اول الذکر نے عمرو بن العاص کو مخاطب کر کے کہا۔ تیری مثال اس کتے جیسی ہے کہ اسے اکساؤ یا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، بہر حال وہ زبان باہر کو ہی لٹکائے رہے گا۔" اس کے جواب میں عمرو بن العاص ابوموسیٰ اشعری کو مخاطب کر کے بولے: "تیری مثال اس گدھے جیسی ہے جو کتابوں کا بوجھ لادے پھرتا ہے" ظاہر ہے کہ یہ انداز گفتگو جو قرآن کے حکم "ولا تنابزوا بالالقاب" کی صریح خلاف ورزی ہے دو جلیل القدر صحابہ کا ہر گز نہیں ہو سکتا، اس بنا پر محدثین کی رائے میں یہ روایت منکر اور مردود ہے۔

---

[1] ج ا ص ۶ و ۲۰۵

[2] ج ۲ ص ۲۷۴

یہ اور ان جیسی اور متعدد روایات کے باعث محدثین برملا کہتے ہیں کہ " اگرچہ ابن سعد ثقہ اور معتبر ہیں لیکن اپنی کتاب میں کتنی ہی روایات انھوں نے ایسے لوگوں سے اخذ کرلی ہیں جن کا شمار ضعیف راویوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً خود ان کے استاد واقدی جن کے وہ کاتب تھے، اور ہشام بن محمد السائب الکلبی اور نصر بن ابی سہل الخراسانی وغیرہم۔[1]

کتاب الاستیعاب

اسی طرح علامہ ابن عبدالبر مشہور حافظ حدیث اور نہایت ثقہ اور معتبر شخص ہیں لیکن چوں کہ انھوں نے الاستیعاب میں مجروح اور غیر ثقہ لوگوں پر بھروسہ کرلیا ہے اس بنا پر اس کتاب میں بھی کمزور اور بے بنیاد روایات نے راہ پالی ہے، چنانچہ مشہور ناقد حدیث ابن الصلاح لکھتے ہیں: ابن عبدالبر کی کتاب الاستیعاب بڑے پایہ کی کتاب ہوتی، اگر اس میں مشاجرات صحابہ سے متعلق جو روایات ہیں وہ اخباریوں رداستان گوحضرات) کے بجائے محدثین سے لی جاتیں۔ کیونکہ اخباری عادتاً واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے اور ان میں التباس پیدا کردیتے ہیں۔[2]

الکامل لابن اثیر

اس میں شک نہیں کہ ابن اثیر کی تاریخ الکامل بڑے پایہ کی کتاب ہے اور تاریخ اسلام کے بنیادی ماخذ و مصادر میں شمار ہوتی ہے، لیکن جیسا کہ مصنف نے خود کتاب کے مقدمہ میں کہا ہے۔ طبری کے عہد تک ان کی تاریخ کا ابن جریر طبری بحذف الاسانید رہی ہے اس بناء پر جو رنگ طبری کا ہے وہ الکامل کا بھی ہے اور اس میں تحقیق و تنقید کے بغیر ہر قسم کی روایات کا سراغ ملتا ہے، اگرچہ ابن اثیر نے اکثر مواقع پر حک و فک اور ترمیم و تلخیص سے بھی کام لیا ہے۔

---

[1] فتح المغیث ص ۴۹۶

[2] مقدمۂ ابن الصلاح ص ۲۶۲ و ۲۶۳

البدایہ والنہایہ

اب آیئے البدایہ والنہایہ کا جائزہ بھی لیتے چلیں جس کا پایۂ اعتبار بہ نسبت دوسری کتابوں کے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مصنف علامہ ابن کثیر، علامہ ابن جریر طبری کی طرح جلیل القدر مفسر و محدث، فقیہ، ادب و لغت کے متبحر عالم اور ساتھ ہی بلند پایہ مورخ ہیں، لیکن غلط سلط روایات کی شہرت عام کا سیلاب بڑے سے بڑے صاحب اتقان و افراد کو بھی بہا لے جاتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اگرچہ ابن کثیر نے خود ابن جریر طبری اور دوسرے غیر محتاط مورخین پر سخت تنقید کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اور اکثر مورخین ابن جریر طبری وغیرہ نے نامعروف و مجہول الحال لوگوں سے ایسی روایتیں نقل کی ہیں جو حدیث کی کتب صحیحہ سے ثابت شدہ حقائق کے خلاف ہیں۔ ایسی تمام روایات قابل رد اور قائلین کے منہ پر دے مارنے کے لائق ہیں اور صحابۂ کرام سے متعلق ہمارے جو خیالات ہیں وہ سب اس کے خلاف ہیں جو روافض اور دروغ گو داستان خوان کی روایات سے متوہم ہوتے ہیں، جو حق اور باطل، درست اور نادرست میں امتیاز کر ہی نہیں سکتے۔ [۱]

لیکن اس کے باوجود وہ خود اسی نوع کی روایات سے کلیتاً محفوظ نہیں رہ سکے، اور چونکہ طبری کی طرح انھوں نے جمع روایات کی کوشش کی ہے اس بنا پر بعض مقامات پر روایات متضادہ جمع ہو گئی ہیں [۲] اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے، یہ مثالیں مولانا صلاح الدین یوسف کی فاضلانہ کتاب "خلافت و ملوکیت" ص ۱۲۴ تا ص ۱۲۶ سے ماخوذ ہیں۔

(۱) امیر معاویہ کی نسبت مشہور ہے کہ انھوں نے بسر بن ارطاط کو یمن کے علاقہ میں گورنر بنا کر بھیجا، وہاں انھوں نے حامیان علی کے دو بچوں اور بہت سے مردوں کو قتل

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۸، ص ۱۴۷ [۲] یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ ابن خلدون (باقی صفحہ ۔۔ پر)

کردیا۔ حافظ ابن کثیر یہ روایت ذکر کر کے لکھتے ہیں: "یہ خبر اصحاب المغازی والسیر کے یہاں بہت مشہور ہے، لیکن میرے نزدیک اس کی صحت مشکوک ہے۔" لیکن آگے چل کر یہی روایت مختصراً تسلسل واقعات کے ضمن میں اس طرح لے آئے ہیں کہ گویا ان کے نزدیک صحیح ہے، وہاں اس کے مشکوک ہونے کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتے [1]

(۲) حضرت عثمان نے خلیفہ بننے کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اس کے الفاظ بعض حضرات نے یہ بھی نقل کئے ہیں (طبری میں یہ الفاظ موجود ہیں) اول مرکب صعب وان اعش فستا الخطبة علی وجهها۔ حافظ ابن کثیر اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "اسے صاحب العقد الفرید وغیرہ نے ذکر کیا ہے، لیکن میرے نزدیک اس کی اسناد ایسی نہیں ہے کہ جس سے نفس مطمئن ہو سکے"۔ لیکن آگے چل کر ضعف کی صراحت کے بغیر اس روایت کو اس انداز سے نقل کر گئے ہیں کہ گویا ان کے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں ہے [2]

(۳) جنگ صفین میں حضرت علی کے ساتھ کتنے بدری صحابہ تھے؟ اس کے متعلق حافظ صاحب نے شعبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صرف چھ بدری صحابہ تھے، ایک دوسرا قول نقل کیا ہے جس کی رو سے چار تھے، ایک دوسرے مقام پر تعداد ایک یا تین بتائی ہے، لیکن آگے چل کر ایک ایسی روایت کا ذکر ہے جس کی رو سے یہ تعداد یک لخت ۷۰ تک پہونچ جاتی ہے۔ [3]

(بقیہ حاشیہ) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے مقدمہ دوسروں کے لیے لکھا ہے، خود اپنی تاریخ میں اس پر عمل نہیں کیا۔

[1] البدایۃ والنہایۃ ج، ص ۳۲۲ و ج ۸ ص ۹۰

[2] ج، ص ۱۴۸ و ص ۲۱۴

[3] ج، ص ۲۳۳، ۲۵۲، ۲۵۴ و ۲۷۴

(۴) امام حسین کے سانحۂ شہادت کے سلسلے میں جو خوارق عادت واقعات بیان کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شہادت کے بعد سورج کی کرنیں دو تین مہینے تک خون آلود نظر آتی رہیں، حافظ صاحب نے بھی ایک جگہ یہ واقعہ اس انداز سے نقل کیا ہے کہ گویا ان کے نزدیک یہ صحیح واقعہ ہے۔ لیکن ایک دوسرے مقام پر اسے من گھڑت اور شیعوں کی ایجاد بتایا ہے [۱]

(۵) مروان بن الحکم کے ترجمہ میں حافظ صاحب بھی مروان کی طرف یہ غلط الزام منسوب کرتے ہیں کہ انھوں نے خلیفہ کی طرف سے مصر کے گورنر کو خط لکھا تھا اور آخری کار یہی خط حضرت عثمان کی شہادت کا باعث بنا حالانکہ اس سے پہلے حافظ صاحب اس کی تصریح کر آئے ہیں کہ یہ خط خود باغیوں کی سازش تھا جس کا جال انھوں نے تمام ملک میں پھیلا رکھا تھا [۲]

(۶) امام حسین کا سر بریدہ شام بھیجا گیا تھا یا نہیں؟ اس بارہ میں ابن کثیر نے صاف کہا کہ صحیح بات یہ ہے کہ سر شام سرے سے بھیجا ہی نہیں گیا، لیکن آگے چل کر رقم طراز ہیں: زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ ابن زیاد نے یہ سر یزید کے پاس شام بھیج دیا تھا، اور اس کے ساتھ شیعوں کی من گھڑت یہ روایت بھی نقل کر دی ہے کہ سر دیکھ کر یزید نے اشعار پڑھے جن میں سے ایک شعر کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے آج بدر کا بدلہ لے لیا ہے، استغفر اللہ [۳]

(۷) بعض جگہ حافظ ابن کثیر دو متضاد روایات ذکر کر دیتے ہیں اور ان کی صحت وسقم کے بارہ میں خاموش رہتے ہیں، مثلاً امام حسین کو چھڑی مارنے کے واقعہ میں بعض لوگ اس

---

[۱] ج ۸ ص ۱۷۱ و ۲۰۱

[۲] ج ۷ ص ۱۷۴ و ۱۷۵ و ج ۸ ص ۲۵۹

[۳] جلد ۸ ص ۱۶۵ و ۱۹۲

کی نسبت ابن زیاد کی طرف کرتے ہیں جو صحیح ہے اور بعض لوگوں نے اس کی نسبت یزید کی جانب کی ہے جو ضعیف ہے، حافظ ابن کثیر نے دونوں روایات بغیر کسی تنقید و ترجیح کے ذکر کردی ہیں۔ له امام حسین کی شرائط کے بارہ میں دو متضاد روایات ذکر کی ہیں له یزید کی شراب نوشی سے متعلق بھی دو متضاد بیان ہیں، ایک قول میں اس کا اعتراف کیا ہے لیکن دوسرے ہی صفحہ پر امام حسین کے بھائی محمد بن الحنیفہ کا قول ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے اس الزام کو غلط بتایا ہے، له

اکنوں چہ باید کرد آپ نے دیکھ لیا کہ ہماری معتبر سے معتبر کتب تاریخ کا کیا حال ہے! اور یہ صورتِ حال صرف تاریخ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تفسیر و حدیث، ادب و انشا، تصوف اور وعظ و تذکیر کی کتابیں بھی اس نوع کی ضعیف و کمزور اور موضوع و مجہول روایات سے محفوظ و مامون نہیں ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ جس ماحول اور جس فضا میں یہ کتابیں لکھی گئی ہیں اس کے پیش نظر ایسا ہونا ناگزیر تھا، اس بنا پر مسلمانوں میں فن اسماء الرجال پیدا ہوا اور اس فن کے نامور محققین و مصنفین نے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کا سراغ لگا کر ان کا کچا چٹھا سب دنیا کے سامنے پیش کردیا اور دوسری طرف ان حضرات نے تحقیق و تنقید و تعدیل کے وہ اصول و ضوابط مرتب کئے جن کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد صحیح اور موضوع اور قوی و ضعیف احادیث و روایات میں امتیاز بخوبی اور کامل اطمینان بخش طریقہ پر ہوجاتا ہے اگرچہ ہمارے مورخین نے بھی محدثین کی طرح اسناد کا طریقہ اختیار کیا ہے اور اس سے روایات کو جانچنے اور پرکھنے میں جو مدد ملتی ہے وہ بڑی وقیع ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ حدیث کی دینی اور تشریعی حیثیت

له ج ۸ ص ۱۷۰ و ۱۷۵

له ج ۸ ص ۲۳۲ و ۲۳۳

کے باعث جرح و تعدیل میں جو دقیقہ رسی اور خوردہ گیری درکار ہے اور جس کا استعمال علمائے اسماء الرجال نے سختی سے کیا ہے وہ تاریخ میں غیر ضروری ہے چنانچہ ابن اسحاق اور محمد بن عمر الواقدی جیسے متعدد حضرات جن کا بحیثیت محدث بلند مقام نہیں ہے ان کی مورخانہ عظمت کو سب نے تسلیم کیا ہے، اس بنا پر تاریخ کی تنقید کے لیے چند اصول الگ متعین کرنے ہوں گے، اور تاریخ کا مطالعہ فلسفہ تاریخ کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ علامہ ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ اسی سلسلے کی پہلی اور عظیم الشان کوشش ہے، ہمارے زمانہ میں پروفیسر ٹوئن بی (Toynbee) نے اس فن کو اور آگے بڑھا کر تاریخ کو سائنس کے پہلو میں لا بٹھایا ہے۔

اس سلسلے میں جہاں تک عہد نبوی اور عہد صحابہ کا تعلق ہے۔ پہلا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اگر کوئی واقعہ کسی صحیح حدیث میں بھی مذکور ہے تو اس کو لامحالہ ترجیح ہوگی اس روایت پر جو تاریخ کی کسی کتاب میں درج ہے۔

(۲) دوسرا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ قرآن مجید اور احادیث کی صحیح روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام خصوصاً عشرۂ مبشرہ اور خلفائے راشدین کی جو شخصیت ابھرتی ہے اگر کسی تاریخی روایت میں کوئی بات اس کے خلاف ہوگی تو وہ ہرگز قابل قبول نہ ہوگی چنانچہ آپ پڑھ آئے ہیں کہ اگرچہ ڈاکٹر طہٰ حسین کا شمار آزاد خیال ناقدین تاریخ و ادب میں ہوتا ہے، لیکن انھوں نے بھی حضرت علی اور حضرت سعد بن ابی وقاص کی نسبت کی تاریخ کی دو روایتیں یہ کہہ کر رد کر دیں کہ یہ روایتیں ان دونوں عظیم المرتبت صحابیوں کی شان سے بہت مستبعد ہیں، محدثین نے تو اس اصول کی بنا پر تاریخ کجا صحیح بخاری کی بعض روایات تک کو محض اس لیے رد کر دیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی تھیں، چنانچہ صحیح بخاری باب شراء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالنسیہ میں حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ

ایک یہودی کے پاس گروی رکھ کر اس سے اپنے متعلقین کے لیے جو خرید ے، اس کے بعد حضرت انس کا بیان ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کبھی ایک صاع زنقریباً تین سیر، گیہوں یا اور کوئی غلہ فراہم نہیں ہوا۔ اس روایت کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور علامہ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ یہ ظاہر حقیقت حال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف ہے، اور حضور تو حضور! اگر کسی روایت سے کسی صحابی کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہے اور قرائن اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں تو محدثین نے اس روایت کو بھی سند قبول عطا نہیں کی ہے، چنانچہ غزوۂ احزاب کے سلسلے میں ایک روایت ہے جس سے حسان بن ثابت انصاری پر بزدلی کا الزام آتا ہے، حافظ عبدالبر نے اس روایت کو محض اس بنا پر منکر قرار دیا ہے کہ اگر یہ الزام درست ہوتا تو جن شاعروں نے حضرت حسان کی ہجو لکھی ہے وہ اس کا ذکر ضرور کرتے لے

(۳) اگر کسی شخص سے متعلق ایک واقعہ کی دو روایتیں ہوں، ان میں سے ایک روایت کا راوی صاحب واقعہ کے مخالف گروہ سے تعلق رکھتا ہو اور دوسری روایت کے راوی کا تعلق مخالف گروہ سے بالکل نہ ہو اور یا غیر جانب دار ہو یا صاحب واقعہ کے حامیوں میں سے ہو، اس صورت میں اول الذکر راوی کی روایت پر موخرالذکر کی روایت کو ترجیح ہوگی، کیونکہ مخالفت تو دور کی بات ہے، ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ زید خواہ کتنا ہی راستگو انسان ہو، لیکن اگر اس کے دل میں بکر کی طرف سے رنجش اور ملال ہے تو جب کبھی وہ بکر کے متعلق کوئی بات کہے گا اس میں اس کی طرف سے رنجش کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور آجائیگا اس کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ واقعہ افک میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حضرات سے حضرت عائشہ کے بارہ میں ان کی رائے دریافت کی تو سب نے ام المومنین کی بڑی تعریف اور مدح کی، لیکن جب حضرت علی کی نوبت آئی تو آپ نے حضرت عائشہ کی نسبت نفیاً یا اثباتاً کوئی بات نہ کہی۔ اور صرف یہ فرمایا: حضور! آپ کے لیے بہتر سے بہتر

لے الاستیعاب ص ۱۸۶

عورت مہیا ہو سکتی ہے، ایک رمز شناس کلام پہچان سکتا ہے کہ اگرچہ حضرت علی نے کوئی غلط بات نہیں کہی، لیکن اس وقت ان کا جواب اس رنجش پنہاں کی غمازی کر رہا ہے جو بعض خانگی معاملات کے باعث ان کے دل میں حضرت عائشہ کی طرف سے تھی۔

(۴) ایک روایت کے صحت و سقم، اس کے دروبست اور ہیئت ترکیبی میں اس ماحول کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے جس میں وہ پیدا ہوئی ہے کوئی راوی کیا ہی ثقہ اور معتبر ہو اس کی روایت ماحول کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ماحول ایک خاص ذہن اور فکر پیدا کرتا ہے جس کے اثرات کی چھاپ اس ماحول میں رہنے والے لوگوں کے افکار و خیالات اور اقوال و آراء میں نظر آسکتی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں مدینہ منورہ، شام، کوفہ، بصرہ اور مصر ان میں سے ہر جگہ کا ماحول سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کے باعث ایک دوسرے سے جدا تھا۔ اس بناء پر ان مقامات میں رہنے والے راویوں کی روایات میں کسی نہ کسی جہت سے فرق پیدا ہو گیا ہے۔ پھر راویوں کی اپنی سمجھ بوجھ، مشاہدہ و سماعت، اور اظہار و بیان کی صلاحیت و استعداد میں فرق و اختلاف کے باعث روایتوں میں اختلاف کی خلیج اور وسیع ہو گئی۔ جس کی وجہ سے روایات میں صرف الفاظ کے تغیر و تبدل اور واقعہ کے جزئیات میں کمی بیشی کا فرق نہیں بلکہ بعض اوقات تناقض بھی پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر خورشید احمد فارق (شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی) نے بڑی محنت اور تحقیق سے "حضرت عثمان کے سرکاری خطوط" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ اس سے پہلے وہ "حضرت ابوبکر صدیق اور "حضرت عمر فاروق کے سرکاری خطوط کے دو مجموعے الگ الگ مرتب کر چکے تھے، یہ تینوں کتابیں ندوۃ المصنفین دہلی کی شائع کردہ ہیں۔ تیسری کتاب یعنی "حضرت عثمان کے سرکاری خطوط" اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، اس کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ ابتدائی مورخین اسلام کے مشہور اسکول پانچ ہیں، محمد ابن اسحاق

(م ۱۵۰ھ یا ۱۵۱ھ) کا اسکول، سیف بن عمر (م ۱۸۰ھ) کا اسکول، ابن الکلبی (م ۲۰۶ھ) کا اسکول، محمد بن عمر الواقدی (م ۲۰۷ھ) کا اسکول اور مدائنی (م ۲۲۵ھ) کا اسکول، اس کے بعد لکھتے ہیں: ان پانچوں اسکولوں کے تاریخی بیانات کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ بیانات بڑی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں، کسی واقعہ کے جزئیات وتفاصیل ہوں، یا روپیہ پیسہ، فوج، لشکر، مقتولین و شہدا کے اعداد و شمار ہوں یا موت وولادت، فتح وشکست، کے مہینے اور سال ہوں، یہ اسکول شاذ و نادر ہی ان امور میں متفق اور متحد نظر آتے ہیں، ان کے مجموعی اتفاق کا تناسب آپ پانچ سات فی صد سے زیادہ نہیں پائیں گے۔ ؎ آگے چل کر لکھتے ہیں: واقعہ کے جزئیات، تفاصیل، اعداد و شمار اور سنین و شہور کے اختلاف کے علاوہ ان مورخین کے بیانات ایک دوسرے سے متضاد اور متناقض بھی ہوتے ہیں، یہ اختلاف اور تناقض ان کے بیان کردہ سرکاری خطوط میں بھی موجود ہے، خواہ وہ خطوط حضرت ابوبکر صدیق کے ہوں یا عثمان غنی کے یا حضرت علی حیدر یا کسی دوسرے خلیفہ یا حاکم کے اس اختلاف و تناقض کے اسباب پر گفتگو کرنے کے بعد مصنف نے خلفائے ثلاثہ کے خطوط کی روایات میں اختلاف وتضاد کی متعدد مثالیں نقل کی ہیں اور چونکہ اس کتاب کا موضوع "حضرت عثمان کے خطوط ہیں اس لئے ہر خط کے ترجمہ اور اس کی تشریح کے ساتھ پروفیسر صاحب یہ بھی دکھاتے گئے ہیں کہ ہر خط کتنی روایتوں سے مروی ہے اور روایات میں اختلاف کے باعث اس کی کتنی شکلیں بن گئی ہیں۔ ہم یہاں مثال کے طور پر ایک خط نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ ایک ہی چیز کے متعلق روایات کے اختلافات نے بات کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

؎ صفحہ ۱۴۶

آپ آگے چل کر کتاب میں پڑھیں گے کہ جب حضرت ابوذر غفاری نے شام پہونچ کر اپنے معاشی نظریہ کی تبلیغ بڑے زور شور سے شروع کی تو ملک میں بحران پیدا ہوگیا اور امن وامان کی صورت حال مخدوش ہوگئی۔ امیر معاویہ نے دربار خلافت میں اس کی اطلاع بھیجی تو حضرت عثمان نے ان کو لکھا کہ حضرت ابوذر غفاری کو ان کے پاس مدینہ روانہ کر دیا جائے، حضرت عثمان کا یہ خط اسی سلسلے میں ہے، اب ملاحظہ فرمایئے کہ یہ ایک خط راویوں کے اختلاف کے باعث کیا سے کیا ہوگیا ہے، ایک روایت سیف بن عمر کی ہے جس میں خط کا مضمون یہ ہے:

"سول وار (Civil war) کے سانڈ نے نتھنے اور آنکھیں پھلالی ہیں اور جست لگانا ہی چاہتا ہے، اس لیے اس کے زخم مت کریدو، ابوذر کو میرے پاس بھیج دو، ان کے ساتھ زاد راہ اور رہبر بھی کرو، نیز لطف و محبت سے پیش آؤ جہاں تک ہو سکے نہ خود زیادتی کرو اور نہ اپنے ماتحتوں کو کرنے دو۔"[1]

خط کی دوسری شکل یہ ہے: "تمہارا خط موصول ہوا، ابوذر کے حالات معلوم ہوئے میرا خط پاتے ہی ان کو ننگے پالان پر سوار کرنا اور ایک ایسے سخت ساربان کو ان کے ہمراہ کرنا جو رات دن اونٹ چلائے، تاکہ ابوذر پر خواب طاری ہو جائے اور میرے اور تمہارے ذکر سے غافل ہو جائیں"[2]

خط کی تیسری شکل: "جندب (ابوذر) کو ایک سخت اور تکلیف دہ اونٹ پر سوار کر کے میرے پاس بھیج دو۔"[3]

---

[1] ابن جریر طبری ج ۵ ص ۶۶ و تاریخ کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۴۴ (یہ سب حوالے، حضرت عثمان کے سرکاری خطوط کے مطابق ہیں۔ [2] فتوح ابن اعثم کوفی ورق ۲۹۳

[3] شرح نہج البلاغۃ ج ۱ ص ۲۴۱

خط کی چوتھی شکل :- میرا خط پاکر جندب بن جنادہ (ابوذر) کو ننگے پالان پر بٹھا کر میرے پاس بھیج دو۔[1]

اب خط کی ان چاروں صورتوں کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ صحیح اور اصل شکل خط کی وہی ہے جو پہلی ہے، کیونکہ حضرت عثمان کے شایان شان یہی ہے اور یہ ان روایات کے بھی مطابق ہے جن سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوذر کے معاشی نظریہ سے اختلاف کے باوجود حضرت عثمان نے ان کا ہمیشہ خاطر خواہ ادب واحترام کو ملحوظ رکھا، یہ روایات اپنی جگہ پر ہم کتاب میں نقل کریں گے۔ پھر یہ خط حضرت عثمان کے اس نامہ گرامی کے مطابق بھی ہے جو آپ نے اس معاملہ میں براہِ راست خود حضرت ابوذر کو لکھا ہے اور جس کو پروفیسر فارق نے مندرجہ بالا چار خطوط کے فوراً بعد نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے:- میرے پاس آجاؤ میں معاویہ کی بہ نسبت تمہارے حقوق کا زیادہ خیال رکھوں گا اور تمہارے ساتھ زیادہ اچھی طرح پیش آؤں گا۔[2]

بہر حال یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ معلوم ہو گا کہ تاریخ اسلام اور خصوصاً عہد صحابہ کی تاریخ کا جہاں تک تعلق ہے اس کے مصادر و مآخذ کی استناد و اعتبار کی حیثیت سے کیا نوعیت ہے اور ان سے کس طرح استفادہ کرنا چاہیئے۔

سعید احمد اکبر آبادی

---

[1] عیون الاخبار ادریس بن حسن قلمی ج ۲ ص ۲۶۸

[2] تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۲۹

حضرت عثمان عہد نبوی میں

نام ونسب اور خاندان

عثمان نام، ابو عبداللہ اور ابو عمرو کنیت، والد کا نام عفان اور والدہ کا نام اروی تھا، قریش کی شاخ بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مجد و شرف اور عزت و وجاہت کے اعتبار سے بنو ہاشم کے بعد الشمس کا مرتبہ تھا۔ چنانچہ قومی علم عقاب انہیں کی تحویل میں رہتا تھا۔ حرب فجار[1] میں جو شخص سپہ سالار اعظم کی حیثیت رکھتا تھا وہ اسی خاندان کا ایک نامور سردار حرب بن امیہ تھا، حضرت عثمانؓ کا سلسلۂ نسب والد اور والدہ دونوں کی طرف سے پانچویں پشت میں عبد مناف پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب سے

---

[1] یہ جنگ قریش اور قیس کے درمیان ہوئی تھی، قریش کے تمام خاندانوں کے فوجی دستے الگ الگ تھے، آل ہاشم کا فوجی دستہ زبیر بن عبد المطلب کی کمانڈ میں تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی دستے میں شامل تھے، بڑے زور کا معرکہ ہوا اور آخر صلح پر خاتمہ ہو گیا۔

مل جاتا ہے،[۲] پھر اس پر مزید یہ کہ حضرت عثمان کی نانی ام حکیم (یا حکیم) بیضاء بنت عبدالمطلب یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں،[۳] حضرت عثمان کی والدہ کو لوگ قبۃ الدیباج کہتے تھے[۴]

ولادت حضرت عثمان ہجرت مدینہ سے ۴۷ برس قبل مطابق ۵۷۶ء مکہ میں پیدا ہوئے، بچپن اور جوانی کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ آپ مکہ کے ان چند اور نمایاں لوگوں میں تھے جو نوشت وخواند جانتے تھے۔

تجارت قریش کا عام پیشہ تجارت تھا۔ اس میں انھوں نے بڑی ناموری حاصل کی تھی۔ قرآن مجید کی سورۂ ایلاف میں گرمی اور سردی کے موسم میں قریش کے تجارتی قافلوں کے جانے کا ذکر ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے بچپن میں اپنے چچا ابوطالب کے تجارتی قافلے کے ساتھ شام کے سفر پر گئے تھے اور اس کے بعد عہد شباب میں حضرت خدیجہ کے ٹریڈ ایجنٹ ہوکر دوبارہ تشریف لے گئے تھے قرآن کی سورۂ والضحیٰ میں " ووجدک عائلاً فاغنی " ہم نے آپ کو تنگ دست پایا تو غنی کردیا۔ فرماکر اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قریش کے اسی عام مذاق کے باعث حضرت عثمان نے بھی تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا اور ایک شخص ربیعہ بن حارث کی شرکت میں کپڑے کا کاروبار بہت بڑے پیمانہ پر شروع کردیا[۵] اس میں انھوں نے وہ کامیابی اور

---

[۲] والد کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف اور والدہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: اروی بنت کریز بن ربیعۃ بن حبیب بن عبد شمس بن عبد مناف

[۳] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۳۶

[۴] کامل مبرد ج ۲ ص ۳۷

[۵] اصابہ ابن حجر ج ۲ ص ۱۹۷

شہرت حاصل کی کہ ان کا لقب ہی غثمان غنی ہوگیا، وہ فطرتاً بڑے حلیم، سخی اور اعلیٰ اخلاق و فضائل کے انسان تھے، اسی بنا پر قریش میں نہایت معزز و محترم تھے اور قریش ان سے اتنی محبت کرتے تھے کہ وہ ضرب المثل بن گئی تھی، چنانچہ عرب کہا کرتے تھے "احبک والرحمٰن حبّ قریش عثمان" ترجمہ: میں تجھ سے بخدا ایسی محبت کرتا ہوں جیسی محبت قریش عثمان سے کرتے تھے"۔[1]

قبول اسلام

حضرت عثمان فطرتاً بڑے نیک، راست باز، اور ایمان دار تھے، شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی، جو لوگ پیتے تھے وہ فخر کرتے اور نہ پینے والوں پر طعن کرتے تھے، کیوں کہ ان کے نزدیک شراب نہ پینا بخل کی علامت تھا، لیکن اس ماحول میں دولت و ثروت کے ساتھ رہنے کے باوجود آپ ان چند اکابر قریش (مثلاً حضرت عباس، ابوبکر، عبدالرحمٰن بن عوف وغیرہم) میں سے تھے جو سلیم الفطرت ہونے کے باعث شراب سے نفرت کرتے تھے[2]۔ اسی طرح گانا بجانا، لہو و لعب، اور زنا کاری عرب کے پسندیدہ مشاغل میں تھے، لیکن حضرت عثمان ان سب چیزوں سے بھی طبعاً نفور اور مجتنب تھے، چنانچہ ایک مرتبہ فرمایا: میں نے عہد جاہلیت میں یا اسلام میں نہ کبھی زنا کیا ہے، نہ شراب پی ہے اور نہ گایا بجایا ہے۔[3]

طبیعت کی اس نیکی اور حق پرستی کے باعث مکہ مکرمہ میں پہلے پہل جب اسلام کا غلغلہ بلند ہوا اور یہ صدائے روح نواز فردوس گوش ہوئی آپ فوراً مشرف باسلام ہوگئے، خود ان کے اپنے بیان کے مطابق اسلام قبول کرنے والوں میں ان کا نمبر

---

[1] العقد الفرید النهضة المصریة، اڈیشن ج ۴ ص ۲۸۵

[2] شرح شواہد مغنی اللبیب جلال الدین سیوطی ص ۴۴

[3] کنز الاعمال علی المتقی الہندی ج ۱۵ ص ۲۲

چوتھا تھا [1] اسی بنا پر آپ کے سابقین اولین میں شامل ہونے پر تو سب متفق ہیں، البتہ اختلاف اس میں ہے کہ اسلام قبول کس طرح کیا تھا؟ ایک روایت میں خود فرماتے ہیں: جب ابوبکر کی تبلیغ پر میں نے اسلام قبول کر لینے کا ارادہ کر لیا تو اسی غرض سے ہم دونوں خدمتِ اقدس میں حاضر ہونے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: عثمان! میں مخلوق کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہوں، تو خدا کی جنت قبول کر، حضرت عثمان کا بیان ہے: ان دو سادہ جملوں میں کس غضب کی تاثیر تھی کہ کلمۂ شہادت بے اختیار میری زبان پر جاری ہوگیا۔ [2] لیکن ابن سعد کی روایت ہے کہ حضرت زبیر بن عوام کے بعد حضرت عثمان اور حضرت طلحہ دونوں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اسلام پیش کیا اور انھوں نے اسے فوراً قبول کر لیا [3]

نکاح کچھ دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرف عطا فرمایا کہ آپ کی صاحبزادی حضرت رقیہ جو حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم کے درمیان تھیں، ان کا نکاح پہلے ابولہب کے لڑکے عتبہ سے ہوا تھا۔ ابولہب اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ میں چچا تھا لیکن اسلام اور پیغمبر اسلام کا سخت ترین دشمن تھا۔ اس لیے اس نے بیٹے پر دباؤ ڈال کر حضرت رقیہ کو طلاق دلوادی، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت عثمان سے کر دیا اور اس طرح ان کے ساتھ مصاہرت کا رشتہ بھی قائم فرمالیا۔ حضرت عثمان کا یہ نکاح دوسرا تھا، پہلے نکاح سے جو بچہ پیدا ہوا تھا اس کی نسبت

---

[1] ایضاً

[2] الاصابۃ لابن حجر ج ۸ تذکرہ سعدیٰ بنت کریز

[3] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۳۶

سے حضرت عثمان کی کنیت ابو عمرو تھی لیکن حضرت رقیہ کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوا اس کا نام عبداللہ تھا۔ اس لئے اب حضرت عثمان کی کنیت بھی ابو عبداللہ ہو گئی۔ [1]

شدائد یہ وقت اسلام کے لیے سب سے زیادہ نازک اور شدید تھا۔ جو اسلام قبول کرتا تھا مورد مصائب و آلام ہو جاتا تھا، چنانچہ حضرت عثمان اگرچہ دولت و ثروت کی وجہ سے اگرچہ خاندان میں نہایت معزز اور باوقار تھے لیکن اس ابتلائے عام سے وہ بھی نہ بچ سکے، ان کا چچا الحکم ان کو رسی سے باندھ کر مارتا اور کہتا: تو اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر اس نئے مذہب کو قبول کر بیٹھا ہے، خدا کی قسم! میں تجھ کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تو اس مذہب کو ترک نہیں کر دے گا حضرت عثمان جواب دیتے: بخدا! میں اس دین کو کبھی نہ چھوڑوں گا اور نہ اس سے جدا ہوں گا" الحکم بھتیجے کا یہ اصرار اور استقلال دیکھتا تو آخر ہار مان کر بندش کھول دیتا [2] حضرت عثمان کے اسلام قبول کر لینے کا صدمہ ان کی والدہ کو بھی اس درجہ شدید ہوا کہ گھر چھوڑ کر اپنے بھائی عامر بن کریز کے گھر جا بیٹھیں، آخر جب بیٹے کے ترک اسلام سے بالکل مایوس ہو گئیں تو سال بھر کے بعد اپنے گھر واپس آئیں [3]

ہجرت حبشہ دعوتِ اسلام تین برس تک پوشیدہ رہی۔ پھر قرآن کے حکم "فاصدع بما تومر: جو کچھ آپ کو حکم دیا جاتا ہے اس کو برملا اور دانشگاف کہیئے" کے مطابق دعوت اسلام علی الاعلان ہونے لگی اور لوگوں میں اس کی مقبولیت

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۳۷

[2] ایضاً

[3] انساب الاشراف بلاذری ج ۵ ص ۲

[4] سیرت ابن ہشام ص ۲۹۴ (قسم اول)

پھیلنے لگی تو قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ایذا رسانی کی مہم تیز تر کر دی۔ یہ صورت حال دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کا مشورہ دیا۔ شروع میں دس مسلمان گئے، اس کے بعد کچھ اور متفرق اوقات میں گئے۔ ان کی مجموعی تعداد تراسی تھی، انھیں مہاجرین میں حضرت عثمان اور ان کی اہلیہ رقیہ بھی تھے ۵ نبوی۔ چند برس کے بعد حبشہ خبر پہونچی کہ قریش مسلمان ہو گئے ہیں تو بہت سے مہاجرین مکہ واپس آ گئے۔ ان میں حضرت عثمان بھی تھے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی تو بہت سے مہاجرین واپس حبشہ چلے گئے، لیکن حضرت عثمان واپس نہ گئے اور اپنی اہلیہ کے ساتھ یہیں مقیم رہے۔

ہجرت مدینہ قریش کی روز افزوں عداوت اور ایذا رسانی کے باعث جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا عزم فرمالیا تو جتھہ جتھہ صحابۂ کرام کو مدینہ بھیجنا شروع کر دیا۔ چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو مسلمان مدینہ پہونچ گئے تھے ان میں حضرت عثمان مع اہل وعیال بھی تھے۔

سریۂ غطفان ۳ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہونچی کہ قبیلۂ بنو ثعلبہ اور محارب کا ایک جتھا مقام ذوامرین اس غرض سے جمع ہوا کہ مختلف سمتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہو، اس فوج کو ایک شخص نے فراہم کیا تھا جس کا نام دعثور تھا۔ یہ خبر ملتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ایک جماعت کو لے کر روانہ ہو گئے اور مدینہ کا انتظام حضرت عثمان کے سپرد فرمایا[1]

غزوۂ بدر میں عدم شرکت حضرت عثمان تمام غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جان و مال سے شریک رہے، البتہ غزوۂ بدر (رمضان ۲ھ) میں اس لیے شریک نہ ہو سکے کہ آپ کی اہلیہ حضرت رقیہ سخت علیل تھیں۔

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۳۹

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ وہ بیوی کی دیکھ بھال اور علاج کی خاطر مدینہ میں ہی قیام کریں۔ حضرت رقیہ جانبر نہ ہوسکیں اور ٹھیک اس وقت جب زید بن حارث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقہ پر سوار مدینہ میں داخل ہوکر غزوہ بدر میں فتح مبین کا اعلان کر رہے تھے حضرت عثمان اور حضرت اسامہ بن زید قبرستان میں حضرت رقیہ کی تدفین میں مصروف تھے، تاہم چونکہ غزوہ بدر میں عدم شرکت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تھی اس لیے آپ نے حضرت عثمان کو بھی مال غنیمت میں سے ایک مجاہد کا حصہ عطا فرمایا[۱]

ذوالنورین کا خطاب

حضرت رقیہ کی ذات سے حضرت عثمان کو جو شرف خاص حاصل تھا اس سے محرومی کا انھیں سخت ملال اور رنج تھا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رقیہ سے چھوٹی صاحب زادی حضرت ام کلثوم کو بھی حضرت عثمان کے حبالہ عقد میں دے دیا۔ یہ وہ شرف و امتیاز خاص تھا جس کے باعث حضرت عثمان کا عام لقب ذوالنورین ہوگیا؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاملہ میں حضرت عثمان کی دلجوئی اس قدر منظور تھی کہ چند برس کے بعد جب حضرت ام کلثوم کا بھی انتقال ہوگیا تو ارشاد نبوی ہوا: "اگر میری کوئی اور بن بیاہی بیٹی ہوتی تو میں اس کا نکاح بھی عثمان سے کردیتا"[۲]

غزوہ احد میں شرکت

غزوہ بدر کے بعد شوال ۳ھ میں غزوہ احد ہوا تو حضرت

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۳۸، یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت عثمان خود بہت دولتمند تھے انھیں مال غنیمت میں سے حصہ لینے کی کیا ضرورت ہوسکتی تھی، لیکن حضور نے ان کو یہ اس لیے دلوایا کہ آئندہ کوئی شخص غزوہ بدر میں عدم شرکت کے باعث حضرت عثمان پر زبان طعن دراز نہ کرسکے؛

[۲] فتح الباری ج ۷ ص ۳۳٦، یہ روایت طبقات میں بھی ہے۔

عثمان اس میں شریک تھے، غزوۂ بدر کی طرح اس جنگ میں بھی قریش کی ٹڈی دل اور ساز و سامان حرب سے مکمل طور پر آراستہ فوج کے مقابلہ میں مسلمانوں نے جن میں آزمودہ کار بہادر پیر کے دوش بدوش سبزۂ آغاز کم سن نوجوان بھی تھے محض خالصتہً لوجہ اللہ جان فروشی اور بجاد و بسالت کے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ تاریخ اسلام کی قبائے افتخار کا تکمۂ زریں ہیں، دشمن شکستِ فاش کھا کر میدانِ جنگ سے بھاگ ہی رہا تھا کہ مسلمان قدر انداز جو پہاڑ کی چوٹی پر متعین تھے ان کی سہل انگاری سے جنگ کا رخ پلٹ گیا۔ انھوں نے میدانِ جنگ کو خالی دیکھ کر اپنے محاذ کو چھوڑ دیا اور مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے۔ ابو سفیان نے پہاڑ کا محاذ خالی دیکھا تو اپنے دستہ کے ساتھ عقب سے آکر اس زور کا حملہ کر دیا کہ مسلمانوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور ایسی افراتفری مچی کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی، یہ ہنگامۂ دار و گیر بپا تھا ہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات پا جانے کی افواہ پھیل گئی۔ اس نے رہے سہے اوسان اور خطا کر دیے، ظاہر ہے، اس قسم کے موقع پر مزاج اور طبیعت کے اختلاف کے باعث اس افواہ کے اثرات نفسیاتی طور پر دو طرح کے ہی ہو سکتے تھے،[1] چنانچہ مہاجرین و انصار کے ایک طبقہ پر تو اس افواہ سے اس درجہ مایوسی اور دل شکستگی طاری ہو گئی کہ ہمت چھوڑ کر بیٹھ گئے، کہ جس کے دم قدم سے یہ ساری شورشِ حیات تھی جب وہ ہی نہیں رہا تو اب کیا کرنا ہے، لیکن اس طبقہ کے بالمقابل ایک دوسرا گروہ تھا جس پر اس افواہ کا ردِ عمل بالکل مختلف ہوا، ان کو مثلاً یہ خیال ہوا کہ جب حضور ہی دنیا میں نہیں رہے تو پھر جینے سے کیا حاصل! اس دوسرے طبقہ میں حضرت انس بن النضر بھی تھے، چنانچہ انھوں نے تلوار اٹھائی اور چل پڑے، راستے میں دیکھا کہ چند مہاجرین اور انصار بیٹھے ہوئے ہیں، پوچھا! کیا بات

---

[1] یاد کیجئے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تھی تو اس وقت بھی صحابۂ کرام پر اس کے اثرات مختلف ہوئے تھے۔

ہے" ان حضرت نے جواب دیا" رسول اللہ تو شہید ہو گئے" حضرت انس تڑپ کر بولے" تو پھر اب زندہ رہ کر کیا کرو گے، چلو، اٹھ کھڑے ہو جس چیز کے لئے رسول اللہ نے جان دیدی تم بھی اس پر مر مٹو! حضرت انس نے یہ کہا اور دشمن کے ہجوم میں بے تحاشہ گھس چلے گئے، شہید ہونے کے بعد ان کی نعش کو دیکھا گیا تو جسم پر ستر زخم تھے، ان کی بہن صرف انگلیوں کو دیکھ کر بھائی کو پہچان سکیں[1]

لیکن حضرت عثمان کا سب سے بڑا وصف حیا تھا اور حیا خود صفت انفعال ہے اس بنا پر یہ پہلے طبقہ میں شامل تھے حضرت عثمان اور ان کے ساتھیوں کا یہ فعل ایک سخت دہشت انگیز خبر کا فوری اثر تھا، اس کو میدان جنگ سے فرار نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم "حسنات الابرار سیئات المقربین" کے مطابق قرآن میں اس کو تولی" روگردانی سے تعبیر کیا گیا، مگر ساتھ ہی ان حضرات نے اس پر جب توبہ و استغفار کی تو اسی آیت میں ان کی معافی کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے، ارشاد ہوا:

اِنَّ الذین تولّوا منکم یوم التقی الجمعان انما استزلّھم الشیطٰن ببعض ما کسبوا، ولقد عفا اللہ عنھم، اِنّ اللہ غفورٌ حلیم	جس روز دو لشکر (احد کی جنگ میں) آمنے سامنے تھے اس روز (اے مسلمانو) تم میں سے جن لوگوں نے روگردانی کی تھی تو اس کا سبب بجز اس کے کچھ اور نہ تھا کہ ان کے بعض اپنے کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو ڈگمگا دیا تھا، بہرحال اب اللہ نے ان کو معاف کر دیا ہے، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا اور بردبار ہے۔"
(آل عمران)	

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ جن لوگوں کا اس آیت میں ذکر ہے اور جو تولی کے جرم

---

[1] سیرت ابن ہشام ق ۲ ص ۸۳

کے مرتکب بتائے گئے ہیں وہ کئی قسم کے لوگ تھے، بعض مدینہ پہونچ گئے تھے، اور بعض ادھر اُدھر ہو گئے، اور بعض کہیں نہیں گئے، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر شہادت سن کر ایسے بادل ہوئے کہ ہتھیار اتار کر بیٹھ گئے، حضرت عمر اسی آخری طبقے میں تھے، حضرت عثمان دو انصاریوں کے ساتھ کہیں دور چلے گئے اور تین دن کے بعد لوٹے جب واپس آئے تو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

لقد ذهبتم فيها عريضة [۱] تم اس وادی میں دور چلے گئے تھے؟

حضرت عثمان کو خود اپنی اس حرکت پر افسوس تھا جو ان سے محض اضطراری طور پر صادر ہوئی تھی، لیکن مندرجہ بالا آیت نے معاملہ صاف کر دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر بھی اس کی وجہ سے ناگواری کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ چنانچہ ایک مرتبہ گھر میں کہیں ذکر آیا اور حضرت فاطمہ نے فرمایا: "اس دن عثمان کو بھلا کیا ہو گیا تھا!" اس کے جواب میں حضرت علی نے کوئی ایسی بات کہی جس سے حضرت عثمان کی تنقیص کا کوئی پہلو نکلتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو حضرت علی کو تنبیہ کی اور فرمایا: علی! تم اور عثمان دونوں باہم ہم زلف اور میرے خاص آدمی ہو، اس لئے تم کو آپس میں محبت سے رہنا چاہیئے۔ [۲]

صلح حدیبیہ کی مہم میں شرکت

صلح حدیبیہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت اہم موڑ ہے کیوں کہ اس کے بعد سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی رفتار بہت تیز ہو گئی، خود کفار مکہ کو اب موقع ملا کہ وہ مدینہ آکر مسلمانوں کی دینی، اخلاقی اور عملی زندگی کو قریب سے دیکھیں اور متاثر ہوں، یہی سبب ہے کہ قرآن میں اس صلح کو "فتح مبین" [۳] فرمایا گیا ہے۔ حضرت عثمان اس میں بھی شریک تھے بلکہ ان کو اس موقع پر

---

[۱] التفسیر الکبیر امام فخر الدین رازی طہران اڈیشن ج ۹ ص ۵۰۔ [۲] ایضاً

[۳] انا فتحنا لك فتحا مبينا سورة الفتح

ان کو جو شرفِ خاص حاصل ہوا وہ ان کے صحیفہ عظمت و منقبت کا ایک نہایت روشن باب ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب دیکھا تھا کہ آپ مکہ میں داخل ہوئے ہیں اور طواف کر رہے ہیں، آپ نے صحابہ سے اس کا ذکر کیا تو چونکہ نبی کا خواب جھوٹا نہیں ہوتا اس لیے سب میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، چنانچہ جب ماہ ذی القعدہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کی نیت سے مدینہ سے نکلے تو ڈیڑھ ہزار صحابہ کا جم غفیر آپ کا ہمرکاب تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قربانی ساتھ لے لی تھی، تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ مقصد سفر صرف عمرہ کی ادائیگی ہے، جنگ میں ملوث ہونا نہیں ہے، ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنی خزاعہ کے ایک شخص کو جاسوس بنا کر روانہ کیا کہ وہ آگے چل کر قریش کے حالات اور ان کے عزائم سے مطلع کرے، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جان نثاروں کے قافلہ کے ساتھ مقام عسفان [1] کے قریب پہونچے تو جاسوس نے آکر بتایا کہ قریش نے متفرق قبیلوں کے لوگ بڑے پیمانہ پر جمع کر رکھے ہیں، وہ لازمی طور پر مزاحمت کریں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، آپ نے سفر جاری رکھا، جب حدیبیہ آیا تو آپ نے یہاں پڑاؤ ڈالا اور قریش سے مصالحت کی گفتگو کا ارادہ فرمایا، اس مقصد کے لیے آپ نے پہلے حضرت عمر کو بھیجنا چاہا تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! اب مکہ میں میرے قبیلہ بنی عدی کا کوئی نہیں ہے کہ اگر وہاں ضرورت پڑے تو میری مدد کر سکے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ عثمان کو بھیجیے کیوں کہ مکہ میں ان کے قبیلہ کے لوگ موجود ہیں، اور پھر وہ آپ کی صحیح ترجمانی بھی کر سکیں گے۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کو بلا کر حکم دیا کہ مکہ جا کر قریش سے صاف صاف کہہ دیں کہ ہم تو صرف عمرہ کے ارادہ سے

---

[1] مکہ اور مدینہ کی ایک درمیانی منزل کا نام ہے

آئے ہیں، جنگ ہمارا مقصد نہیں ہے، ساتھ ہی فرمایا کہ مکہ میں جو مومن مرد اور خواتین ہیں ان سے بھی ملنا اور ان کو بتادینا کہ اللہ تعالٰے اعنقریب اپنے دین کو مکہ میں بھی غالب کرنے والا ہے، وہ گھبرائیں نہیں، اطمینان رکھیں [1] حضرت عثمان مکہ آئے اور یہاں ابوسفیان اور دوسرے سرداران قریش سے ملاقات کر کے ان کو پیغام نبوی پہونچادیا۔ قریش کے ہاں حضرت عثمان کا بڑا مرتبہ اور وقار تھا۔ انہوں نے پیش کش کی کہ اگر آپ طواف کعبہ کرنا چاہتے ہیں تو کیجئے، لیکن حضرت عثمان نے انکار کر دیا، بعد میں لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا: رسول اللہ حدیبیہ میں فروکش ہوں اور میں یہاں طواف کروں! یہ کیونکر ممکن ہے" اگر اس حالت میں میں سال بھر بھی مکہ میں قیام کروں، جب تک رسول اللہ پہلے طواف نہیں کریں گے میں طواف نہیں کروں گا[2]

بیعت رضوان

بہرحال مکہ سے واپسی میں حضرت عثمان کو تاخیر ہوئی، یہاں یہ خبر عام ہوگئی کہ وہ شہید کردیے گئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقام کے لیے فوراً جنگ کی تیاری شروع کردی اور اس مقصد کے لیے آپ نے جنگ سے فرار نہ کرنے پر بیعت لینے کا اعلان عام فرمادیا، چونکہ یہ بیعت ایک درخت کے زیر سایہ لی گئی تھی اس لیے قرآن مجید میں اس درخت کا خاص طور سے ذکر ہے، ارشاد ہوا:

ولقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ، فعلم ما فی قلوبہم، فانزل السکینۃ علیہم واثابہم فتحا قریبا	بیشک اللہ مومنوں سے اس وقت راضی ہوگیا جب کہ (اے محمد) یہ سب آپ سے ایک درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اور جو کچھ اس وقت تمہارے دلوں میں تھا اللہ کو اس کا علم تھا[3] پھر اللہ نے تم کو سکون قلب عطا فرمایا اور ایک فتح عاجل تک تم کو پہونچا دیا
(سورۃ الفتح)	

[1] زاد المعاد: ابن قیم ج ۱ ص ۳۸۱۳ [2] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۰۱ - ۲۰۲

[3] یہ غالباً اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تمام صحابہ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھے (بقیہ حاشیہ ص ۱۳

کسی کو عذر ہی کیا ہوسکتا تھا، ایک دو منافقوں کو چھوڑ کر سب نے بیعت کی حضرت عثمان وہاں موجود نہیں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک دوسرے دستِ مبارک پر رکھا اور فرمایا، یہ ایک ہاتھ عثمان کا ہے، میں ان کی طرف سے خود بیعت لیتا ہوں[1] بیعت ہوچکی تھی کہ اس کے بعد حضرت عثمان پہونچ گئے، اور قریش کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کے نتیجہ میں حدیبیہ کا صلح نامہ مرتب ہوا، اس کی تمام تفصیلات سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان کا مطالعہ وہاں کرنا چاہیئے، یہاں حضرت عثمان کی مناسبت سے یہ دیکھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے پاس اپنی سفارت کے لیئے حضرت عثمان کو منتخب فرمایا۔ یہ بذاتِ خود حضرت عثمان کی فضیلت اور ان پر مکمل اعتماد نبوی کی دلیل ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ جب ان کے شہید ہوجانے کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ کو پہونچی تو آپ نے فوراً ان کا انتقام لینے کے لیئے تیاری شروع کردی، پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک کو حضرت عثمان کا ہاتھ قرار دیا اور اس طرح خود ان کی طرف سے اپنے سے بیعت لی، اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ یہ اتنا بڑا شرف اور امتیاز ہے کہ اس میں کوئی اور شخص ذوالنورین کا شریک نہیں۔

لیکن طبیعت چوں کہ نکتہ چین وعیب جو ہوتی ہے تو اسے محاسن بھی عیوب کی شکل میں نظر آتے ہیں، جیسا کہ عربی کا مشہور شعر ہے۔

بقیہ حاشیہ:- اور نہتے تھے، اس بنا پر ان کو خیال پیدا ہوا ہوگا کہ اگر جنگ اس وقت چھڑ گئی تو بغیر ہتھیاروں کے اور احرام کی حالت میں وہ کس طرح لڑ سکیں گے، لیکن ان کو سکون قلب اس سے حاصل ہوا کہ جو کچھ بھی ہو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیعت لے رہے ہیں تو یقیناً اس میں بھلائی ہوگی اور ان کو شر نہیں پہونچے گا۔

[1] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۰۲، و زاد المعاد ج ۱ ص ۲۸۲۔ اس کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے جیسا کہ ابھی بیان ہوگا۔

وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ

کما ان عین السخط تبدی المساویا

ترجمہ :۔ دوستی کی آنکھ کوئی ایک عیب بھی نہیں دیکھتی، وہ اس سے عاجز ہوتی ہے جس طرح ناراضگی کی آنکھ برائیوں کو ہی ظاہر کرتی ہے۔

چنانچہ صحیح بخاریؒ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس ایک شخص آیا اور اس سے یہ مکالمہ ہوا۔

س : کیا عثمان غزوۂ بدر میں نہیں شریک ہوئے ؟

ج : نہیں ہوئے

س : کیا عثمان غزوۂ احد میں فرار اختیار کر گئے تھے ؟

ج : ہاں !

س : کیا عثمان بیعتِ رضوان میں شریک نہیں تھے ؟

ج : ہاں ! شریک نہیں تھے۔

جب یہ شخص اپنے تینوں سوالات ختم کر چکا تو اب حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا۔ لو اب ہر معاملہ کی حقیقت سنو! غزوۂ بدر میں عثمان اس لیئے شریک نہیں ہوئے کہ اس موقع پر ان کی اہلیہ سخت علیل تھیں، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم دیا کہ وہ مدینہ سے باہر نہ جائیں اور بیوی کی تیمارداری کریں، غزوۂ احد میں بیشک انھوں نے میدان جنگ چھوڑ دیا تھا، لیکن وہ بعد میں خود اس پر نادم و شرمسار ہوئے اور توبہ واستغفار کی، اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی اور ان کو معاف کر دیا، اس کے

لہ کتاب المغازی، غزوۂ احد، صحیح بخاری کے علاوہ انھیں الفاظ کے ساتھ یہ واقعہ سنن ترمذی باب مناقب عثمان بن عفان، سیرت ابن ہشام، زاد المعاد اور طبقات ابن سعد میں بھی ہے۔

بعد حضرت عبداللہ بن عمر نے قرآن مجید سورۂ آل عمران کی مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی[1]
اب رہی بیعت رضوان کے وقت غیر حاضری! تواس کا سبب یہ ہے کہ عثمان اس وقت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے مکہ میں تھے، قریش نے ان کو روک لیا تھا، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیعت لی تو خود اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ کر عثمان کی طرف سے بھی بیعت لی تھی،

غزوۂ ذات الرقاع

غزوۂ احد کے بعد یہودی قبائل میں سے بنو قینقاع اور بنو نضیر کی جو جلاوطنی ہوئی تواس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش مکہ اور یہود دونوں کی متفقہ ریشہ دوانیوں نے مکہ سے مدینہ تک تمام قبائل میں آگ لگا دی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے خبر نہیں تھے، جاسوسوں اور پرچہ نویسوں کے ذریعہ منٹ منٹ کی خبر رکھتے تھے چنانچہ آپ کو اطلاع پہونچی کہ انمار اور ثعلبہ کے قبیلے مدینے پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر رہے ہیں، یہ معلوم ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چار سو اور بعض روایات کے مطابق سات سو صحابہ کرام کو ساتھ لے کر مدینے سے روانہ ہوئے اور ایک مقام ذات الرقاع تک تشریف لے گئے، لیکن یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر سن کر پہاڑیوں پر بھاگ گئے اور نوبت جنگ نہیں آئی، بہرحال یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ روانگی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کا انچارج حضرت عثمان کو بنایا تھا[2]

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۴۷، ابن ہشام ج ۳ ص ۱۱۹) اور حافظ ابن قیم (زاد المعاد ج ۲ ص ۱۱۰) نے حضرت ابوذر غفاری کا نام لکھ کر "قیل" سے حضرت عثمان کا بھی نام لکھا ہے لیکن ابن اثیر کے یہاں صرف ایک حضرت عثمان کا نام ہے، پھر ذات الرقاع کے سنہ میں بھی اختلاف ہے کوئی خندق سے پہلے مانتا ہے اور کوئی اس کے بعد، اور بعض حضرات اسے خیبر کے بھی بعد بتاتے ہیں، اس شدید اختلاف کے باعث بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ غزوہ دو مرتبہ ہوا ہے: دیکھئے زاد المعاد حوالۂ مذکورہ بالا

دشمن اگرچہ پہاڑی پر چڑھ گیا تھا لیکن منصوبہ یہ تھا کہ چونکہ نماز میں مسلمانوں کو بڑی محویت ہو اور استغراق ہوتا ہے اس لیے جب مسلمان نماز میں مشغول ہوں ان پر عقب سے یکلخت شدید حملہ کر دیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہو گئی تو آپ نے حکم دیا کہ صلوٰۃ الخوف پڑھی جائے، چنانچہ پڑھی گئی، بہر حال اس امر میں اختلاف ہے کہ صلوٰۃ الخوف کا حکم غزوہ ذات الرقاع میں نازل ہوا ہے یا اس سے پہلے غسفان میں نازل ہو چکا تھا، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس پر مفصل بحث کی ہے، اس کو وہاں اور دوسری کتب حدیث و فقہ میں دیکھنا چاہیے۔

غزوۂ تبوک اور جیش العسرۃ

رجب ۹ھ

حضرت عثمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ درجہ کی مشاورتی کونسل کے رکن رکین تھے، اس بنا پر کوئی غزوہ ہو یا کوئی اور اہم معاملہ وہ اس میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ محدثین یا مورخین نے غزوات کے سلسلے میں ان کا ذکر انہیں جگہوں پر کیا ہے جہاں انھوں نے کوئی خاص اور نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے ورنہ نفس شرکت تو پہلے سے معہود فی الذہن تھی ہی، غزوۂ تبوک بھی انہیں خاص مقامات میں سے ہے۔

تبوک ایلہ سے جنوب مشرقی سمت میں مدینہ اور دمشق کے درمیان نصف راستہ پر ہے، معجم البلدان میں یاقوت حموی نے بیان کیا ہے کہ اصحاب الایکہ جن کی طرف حضرت شعیب مبعوث کئے گئے تھے، یہیں آباد تھے، بہرحال آج کل تبوک حکومت سعودیہ میں شامل اور مدینہ منورہ سے سات سو کلومیٹر کی مسافت

پر ہے، اس غزوہ کا داعیہ یہ ہوا کہ عرب میں اسلام جو ایک عظیم الشان طاقت بنتا جا رہا تھا
اس سے خوف وہراس دونوں عظیم الشان پڑوسی ساسانی اور رومی حکومتوں میں
پیدا ہوتا جا رہا تھا، رومی سلطنت نسبتاً زیادہ قریب تھی، پھر شھ میں غزوۂ موتہ
پیش آہی چکا تھا جو شہنشاہیت کے لیئے ایک خطرہ کی گھنٹی سے کم نہیں تھا۔ اس بنا
پر رومی سلطنت نے عرب پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر لیا۔ غسانی خاندان جو رومی
شہنشاہیت کا ہم مذہب اور اس کا باج گزار تھا۔ اس نے قیصر روم کی تحریک پر عرب
پر پیش قدمی کرنے کی تیاری شروع کر دی، مدینہ میں عام طور پر اس کا چرچا تھا، چنانچہ
واقعہ ایلا میں جب عتبان بن مالک نے حضرت عمر سے اچانک یہ کہا کہ "غضب ہو گیا"
توانہوں نے کہا: خیر تو ہے، کیا غسانی چڑھ آئے؟" [۱] علاوہ ازیں شام کے بعض
سوداگر روغن زیتون کی تجارت کرنے مدینے آتے تھے، انھوں نے بھی خبر دی کہ
رومیوں نے شام میں ایک بڑا لشکر جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں بھی
پیشگی دے دی گئی ہیں، اس فوج میں لخم، جذام اور غسان کے تمام عرب قبائل شامل
ہیں اور ان کا ہراول دستہ مقام بلقاء تک آبھی گیا ہے [۲]

یہ خبریں مدینے میں عام تھیں اور بظاہر ان کے غلط ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں
تھی، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کشی کا ارادہ فرما لیا اور صحابۂ کرام کو
تیار ہو جانے کا حکم دیا۔ اور چونکہ عرب کو رومیوں کے خطرہ سے محفوظ کرنا مقصد تھا
اس بنا پر آپ نے دوسرے عرب قبایل کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی، اس طرح
کم وبیش تیس ہزار کا لشکر جرار جمع ہو گیا۔

---

[۱] بخاری ذکر واقعۂ کربلا

[۲] الزرقانی علی المواہب ج ۳۔ ص۔ ۶۳ و ۶۴

لیکن مشکل یہ ہے کہ سخت گرمی کا موسم تھا اور پھر قحط سالی کے باعث عام طور پر تنگ دستی کا زمانہ تھا۔ اسی وجہ سے اس لشکر کو جیش العسرۃ کہا گیا ہے، قرآن مجید میں ان دونوں چیزوں کا ذکر ہے، سورہ براۃ میں منافقوں کے بارے میں فرمایا گیا:

"وقالوا: لا تنفروا فی الحر — یہ لوگ کہتے تھے: سخت گرمی میں نہ نکلو۔

عسرت اور تنگ دستی کے سلسلے میں فرمایا گیا۔

ولا علی الذین اذا ما اتوک لتحملھم قلت لا اجد ما احملکم علیه تولوا و اعینھم تفیض من الدمع حزنا الا یجدوا ما ینفقون ○	اور ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں جو آپ کے پاس جب اس لیے آتے ہیں کہ آپ ان کے واسطے سواری کا انتظام کردیں تو آپ کہتے ہیں کہ میرے پاس تو تمہارے لئے سواری کا کوئی بندوبست نہیں ہے اس پر یہ لوگ لوٹ جاتے ہیں اس حالت میں کہ ان کی آنکھیں تنگ دستی کے غم میں اشک بار ہوتی ہیں۔

پھر سفر بھی کہیں آس پاس کا نہیں، بہت دور دراز کا، اور مقابلہ اس سے جو اس عہد کی سب سے زیادہ طاقتور اور متمدن قوم تھی چنانچہ جیسا کہ واقدی نے منازی میں نقل کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اکابر صحابہ سے مشورہ کیا تو حضرت عمر جیسے جری اور بہادر شخص کی ذاتی رائے اس غزوہ کے حق میں نہیں تھی۔ ان سب مشکلات اور دقتوں کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہم کو سر کر لینے کا عزم فرما لیا! یہ خود اس اعتماد تام کی دلیل ہے جو بحیثیت پیغمبر ہونے کے آپ کو خالق کائنات پر تھا اور جس کا مظاہرہ ہر غزوہ میں اب تک برابر ہوتا چلا آرہا تھا۔

اب آپ نے لشکر کی تجہیز جیش (لشکر کی مالی امداد) کے لیے صحابہ میں جو باحیثیت تھے اور خوش حال تھے ان سے اپیل کی تو جس کے مقدرت میں جو کچھ تھا وہ لاکر خدمت نبوی میں پیش کردیا۔ جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ خواتین تک مردوں کی حریف بنی ہوئی تھیں

حضرت ام سنان الاسلمیہ کا بیان ہے: میں انہیں دنوں میں حضرت عائشہ کے گھر گئی تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک کپڑا پھیلا ہوا ہے اور اس میں عورتوں کے زیورات: کنگن، بازو بند، پازیب، کان کی بالیاں اور انگشتریاں بکھرے پڑے ہیں، یہ وہ زیورات تھے جو خواتین نے مجاہدین اسلام کی امداد کے لئے نذر کئے تھے۔ [1]

حضرت عثمان کا حصہ صحابہ میں حضرت عثمان غنی سب سے زیادہ دولت مند تھے، اس لئے اس کار خیر میں سب سے بڑا حصہ انھیں کا تھا، لیکن وہ کیا تھا؟ اس میں روایات حد درجہ مختلف ہیں، ان روایات کا ماحصل علی الترتیب یہ ہے۔

(۱) دو سو اوقیہ چاندی اور دو سو اونٹ [2]

(۲) ستر ہزار درہم [3]

(۳) ایک ہزار اونٹ، ستر ہزار گھوڑے اور ایک ہزار دینار نقد [4]

(۴) سات سو اوقیہ سونا [5]

حافظ ابن حجر نے مذکورہ بالا روایات کو یکجا کر کے صحت وضعف کے اعتبار سے ان

---

[1] مغازی رسول اللہ واقدی ج ۲ ص ۹۹۱-۹۹۲،

[2] زرقانی ج ۳ ص ۶۷، مولانا شبلی نے سیرت النبی ج ۱ ص ۵۶۴ پر اسی کو اختیار کیا ہے۔ ایک اوقیہ ایک اونس کے برابر ہوتا ہے۔

[3] انساب الاشراف بلاذری ج ۱ ص ۳۶۸

[4] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۰۲ [5] مسند ابو یعلی

[6] فتح الباری ج ۷ ص ۴۳، باب اذا وقف ارضاً او بئراً

کا مرتبہ و مقام بھی بتایا ہے، ساتھ ہی انھوں نے ایک روایت دس ہزار دینار کی نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ دینار نہیں درہم ہوگا۔ اگر اسے مان لیا جائے تو ایک ہزار دینار والی روایت کے ساتھ اس کی مطابقت ہو جاتی ہے، کیوں کہ ایک دینار کم و بیش دس درہم کا ہوتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حضرت عثمان نے جو کچھ دیا ہے وہ یک مشت اور بیک وقت نہیں دیا۔ بلکہ جیسی جیسی ضرورت ہوتی رہی ہے وہ اپنی پیش کش میں اضافہ کرتے رہے ہیں، ہمارے اس قیاس کی تائید ترمذی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجہیز جیش کی پر زور ترغیب دی تو حضرت عثمان نے ایک سو اونٹ پیش کئے، اس کے بعد حضور نے پھر اپیل کی تو حضرت عثمان نے ایک سو اونٹوں کا اور اضافہ کر دیا۔ حضور نے تیسری مرتبہ پھر اپیل کی تو حضرت عثمان نے سو اونٹ اور بڑھا دیئے[۱]۔ اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان نے جو کچھ دیا ہے تدریج دیا ہے۔

اب یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس بارہ میں خود حضرت عثمان کا بیان ہے؟ اس سلسلے میں صحیح بخاری میں حضرت عثمان کے الفاظ صرف یہ ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من جهز جيش العسرة فله الجنة — جو شخص تجہیز جیش عسرہ کرے گا اس کو جنت ملے گی،

فجهزته: — تو میں نے جیش عسرہ کی تجہیز کی۔

لیکن امام نسائی نے اسی روایت میں حضرت عثمان کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں

۱؎ ترمذی ج ۲ باب مناقب عثمان

۲؎ باب اذا وقف ارضاً او بیرا

فجھز تھم حتی لم یفقدوا — میں نے جیش عسرہ کی تجہیز ایسے مکمل طریقہ پر کی کہ
اعقالا ولا خطاما : — اونٹ کی ایک رسی اور نکیل کی بھی کمی نہیں رہی۔

اب اگر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جائے، کہ اونٹوں، گھوڑوں اور ان کے ساز و سامان کے علاوہ حضرت عثمان نے نقد رقم کی جو تھیلی پیش کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرطِ مسرت سے اسے دستِ مبارک میں لے کر اچھالتے اور فرماتے تھے۔

ماعلی عثمان من عمل بعد الیوم [۱] — اب آج کے بعد عثمان پر کوئی اور عمل لازم نہیں ہوگا

تو صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس موقع پر حضرت عثمان [۱] نے جو کچھ پیش کیا اگرچہ قطعی طور پر اس کا تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ بہت بڑی پیش کش تھی اور اس نے غزوۂ تبوک کی فوج جس میں ابن سعد کی روایت کے مطابق تیس ہزار پیادے اور دس ہزار سوار شامل تھے اس کی ضرورتوں کو ایک بڑی حد تک پورا کیا چنانچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان نے ایک تہائی ⅓ فوج کی تجہیز کی تھی، اور ابن ہشام کے بقول یہ اتنی بڑی امداد تھی جو کسی نے نہیں کی۔

فوج کے لئے سامان رسد کی فراہمی

پھر یہ امداد وہ تھی جو تجہیز جیش کے لیے کی گئی تھی اس کے علاوہ جو امداد سامان رسد کے لئے دی گئی وہ اس پر مستزاد ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ حضرت عثمان کو اطلاع پہنچی کہ سامان میں خورد و نوش کی کمی ہو گئی ہے تو آپ نے کئی اونٹوں پر کھانے پینے کا سامان لادا اور قافلہ کی شکل میں ان کو روانہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دور سے قافلہ کی سیاہی اسی طرف آتی ہوئی نظر آئی تو اندازہ سے فرمایا: "لو اے مسلمانو! سرخ اونٹ تمہارے لئے سامان رسد لا رہے ہیں: اتنے میں اونٹوں کا یہ قافلہ پہنچ گیا۔ جب اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] ترمذی باب مناقب عثمان و مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۰۲

کے سامنے بٹھائے گئے ہیں تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے دعا کی کہ اے اللہ! میں عثمان سے خوش ہوں تو بھی اس سے راضی رہ۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ غزوہ کے لیے مدینہ سے باہر تشریف لیجاتے تھے تو کسی کو مدینے کا انچارج اور نگراں بناجاتے تھے۔ اس مرتبہ یہ شرف حضرت محمد بن مسلمۃ الانصاری کو عطا ہوا۔ اور ساتھ حضرت علی کو حرم محترم نبوی کی حفاظت ونگرانی سپرد ہوئی حضرت علی کو غزوہ میں عدم شرکت کے باعث منافقوں کی یاوہ گوئی کی شکایت ہوئی تو آپ نے فرمایا

---

[1] العقد الفرید ابن عبدربہ جلد ۴ ص ۲۸؛ ممکن ہے کسی صاحب کو یہ خیال ہو کہ یہ واقعہ الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ پہلے واقعہ تجہیز جیش کا ہی جزء ہے، تو عرض یہ ہے کہ ہمارے نزدیک یہ دونوں دو مستقل واقعات ہیں اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ

(۱) پہلے واقعہ میں حضرت عثمان کا قول گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کی روانگی سے قبل اس کی تجہیز کی ترغیب دی تو میں نے اس کی تجہیز کی "فجھزتہ" لیکن واقعہ زیر بحث میں حضرت عبداللہ بن عمر کے الفاظ یہ ہیں۔

اصاب الناس مجاعۃ فی غزوۃ	غزوۂ تبوک میں لوگوں کو شکم سیر نہ ہونے کی شکایت
تبوک فاشتری عثمان طعاما	ہوگئی تو حضرت عثمان نے اتنی خوردنی خریدا کہ وہ
علی مایصلح العسکر	پورے لشکر کو کافی ہوجائے۔

الفاظ کے درویست سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ دوران غزوہ کا ہے۔

(۲) اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کے لیے بارگاہ ایزدی میں دعا مانگی ہے اور پہلے واقعہ میں ان کو خوش خبری دی ہے کہ اب تجہیز کے بعد انہیں کسی بڑے عمل کی ضرورت نہیں ہے

(۳) پہلے واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اونٹوں کا قافلہ دور سے آتا ہوا نظر نہیں آیا تھا اور یہاں آپ کو یہ قافلہ دور سے سیاہی کی شکل میں نظر آتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ جنگ کا موقع ہے

کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو میرے ساتھ وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ تھی مگر ہاں! میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ ۱؎

بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیس ہزار کا لشکر جرار لے کر تبوک پہونچے، معلوم ہوا کہ خبر صحیح نہیں تھی، اسی لیے جنگ کے بغیر واپسی ہوگئی، لیکن اس سے دو فائدے ہوئے ایک یہ کہ قیصر روم کے دل پر اسلامی شوکت وسطوت کی دھاک بیٹھ گئی اور اس سے خلافت صدیقی و فاروقی میں فتوحاتِ شام کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ تبوک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام تقریباً دو ہفتے رہا۔ اسی درمیان میں ایلہ (خلیج عقبہ کے پاس ایک مقام کا نام) کا سردار یوحنا بن روبہ جو عیسائی تھا خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ ایک خچر نذر کیا اور جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کا خواہاں ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منظور فرمالیا اور اسے اپنی ردائے مبارک عطا فرمائی، اسی طرح مقام جرباء اور اذرح کے عیسائی حاضر خدمت ہوئے۔ آپ نے ان کو بھی پروانۂ امن عنایت فرمایا۔ دومۃ الجندل جو دمشق سے پانچ منزل کی مسافت پر ہے، اس کا سردار "اکیدر بن عبدالملک الکندی" مذہباً عیسائی اور قیصر روم کے زیر اثر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ سو آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ حضرت خالد بن ولید کو اس کے پاس بھیجا۔ حضرت خالد نے اسے گرفتار کر کے خدمتِ نبوی میں بھیج دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بخشی کر کے جزیہ ادا کرنے پر اس سے صلح کر لی۔ ۲؎ ان دو فائدوں کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

۱؎ صحیح بخاری باب غزوہ تبوک و سیرتِ ابن ہشام ج ۴ ص ۱۲۱

۲؎ ابن ہشام ج ۴ ص ۱۲۶، ابن ہشام میں ہی ہے کہ والی دومۃ الجندل خدمتِ نبوی میں اس شان سے آیا کہ دیبا کی قبا جس پر زرکاری کا کام ہو رہا تھا زیب تن کئے ہوئے تھا صحابہ اس قبا کو ہاتھ سے مس کرتے اور تعجب کا اظہار کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو فرمایا: تم اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہو حالانکہ جنت میں سعد بن معاذ کے رومال اس قبا سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔

اس اقدام سے ایک یہ اہم سیاسی سبق بھی ملتا ہے کہ جب ملک میں دشمن کے متعلق اس طرح کی خبریں پھیلی ہوئی ہوں تو لیڈر کا فرض ہے کہ وہ قوم کو قیاس آرائی اور زیادہ سوچ وچار کا موقع نہ دے، بلکہ کوئی فوری اقدام کر کے معاملہ یکسو کر دے۔[1]

---

[1] یہ غزوہ کب ہوا؟ تمام محدثین اور ارباب سیر اس پر متفق ہیں کہ ماہ رجب ۹ھ میں ہوا لیکن مولانا شبلی نعمانی اس کی تطبیق نومبر ۶۳۵ء سے کی ہے، اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ نومبر کا مہینہ مدینہ میں سردی کے آغاز کا ہوتا ہے اور قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ غزوہ کے ان دنوں میں سخت گرمی ہو رہی تھی، پھر یہ مہینہ نومبر کا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک زمانہ میں مولوی اسحاق النبی علوی رامپوری نے "برہان" دہلی میں تقویم ہجری اور تقویم شمسی کی تطبیق پر ایک فاضلانہ مقالہ مسلسل کئی قسطوں میں لکھا تھا، اس میں انھوں نے ۹ھ کے ماہ رجب کی تطبیق اپریل کے مہینہ سے کی ہے، ہمارے خیال میں اگر تطبیق درست ہے تو یہ اقرب الی الصواب ہے، کیوں کہ اپریل میں وہاں گرمی ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

حضرت عثمان شیخین کے عہد میں

حضرت عثمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر خاص اور معتمد الیہ تھے، ان کی یہ حیثیت حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں بھی قائم رہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں حکومت و ریاست کے تمام شعبے یعنی انتظام و حکمرانی، عدلیہ و قیادت حرب سب بیک وقت جمع تھے تو صحابہ کرام میں بھی عہدوں کی تقسیم الگ الگ نہیں تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب یہ صورت حال باقی نہیں رہی اور انتظامیہ عدلیہ اور فوج تینوں مستقل بالذات شعبے بن گئے تو اب حضرت ابو بکر نے اور ان کے بعد حضرت عمر نے بھی یہ پالیسی بنائی کہ وہ اکابر صحابہ جو علم و فضل اور فہم و تدبر میں ممتاز تھے ان کو مدینے سے باہر کسی غزوہ میں نہیں جانے دیا گیا، تاکہ ملک و ملت کے اہم مسائل و معاملات میں ان کے مشورہ اور رائے سے فائدہ اٹھایا جا سکے، حضرت ابو بکر صدیق کو اس معاملہ میں اتنا اہتمام تھا کہ اگرچہ حضرت اسامہ کی سرکردگی میں جو لشکر شام کی طرف روانہ ہوا اس میں شمولیت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر کو خود نامزد فرما گئے تھے

لیکن صدیق اکبر نے حضرت اسامہ سے اجازت لے کر ان کو مدینہ میں ہی روک لیا[1]۔ خلافت شیخین میں حضرت عثمان کا شمار بھی ان ارباب حل وعقد صحابہ میں تھا جن کی ہر وقت مدینہ میں موجودگی ضروری سمجھی گئی تھی۔

چنانچہ امرھم شوریٰ بینھم پر عمل پیرا ہونے کے لیے خلیفہ اول نے اکابر مہاجرین و انصار پر مشتمل جو مجلس شوریٰ بنائی تھی، اس کے تمام ارکان ارباب فتویٰ واصحاب رائے تھے، اور حضرت عثمان بھی اسی کے ایک اہم رکن تھے، ابن سعد میں ہے۔

ان ابا بکر الصدیق کان اذا نزل به امر یرید فیه مشاورة اهل الرای واهل الفقه ودعا رجالا من المهاجرین والانصار دعا عمر وعثمان وعلیا وعبد الرحمن بن عوف ومعاذ بن جبل وابی بن کعب وزید بن ثابت وکل هولاء یفتی فی خلافة ابی بکر[2]

حضرت ابو بکر صدیق کو جب کوئی امر درپیش ہوتا تھا تو وہ ارباب رائے واصحاب فقہ سے مشورہ کرتے تھے اور مہاجرین وانصار میں سے عمر، عثمان، علی، عبدالرحمٰن بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور زید بن ثابت کو بلاتے تھے، یہ سب حضرات خلافت صدیقی میں ارباب فتویٰ تھے۔

پھر حضرت عثمان کی خصوصیت یہ تھی کہ چونکہ نوشت وخواند کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے اس بنا پر وہ حضرت ابوبکر کے کاتب یعنی میر منشی بھی تھے[3]۔ چنانچہ استخلاف حضرت عمر جس کا ذکر آگے آتا ہے اس کی دستاویز حضرت عثمان نے ہی لکھی تھی۔

حضرت عثمان کی دولت وثروت جس طرح عہد نبوی میں اسلام کے لیے وقف تھی

---

[1] طبقات ابن سعد حصہ مغازی

[2] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۰۹

[3] المحبر لابن حبیب ص ۳۷۷، حضرت زید بن ثابت جو مشہور کاتب وحی ہیں، حضرت عثمان کے ساتھ قلم دان کتابت ان کے پاس بھی تھا۔

عہدِ شیخین میں بھی تھی، چنانچہ ایک مرتبہ خلافت صدیقی میں سخت قحط پڑا اور انہیں دنوں میں حضرت عثمان کا کاروانِ تجارت واپس آیا تو حضرت عثمان نے پورا کارواں ہی غریبوں اور حاجتمندوں کے لیے وقف کر دیا۔[۱]

حضرت عثمان کی رائے بڑی سنجیدہ اور متوازن ہوتی تھی اس بنا پر حضرت ابوبکر صدیق اس کی بڑی قدر کرتے اور اگر وہ کسی معاملہ میں ان کی اپنی ذاتی رائے کے حق میں ہوتی تو اس پر مسرت کا اظہار کرتے تھے، چنانچہ مرض الوفات میں جب حضرت عمر کو اپنا جانشین خلافت نامزد کرنے کا ارادہ کیا اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے حضرت عمر کے بارہ میں ان کی رائے دریافت کی تو انھوں نے جواب دیا "جس چیز کو آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں اس کے متعلق آپ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ صدیق اکبر نے فرمایا: "پھر بھی! آپ کہیئے تو سہی" عبدالرحمٰن بن عوف بولے: "آپ کی عمر کے بارے میں جو رائے ہے وہ اس سے افضل ہیں" اس کے بعد صدیق اکبر نے حضرت عثمان سے ان کی عمر فاروق کی نسبت رائے پوچھی: انھوں نے جواب دیا: "آپ اس معاملہ میں ہم سب سے زیادہ باخبر ہیں" حضرت ابوبکر نے فرمایا: "بایں ہمہ آپ بھی تو فرمائیے" اب حضرت عثمان نے کہا: جہاں تک میں جانتا ہوں ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہتر ہے اور بیشک ہم میں ان کا جواب نہیں ہے[۲] یہ سن کر حضرت ابوبکر خوش ہوئے، حضرت عثمان کو دعا دی اور فرمایا: "اگر آپ عمر کو نظر انداز کر دیتے تو میں اس کی مخالفت نہ کرتا" بعض صحابہ کو حضرت ابوبکر کے اس ارادہ کا علم ہوا تو انھوں نے اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ "عمر کی طبیعت میں جو سختی اور درشتی ہے اس کے علم کے

---

[۱] اسواق العرب فی الجاہلیۃ والاسلام سعید الافغانی ص ۱۴۰

[۲] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۴۱-۱۴۲-وکتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۴ و ۱۵

باوجود آپ ان کو خلیفہ بنا رہے ہیں! تو پھر کل خدا کو کیا جواب دیجیئے گا" یہ سن کر خلیفہ رسول اللہ کو طیش آگیا۔ فرمایا: ذرا مجھ کو بٹھادو" جب بیٹھ گئے تو گویا ہوئے: "تم مجھ کو خدا سے ڈراتے ہو! اے اللہ! تو گواہ رہ کہ میں تیرے بہترین بندہ کو ان لوگوں پر خلیفہ بنا رہا ہوں لہ

خلیفۂ اول یہ کہہ کر پھر لیٹ گئے، اور حضرت عثمان کو بلا کر جانشینی کا پروانہ لکھانا شروع کرادیا، ابھی جانشین کا نام نہیں لکھوایا تھا کہ غشی طاری ہوگئی۔ حضرت عثمان نے از خود حضرت حضرت عمر کا نام لکھ کر اس جگہ کو پر کرکے مسودہ کی تکمیل کردی، صدیق اکبر نے جب ہوش میں آکر مسودہ پڑھ کر سنانے کی فرمائش کی اور خلیفہ دوم کے لیے حضرت عمر کا نام سنا تو بے ساختہ اللہ اکبر کہا اور حضرت عثمان سے مخاطب ہوکر فرمایا: "تم کو غالباً اندیشہ یہ ہوا کہ اگر اسی غشی میں میرا انتقال ہوگیا اور مسودہ میں خلیفہ دوم کے نام کی جگہ خالی رہ گئی تو لوگوں میں اختلاف پیدا ہوگا، جزاک اللہ عن الاسلام واھلہ خیرا۔ اس کے بعد اس پروانہ کو سربمہر کردیا گیا۔

اب اس پروانۂ استخلاف کے اعلان کا مرحلہ تھا۔ اس کے لیے بھی حضرت ابوبکر نے حضرت عثمان کو منتخب فرمایا، انھوں نے مجمع عام میں اسے پڑھ کر سنایا تو سب نے آمنا وصدقنا کہا، اب خلیفۂ رسول نے اپنے جانشین کو بلا کر کچھ وصیتیں فرمائیں ٢ہ

یوں بھی حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان میں ذاتی طور پر بہت گہرا تعلق اور ربط و ضبط تھا۔ دونوں کے مکان بھی آس پاس تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ مرض الوفات میں میرے والد کی جو تیمارداری عثمان نے کی ہے، وہ کسی نے نہیں کی ٣ہ

لہ ایضاً

٢ہ ایضاً

٣ہ ایضاً صفحہ ۱۴۳

خلافت فاروقی میں

جیسا کہ عرض کیا گیا۔ اکابر صحابہ کو مدینہ میں رکھنے کی جو پالیسی حضرت ابوبکر کی تھی وہی ان کے جانشین حضرت عمر کی بھی بھی تھی۔ ابن سعد میں ہے۔

وکان یستعمل رجلا من اصحاب رسول اللہ علیہ السلام مثل عمرو بن العاص ومعاویۃ بن ابی سفیان والمغیرۃ بن شعبۃ ویدع من ھم مثل عثمان وعلی طلحۃ والزبیر وعبد الرحمٰن بن عوف ونظرائھم لقوۃ اولئک علی العمل والبصر بہ ولاشراف عمر علیھم وھیبتھم لہ، وقیل لہ: مالک لا تولی الاکابر من اصحاب رسول اللہ علیہ السلام۔ فقال: اکرہ ان ادنسھم بالعمل: ؎

حضرت عمر کا معمول تھا کہ صحابۂ کرام میں سے عمرو بن العاص، معاویہ بن ابی سفیان اور مغیرہ بن شعبہ جیسے حضرات کو گورنر بناتے اور جو صحابہ ان حضرات سے افضل تھے مثلاً عثمان، علی، طلحہ، زبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف اور ان جیسے ان کو گورنر نہیں بناتے تھے، کیونکہ وہ ان حضرات کو اس سے بلند و بالا سمجھتے تھے کہ وہ گورنری کے کام انجام دیں اور پھر حضرت عمر ان حضرات کا بڑا لحاظ اور ادب بھی کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا آپ اکابر صحابہ کو والی نہیں بناتے؟ فرمایا: میں اسے پسند نہیں کرتا کہ ان حضرات کا دامان بزرگی گورنری جیسی چیز سے ملوث کروں۔

حضرت عثمان کا نام اس سلسلے میں سرفہرست تھا، اس بناء پر کوئی موقع ہو حضرت عثمان کی معیت اور مشورہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی تھی، چنانچہ خلیفہ رسول اللہ کی وفات کے فوراً بعد حضرت عمر مقام سخ (مدینہ کا ایک محلہ جہاں حضرت ابوبکر نے بیت المال قائم کیا تھا) بیت المال کے معائنہ کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت عثمان اس وقت بھی ہمراہ تھے [۲] خلیفہ

---

[۱] ایضاً ۲۰۳ [۲] ایضاً ص ۱۵۱

ہوجانے کے بعد حضرت عمر کا پورا وقت کاروبار خلافت کے انجام دینے میں لبسر ہوجاتا تھا. مگروہ بیت المال سے اپنی گذر لبسر کے لیئے ایک حبہ بھی نہیں لیتے تھے اور جو اصل ذریعۂ معاش تھا وہ اب نبھ نہیں سکتا تھا، اس صورت حال نے بڑی پیچیدگی پیدا کردی تو حضرت عمر نے خاص خاص احباب سے مشورہ کیا کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے. حضرت عثمان ہمیشہ سے طبیعت کے بڑے فیاض اور کشادہ دل تھے، انھوں نے کہا: کھائیے اور کھلائیے" سعید بن زید بن عمرو بن نفیل نے بھی یہی رائے دی، لیکن حضرت علی نے اپنے مذاق کے مطابق بات کہی، فرمایا" بس دو وقت کا کھانا" یہ رائے حضرت عمر کی افتاد طبع کے مطابق تھی. آپ نے اسی کو قبول فرمالیا. [1]

حضرت عثمان خلیفہ دوم کے جس درجہ کے قدردان اور مداح تھے وہ ظاہر ہے تاہم ان کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ حضرت عمر کی خشونت مزاج اور ان کے رعب داب کے باعث عام ارباب حاجت ان کے پاس آکر اظہار مدعا کرنے میں جھجک محسوس کرتے تھے، اس لیے ایک مرتبہ حضرت عثمان، علی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص رضوان اللہ علیہم اجمعین، یہ سب ایک جگہ مجتمع تھے ان میں عبدالرحمٰن بن عوف، فاروق اعظم سے گفتگو کرنے میں سب سے زیادہ جری تھے، اس لیئے ان سب دوستوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس بارہ میں فاروق اعظم سے گفتگو کریں، انھوں نے تعمیل کی تو فاروق اعظم نے فوراً حضرت عثمان، اور حضرت علی وغیرہما ان سب حضرات کے نام لیئے اور عبدالرحمٰن بن عوف سے بولے سچ بتاؤ، تم کو ان حضرت نے میرے پاس بھیجا ہے؟ انھوں نے اقرار کیا تو اب حضرت عمر نے فرمایا، بخدا عبدالرحمٰن بن عوف! میں نے لوگوں کے لیئے نرمی اختیار کی تو اتنا نرم ہوگیا کہ خدا کا ڈر لگنے لگا، پھر میں نے تشدد اختیار کیا تو اس میں بھی اتنا آگے بڑھ گیا کہ خوف خدا پیدا

---

[1] ایضاً ص ۲۲۱

ہوگیا، تو بتاؤ! اب میں کیا کروں؛ حضرت عبدالرحمن بن عوف پر اس ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ بے اختیار آنکھوں سے جھڑی لگ گئی، اسی حالت میں اپنی چادر کھینچتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوئے اور ہاتھ کے اشارے سے کہتے جاتے تھے: "ہائے اے عمر! تمہارے بعد لوگوں کا کیا حال ہوگا"[1]

حضرت عمر نے حکومت کے شعبوں اور ملکی نظم ونسق میں عظیم الشان ایجادات واصلاحات کی لیکن انھوں نے کوئی قدم مجلس شوریٰ کے مشورے اور اس سے استصواب کے بغیر نہیں اٹھایا۔ اور چونکہ مجلس میں حضرت عثمان کا بڑا وقار واعتبار تھا اس لیے ان کی رائے کو خاص اہمیت دیجاتی تھی، شام اور عراق کی فتوحات کے بعد ایک اہم سوال یہ پیدا ہوا کہ مفتوحہ زمینوں کا کیا کیا جائے؟ اب تک دستور یہ تھا کہ فوج پر تقسیم کردی جاتی تھیں، لیکن فتوحات کی غیر معمولی وسعت اور آئندہ نسلوں کے مفاد کے پیش نظر اب ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس بنا پر حضرت عمر نے مجلس شوریٰ کا جلسہ طلب فرمایا، اس موقع پر حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت بلال اور چند اور ارکان کی رائے تو اب بھی یہی تھی کہ جن بہادروں کی تلواروں نے ان زمینوں کو فتح کیا ہے انھیں کا حق ان پر قبضہ کرنے کا ہے۔ لیکن خود حضرت عمر کی رائے تھی کہ ان زمینوں کو حکومت کی ملک قرار دے کر باشندوں کے قبضہ میں رہنے دیا جائے، حضرت عثمان اور حضرت علی کی رائے بھی یہی تھی، اس لیے اُس پر فیصلہ ہوگیا[2]

اسی طرح مالیاتی انتظامات کے سلسلے میں باقاعدہ دفتر اور رجسٹری قائم کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا تو حضرت عمر نے اس مسئلہ کو بھی مجلس شوریٰ کے سامنے رکھا۔ حضرت علی نے فرمایا: "ایک سال میں جو رقم بھی آپ کے پاس آتی ہے آپ اسے خرچ کردیتے ہیں اور اس میں سے بچا کے کچھ نہیں رکھتے" مطلب یہ تھا کہ پھر رجسٹر وغیرہ کی ضرورت ہی کیا ہے، لیکن

---

[1] الضیاء ص ۲۰۶ - ۲۰۷

[2] کتاب الخراج ص ۱۴ و ۱۵

حضرت عثمان نے اس کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا "میں دیکھتا ہوں دولت اتنی ہو گئی ہے کہ سب لوگوں کو کافی ہو سکتی ہے، لیکن اگر آپ نے مردم شماری کا طریقہ رائج کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ کس کو اس کا حصہ ملا ہے اور کس کو نہیں ملا تو مجھے اندیشہ ہے کہ معاملات خراب نہ ہو جائیں، اس کے بعد ولید بن ہشام بن المغیرہ نے کہا: اے امیر المومنین! میں نے شام (رومن امپائر کے زمانہ میں) میں دیکھا ہے کہ وہاں کے حکام رجسٹر بھی رکھتے ہیں اور لشکریوں کا اندراج بھی کرتے ہیں آپ بھی ایسا ہی کیجئے" ، حضرت عمر نے اس کو پسند فرمایا اور اختیار کر لیا[۱]

حضرت عمر حضرت عثمان کا ان کی بزرگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے قرب و اختصاص کے باعث اس درجہ لحاظ اور ادب کرتے تھے کہ جن امور میں لوگوں کو براہ راست حضرت عمر سے گفتگو کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا ان میں وہ حضرت عثمان کا وسیلہ تلاش کرتے تھے، چنانچہ جب مثنی بن حارثہ الشیبانی نے حضرت عمر کو ایران کے اندرونی انتشار اور اکیس برس کے نوجوان یزدگرد کی تخت نشینی وغیرہ سے مطلع کیا تو آپ نے فوج کو تیار ہو کر مدینہ کے باہر کیمپ لگانے کا حکم صادر فرمایا. فوراً تعمیل حکم کی گئی لیکن کسی کو اس کا علم نہیں تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے اور فوج کو جانا کہاں ہے؟ اور کسی کو یہ جرأت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ حضرت عمر سے اس معاملہ پر براہ راست گفتگو کرے بالآخر لوگوں نے حضرت عثمان کا سہارا لیا، چنانچہ آپ نے پوچھا: امیر المومنین! آپ کو ایسی کونسی خبر پہونچی ہے، اور آپ کا ارادہ کیا ہے، اس پر حضرت عمر نے حسب معمول الصلوٰۃ جامعۃ کا اعلان کرایا اور جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں ایران پر فوج کشی کی دعوت دی۔[۲]

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۱۲

[۲] الفخری لابن الطقطقا ص ۸۷

جنگ نہاوند کے موقع پر مشورہ اسی طرح ۲۱ھ میں جب حضرت عمرؓ کو یہ اطلاع پہونچی کہ یزدگرد کی تحریک و ترغیب پر ادہر اُدہر سے جمع ہو کر ڈیڑھ لاکھ ایرانی فوج مسلمانوں کا دنیا سے نام و نشان مٹا دینے کی غرض نہاوند کی طرف بڑھ رہی ہے تو حضرت عمرؓ نے مجلس شوریٰ کا جلسہ طلب کیا اور جو خبر ان کو پہونچی تھی اس کو بیان کرنے کے بعد فرمایا: حضرات! آج کا دن سب سے زیادہ سخت ہے میں چاہتا ہوں کہ میں خود اپنے مدینہ کے ساتھیوں کو لے کر روانہ ہوں اور کوفہ اور بصرہ (جو اس زمانہ میں فوجی مراکز تھے) کے درمیان پڑاؤ پڑ جاؤں تاکہ نہاوند میں ہم اپنی فوج کی مدد کر سکیں، آپ حضرات کی کیا رائے ہے، مجمع میں سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے) اور بولے "ہم اس کو مناسب نہیں سمجھتے کہ آپ مدینہ سے باہر تشریف لے جائیں" دوسرے اکابر صحابہ حضرت طلحہ، زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت علی نے بھی اس رائے کی تائید کی اور حضرت عمرؓ نے اسے قبول فرما لیا[1]

بہرحال حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق دونوں کے نزدیک حضرت عثمانؓ کا بڑا اونچا مرتبہ، ومقام اور اعتماد و اعتبار تھا، چنانچہ بخاری میں ہے کہ حضرت فاطمہ کی طرح ازواج مطہرات کو بھی اپنی میراث کے لینے کا خیال پیدا ہوا تو انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے پاس اس سلسلے میں گفتگو کرنے کے لیے حضرت عثمانؓ ہی کو منتخب فرمایا[2]۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ازواج مطہرات کو حج کی غرض سے مکہ بھیجا تو ان کے ساتھ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ساتھ حضرت عثمانؓ کو بھی روانہ کیا[3]

---

[1] طبری ج ۴ ص ۱۲۳

[2] کتاب الفرائض، باب قول النبی لا نورث ما ترکنا صدقۃ

[3] صحیح بخاری کتاب العمرہ باب حج النساء

عہدِ خلافت اور کارنامے

شہادتِ حضرت عمرؓ

حضرت عمرؓ کی عمر ابھی ترسٹھ برس تھی اور آپ کی خلافت کو صرف دس برس چھ مہینے اور چار دن ہوئے تھے کہ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ مطابق ۶۴۴ھ کو اچانک آپ کی شہادت کا واقعہ فاجعہ پیش آگیا۔ اس کی روئداد یہ ہے کہ مغیرہ بن شعبہ جب کوفہ میں گورنر تھے تو ان کے پاس ایک ایرانی النسل مجوسی غلام تھا جو نہاوند کی جنگ میں گرفتار ہو کر آیا تھا۔ اس کا نام فیروز اور لقب ابو لولو تھا، مغیرہ بن شعبہ جب مدینہ آنے لگے تو حضرت عمرؓ سے تحریری اجازت لے کر غلام کو بھی اپنے ساتھ لائے، ابو لولو بہت اچھا کاریگر تھا اور نجار و نقاش بھی۔ مغیرہ بن شعبہ نے اس پر کم و بیش چار درہم روزانہ کا ٹیکس لگا رکھا تھا۔ ایک دن حضرت عمرؓ بازار سے گذر رہے تھے کہ ابو لولو مل گیا اور اس نے اپنے آقا کی شکایت کی کہ مجھ پر ٹیکس زیادہ لگا رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پورا ماجرہ سن کر فیصلہ کیا کہ ٹیکس ایسا کچھ زیادہ نہیں ہے، ابو لولو کو اس پر اس قدر طیش آیا کہ اس نے خلیفۂ وقت کو دھمکی دی اور دوسرے ہی دن فجر کی نماز کے وقت مسجد کے قریب کہیں

گھات میں آکر بیٹھ گیا اور ابھی حضرت عمر نے تکبیر تحریمہ کہہ کے ہاتھ باندھے ہی تھے کہ اچانک ایک دودھاری خنجر سے مسلسل تین وار کر دیئے، وہ دوسرے نمازیوں کو بھی زخمی کرتا ہوا نکل بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک مسلمان نے پیچھے سے کمند پھینک کے اسے پکڑنا چاہا تو فوراً خودکشی کرلی، حضرت عمر کی ناف پر جو زخم آیا تھا چونکہ اس سے رگ صفاق پھٹ گئی تھی اس لئے وہ سخت کاری تھا، جب جانبر ہونے کی کوئی امید نہیں رہی تو لوگوں کی درخواست پر حضرت عمر نے اپنی جانشینی کے لیے حضرت عثمان، علی، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ بن عبداللہ، اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم کے نام پیش کئے اور فرمایا کہ یہ وہ حضرات ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تو ان سے راضی اور خوش ہوکر گئے، پھر فرمایا کہ ان چھ حضرات میں سے جس کسی کے نام پر اتفاق ہو جائے یا اسے اکثریت کی حمایت اور تائید حاصل ہو اسے خلیفہ بنا دیا جائے[1]۔ ساتھ ہی یہ حکم ہوا کہ تین دن کے اندر اندر اس کا فیصلہ ہو جانا

---

[1] مولانا شبلی نے (الفاروق ص ۱۹۸ و ۱۹۹) اس سلسلے میں دو باتیں عجیب وغریب کہی ہیں جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہیں (۱) پہلی بات تو یہ ہے لکھتے ہیں: مدت کے غور و فکر پر بھی ان .. (حضرت عمر) کے انتخاب کی نظر کسی شخص پر جمتی نہ تھی، بارہا ان کے منہ سے بے ساختہ آہ نکلتی کہ "افسوس! اس بار گراں کا کوئی اٹھانے والا نظر نہیں آتا۔ تمام صحابہ میں اس وقت چھ اشخاص تھے جن پر انتخاب کی نگاہ پڑ سکتی تھی...... لیکن حضرت عمر ان سب میں کچھ نہ کچھ کمی پاتے تھے" مولانا نے اس آخری فقرے پر حاشیہ دیا ہے جس میں لکھتے ہیں، "حضرت عمر نے ان بزرگوں کی نسبت جو خردہ گیریاں کیں، گو ہم نے ان کو ادب سے نہیں لکھا ان میں جائے کلام نہیں، البتہ حضرت علی کے متعلق جو نکتہ چینی حضرت عمر کی زبانی عام تاریخوں میں منقول ہے۔ وہ ایک خیال ہی خیال معلوم ہوتا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ مولانا لکھتے ہیں "مذکورہ بالا بزرگوں میں وہ (حضرت عمر) حضرت علی کو سب سے بہتر جانتے تھے"

چاہیے اس وقت تک امامت صہیب کریں گے۔

حضرت عثمان سے بیعت

ان چھ بزرگوں کا نام پیش کرنے کے بعد حضرت عمر نے ان سے فرمایا: اب آپ حضرات آپس میں مشورہ کرلیں، مجلس مشاورت دو دن تک ہوتی رہی لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ حضرت عمر نے مشورہ کے

بقیہ حاشیہ ص ۲۱ :۔ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ حضرت عمر کی شہادت اور ان کے استخلاف کا ذکر تذکرہ و تراجم اور تاریخ کی تمام کتابوں میں ہے، لیکن ان میں رطب و یابس ہر قسم کی روایات پائی جاتی ہیں۔ اس بنا پر سب سے زیادہ مستند و معتبر وہ طویل روایت ہے جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح جلد اول میں باب مناقب عثمان کے تحت نقل کیا ہے۔ اسی روایت کو اور دوسری روایات کے ساتھ ابن سعد المتوفی سنہ ۲۳۰ھ نے طبقات ج ۳ تذکرہ حضرت عمر و حضرت عثمان میں نقل کیا ہے۔ ہم نے بھی صحیح بخاری اور ابن سعد کو ہی اس باب میں اپنا ماخذ بنایا ہے۔ مولانا شبلی کی دو عبارتیں جو اوپر نقل ہوئی ہیں، ان میں سے کسی کی تائید نہ بخاری سے ہوتی ہے اور نہ ابن سعد سے، ان روایات میں یہ بےشک ہے کہ حضرت عمر نے اس موقع پر حضرت علی سے فرمایا کہ اگر خلافت کے لیے تمہارا انتخاب ہو جائے تو تم بنو ہاشم کو لوگوں پر مسلط نہ کر دینا۔ حضرت عثمان سے فرمایا: اگر تم خلیفہ بنو تو ابو معیط کی اولاد کو لوگوں کی گردنوں پر سوار مت کر دینا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے فرمایا، خلافت تم کو ملے تو تم اپنے رشتے داروں کو مسلمانوں پر حاوی مت کرنا (طبقات ص ۲۴۹) اس روایت میں حضرت عمر نے تینوں اصحاب کو جس بات کی طرف توجہ دلائی ہے اسے ہرگز اس قسم کی کمزوری نہیں کہا جا سکتا جس کے باعث ان حضرات کا استحقاق خلافت حضرت عمر کی نگاہ میں مشتبہ ہوتا، اگر ایسا ہوتا تو حضرت عمر ان کو خلافت کے مستحقین کی فہرست میں کیوں شامل کرتے، اسی طرح بخاری اور ابن سعد میں کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس سے مولانا شبلی کے بقول اس طرف اشارہ نکلتا ہو کہ حضرت عمر مذکورۂ بالا چھ بزرگوں میں حضرت علی کو سب سے بہتر جانتے تھے۔

لیے تین دن کی تحدید کردی تھی، اس لیے حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد مجلس شوری کا پھر اجتماع ہوا اور اس میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے تجویز کی کہ ہم میں ایک شخص ایک کے نام کی سفارش کرے اس پر اتفاق ہوگیا تو زبیر بن عوام نے علی کو، طلحہ نے عثمان کو اور سعد بن ابی وقاص نے عبدالرحمٰن بن عوف کو اپنا اپنا حق سپرد کردیا۔ اب معاملہ صرف تین حضرات میں دائر رہ گیا تو عبدالرحمٰن بن عوف نے علی اور عثمان سے کہا کہ میں اپنا نام واپس لیتا ہوں، اور آپ دونوں حضرات اپنا معاملہ میری صوابدید پر چھوڑ دیں، جس کو میں خلافت کے لیے منتخب کروں دوسرے صاحب اس کو بخوشی قبول فرمائیں، حضرت علیؓ اور حضرت عثمان نے الگ الگ تنہائی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے اس کا اقرار کرلیا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے بیعت کے لیے حضرت عثمان کی طرف ہاتھ بڑھایا ان کا بیعت کرنا تھا کہ حضرت علی آگے بڑھے اور بیعت کی، اس کے بعد لوگ ٹوٹ پڑے اور بیعت عامہ ہوگئی، پہلی محرم ۲۴ھ کا آفتاب طلوع ہوا تو حضرت عثمان بن عفان تیسرے خلیفۂ راشد تھے [۱]

خلافت کا اعلان ہوجانے کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا۔

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۴۳ و ۲۴۵۔ ابن اثیر نے حضرت عثمان کے خلیفہ ہونے کی تاریخ ۴ محرم الحرام ۲۴ھ لکھی ہے، لیکن یہ خلاف قیاس ہے۔ کیونکہ حضرت عمر ۲۶ ذوالحجہ کو نماز فجر میں زخمی ہوئے ہیں، زخمی ہونے کے تین دن بعد انتقال فرمایا اور انتخاب خلیفہ کے لیے جو مجلس شوری بنائی تھی اس کو حضرت عمر نے تاکید کردی تھی کہ فیصلہ تین دن کے اندر اندر ہوجانا چاہیے، چنانچہ ہوگیا، ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن اثیر کی بیان کردہ تاریخ صحیح نہیں ہے اور صحیح وہی ہے جو ابن سعد نے بیان کیا ہے یعنی یہ کہ خلافت کا فیصلہ اس وقت ہوا جب کہ ذوالحجہ مہینہ کے ختم ہونے میں ایک شب باقی تھی۔ ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

استخلفنا خیر من بقی و لم نالہٗ — ہم نے اس شخص کو خلیفہ بنایا ہے جو اب زندہ لوگوں میں سب سے بہتر ہے اور ہم نے اس میں تقصیر نہیں کی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا حال بہت دنوں تک یہ رہا کہ مسجد میں جو خطبہ بھی دیتے اس میں یہ ضرور فرماتے۔

اَمّرنا خیر من بقی و لم نال — ہم نے اب جو لوگ باقی رہ گئے ہیں ان میں سب سے بہتر شخص کو امیر بنایا ہے اور ہم نے اس میں کوتاہی نہیں برتی۔

پھر عبداللہ بن مسعود مدینہ سے کوفہ گئے تو وہاں کے لوگوں کو بھی حضرت عثمان کی بیعت پر آمادہ کیا اور یہ فرمایا: امیرالمومنین حضرت عمر کا حادثۂ وفات ہم سب اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سخت مصیبت اور ماتم کا دن تھا۔ اس کے بعد ہم سب لوگ ایک جگہ جمع ہوئے تو ہم کو خلافت کا بارگراں اٹھانے کے لیے عثمان بن عفان سے بہتر کوئی شخصیت نظر نہیں آئی تلاش اور جستجو میں ہم نے کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ اس لیے ہم نے ان سے بیعت کرلی۔ اب آپ لوگ بھی ان سے بیعت کرلیں۔ (طبقات ج ۳ ص ۴۳)

خلافت کے بعد پہلا خطبہ

حضرت عثمان خلیفہ اول و دوم کی طرح اعلیٰ درجہ کے خطیب نہیں تھے، اس لیے انھوں نے بیعت کے بعد جو خطبہ دیا اس میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا: لوگو! پہلی ہی سواری مشکل ہوتی ہے، آج کے دن کے بعد بہت سے مواقع آئیں گے، اگر میں زندہ رہا تو آپ قاعدہ اور ڈھنگ کے خطبے سنیں گے اور ہمارا شمار خطبا میں نہیں ہے، اللہ ہماری مدد کرے گا"[1] لیکن طبری نے جو خطبہ اس موقع پر نقل کیا ہے وہ قدرے طویل اور بڑا اثر انگیز ہے۔ اس میں حضرت عثمان حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد فرماتے ہیں۔

---

[1] ایضاً ص ۴۳

۱۰ اے لوگو! تم سب دار مسافرت میں ہو، عمر کا جو حصّہ باقی ہے بس اس کو پورا کرنے والے ہو اس لیے تم زیادہ سے زیادہ جو نیکی کر سکتے ہو اپنے اپنے مقررہ وقت سے پہلے اسے کر گزرو، بس یہ سمجھو کہ موت اب آئی یا جب آئی بہر حال اسے آنا ضرور ہے، خوب سن لو کہ دنیا کا سارا تار و پود ہی مکر اور فریب سے تیار ہوا ہے، اس لیے دیکھو! کہیں تم کو یہ دنیا کی زندگی دھوکہ نہ دے جائے اور اللہ سے تم کو غافل نہ کر دے، لوگو! جو لوگ گزر گئے ہیں ان سے عبرت حاصل کرو، اور یہاں سعی اور جد و جہد کرو، غفلت نہ برتو، کیوں کہ تم سے غفلت نہ برتی جائے گی، کہاں ہیں وہ ارباب دنیا جنھوں نے دنیا کو آخرت پر ترجیح دی، اسے آباد رکھا اور اس سے ایک مدت تک بہرہ اندوز ہوئے! کیا دنیا نے ان لوگوں کو اپنے اندر سے باہر نہیں نکال پھینکا تم دنیا کو اسی مقام پر رکھو جس پر خدا نے اسے رکھا ہے اور آخرت کی طلب کرو، اللہ نے دنیا کی اور جو چیز خیر ہے اس کی مثال اس طرح بیان کی ہے

واضرب لھم مثل الحیاۃ	اے پیغمبر آپ لوگوں کو بتا دیجیے کہ دنیا کی زندگی
الدنیا کماءٍ انزلناہ من	کی مثال اس پانی جیسی ہے جسے ہم آسمان سے
السماءِ الی آخیر الآیۃ (کہف)	نازل کرتے ہیں۔ (طبری ج ۵ ص ۲۴۳)

پہلا مقدمہ حضرت عثمان کے سامنے خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلا مقدمہ حضرت عمر کے صاحب زادے عبید اللہ کا آیا۔ عبد الرحمٰن بن ابی بکر نے بتایا کہ کہ ابو لولو کے ساتھ سازش میں شریک جفینہ اور ہرمزان نام کے دو شخص اور تھے... عبید اللہ کو یہ سنتے ہی ایسا طیش آیا کہ فوراً تلوار اٹھا چل دیئے اور موقع پر دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ جفینہ عیسائی تھا اور ہرمزان مجوسی[۱]، راستہ میں ابو لولو کا گھر پڑتا تھا، وہاں اس

---

[۱] اگرچہ عبید اللہ نے جب اس پر تلوار سے وار کیا ہے اس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا تھا۔ (ابن سعد ج ۵ ص ۲۵۸)

کی ایک کم سن بچی موجود تھی اسے بھی موت کے گھاٹ اتارا۔ مہاجرین وانصار یہ دیکھ کے گھبرا گئے، بڑی مشکل سے عبید اللہ کو قابو میں کیا، ورنہ غالباً مدینہ میں جتنے ایرانی غلام تھے وہ ان سب کو ختم کر دینے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ اب حضرت عثمان کے سامنے معاملہ یہ درپیش تھا کہ عبید اللہ کو کیا سزا دی جائے۔ حضرت عثمان نے مشورہ کیا تو اکثر مہاجرین کی رائے تھی کہ قتل ناحق کی سزا قتل ہے، اس لیے قصاص لیا جائے۔ حضرت علی کی رائے یہی تھی لیکن بعض اور صحابہ جن میں عمرو بن العاص بھی شامل تھے، اس رائے کے مخالف تھے، حضرت عثمان نے مصلحت وقت کے پیش نظر دوسری رائے کو ترجیح دی اور ایک فقہی اصل "السلطان ولی من لا ولی لہ" یعنی جس شخص کا ولی کوئی نہ ہو ریاست اس کی ولی ہوتی ہے، کے مطابق خود مقتولین کی طرف سے ولی بن کر دیت پر رضا مند ہو گئے اور پھر خود ہی دیت ادا بھی کر دی [1]"

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان کا یہ فیصلہ وقت اور زمانہ کے مصالح کے پیش نظر ان کے تفقہ اور دور اندیشی کی دلیل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قتل ناحق کی سزا قصاص ہے۔ لیکن نکتہ سنجانِ شریعت جانتے ہیں کہ دنیا میں کوئی حکم بھی مطلق نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لیے کچھ شرائط پہلے سے معہود فی الذہن ہوتے ہیں، اور شارع کی طرف سے ان کا صراحۃً بیان ضروری نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت عمر کے اجتہادات میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، مثلاً قرآن مجید میں چوری کی سزا کا حکم مطلق بغیر کسی قید کے ہے، لیکن حضرت عمر نے قحط کے زمانہ میں چوری کو اس کے حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ اسی طرح ان دو غلاموں پر سے حد سرقہ ساقط کر دی جنھوں نے کہا تھا کہ ہمارا مالک پیٹ بھر کے ہم کو کھانا نہیں دیتا تھا اسی لیے ہم چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۵، دار بیروت اڈیشن

فتوحات و توسیع مملکت

خلافت عثمانی کا ایک نہایت اہم کارنامہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں جن عظیم الشان فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ حضرت عثمان نے نہ صرف یہ کہ ان فتوحات کو جاری رکھا بلکہ ان میں توسیع کی جو فتوحات نامکمل رہ گئی تھیں، انھیں مکمل کیا، جہاں کوئی بغاوت ہوئی، اس کا فوراً تدارک کر کے حکومت میں استحکام پیدا کیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عمر ہمیشہ بحری جنگ کے خلاف رہے، چنانچہ عرفجہ بن ہرثمہ الازدی نے ان کی لاعلمی میں عمان کی بحری جنگ کی اور ان کو خبر ہوئی تو سخت ناراض ہوئے اور عرفجہ کو سرزنش کی، لیکن حضرت عثمان پہلے خلیفہ ہیں جنھوں نے سمندر میں لڑائی کا آغاز کیا اور اسے کامیاب کر کے رہے، اب اس کی تفصیل سنیئے۔

سکندریہ کی دوبارہ فتح

سکندریہ اس زمانہ میں مصر کا دار السلطنت تھا جہاں رومی شہنشاہیت جس کا مستقر اب قسطنطنیہ تھا اس کا مقرر کیا ہوا گورنر رہتا تھا، اس گورنر کو مقوقس کہتے تھے جو قیصر کے ماتحت ہوتا تھا، مصر کی عام آبادی

قبطیوں (Copts) پر مشتمل تھی۔ اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے والا نامہ میں مقوقس کو "عظیم القبط" کے لقب سے مخاطب کیا ہے۔ حضرت عمر کی خلافت میں عمرو بن العاص نے مصر پر حملہ کیا تو مقوقس جزیہ دینے کی شرط پر صلح کرنا چاہتا تھا لیکن عمرو بن العاص نہ مانے، نہایت سخت جنگ ہوئی اور آخر اسکندریہ فتح ہو گیا، مصر کا دوسرا شہر فسطاط (جو آج کل قدیم قاہرہ کہلاتا ہے) پہلے فتح ہو چکا تھا۔ قیصر روم کو اس کی سخت ناگواری تھی، لیکن وہ موقع کا منتظر تھا، ادھر یہ ہوا کہ ایک طرف حضرت عمر کا انتقال ہو گیا اور دوسری طرف حضرت عثمان نے عمرو بن العاص کو مصر کی گورنری سے اس لیے، معزول کر دیا کہ مصر سے خراج کم آرہا تھا اور ان کی بجائے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو گورنر مقرر کیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر قیصر روم، شہنشاہ کانسٹنس (Constence) کو حوصلہ ہوا اور اس نے اپنے ارمنی امیرالبحر مینول (Menual) کی قیادت میں تین سو جہازوں کا بیڑا روانہ کیا۔ مسلمان اچانک اس حملہ کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیئے انھوں نے مقابلہ تو کیا، لیکن آخر شکست کھا گئے اور ایک بڑی تعداد قتل ہو گئی، اب اسکندریہ پر رومیوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ واقعہ خلافت عثمانی کے دوسرے سال ۲۵ھ مطابق ۶۴۵ء کا ہے۔

حضرت عثمان کو اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو فوراً عمرو بن العاص کو ان کے عہدہ پر بحال کر کے حکم دیا کہ اسکندریہ کو واپس لینے کے لیے پیشقدمی کریں۔ عمرو بن العاص نے تعمیل کی، ایک لشکر جرار لے کر روانہ ہوئے، مقام نکیوی (Nikiu) کے قریب دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا۔ عمرو بن العاص نے پینترا بدل کر اس زور کا حملہ کیا کہ غنیم تاب نہ لا کر پسپا ہوا اور عظیم جانی اور مالی نقصان کے ساتھ میدان جنگ سے فرار ہو گیا، مسلمانوں نے اسکندریہ پر پھر قبضہ کر لیا جس کو پھر کوئی طاقت چیلنج نہیں کر سکی اور آئندہ بغاوت کے خیال سے اسکندریہ کی نہایت مضبوط چہار دیواری

بھی عمرو بن العاص کے حکم سے مسمار کر دی گئی۔[۱] اسکندریہ کی فتح کے بعد حضرت عثمان نے عمرو بن العاص کو لکھا کہ تم مصر میں فوج کے نگراں اور اس کے کمانڈر رہو، لیکن مصر کا ریونیو یعنی مالیاتی نظام عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے ماتحت رہے گا۔ عمرو بن العاص نے جواب میں لکھا کہ "پھر تو میری پوزیشن اس شخص کے مانند ہوگی جو گائے کے دونوں سینگ پکڑے کھڑا ہے اور ایک دوسرا شخص اسے دوہ رہا ہے" اور اس جواب کے ساتھ ہی حضرت عثمان کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[۲]

عام مورخین کے نزدیک عمرو بن العاص کے مصر سے معزولی کا سبب یہی ہے کہ مصر سے خراج کی آمدنی خاطر خواہ نہیں ہو رہی تھی، حضرت عثمان نے ان کو اس پر تنبیہ کی بھی تو جواب دیا کہ ایک اونٹنی اتنا ہی دودھ دے سکتی ہے جو اس کے تھنوں میں ہے، اس سے زیادہ نہیں دے سکتی، لیکن یعقوبی نے معزولی کی وجہ یہ لکھی ہے کہ عمرو بن العاص نے باغیوں کے اہل و عیال کو لونڈی غلام بنا کر تقسیم کر دیا تھا، حضرت عثمان نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور سب لونڈی غلام آزاد کر دیئے ہمارے نزدیک ان میں تعارض نہیں ہے، دونوں باتیں سبب ہو سکتی ہیں۔

بہر حال اب پورا مصر عبداللہ بن ابی سرح کے زیر نگین تھا۔ اس زمانہ میں مصر کی آمدنی میں بڑا اضافہ ہوا، حضرت عثمان نے عمرو بن العاص سے کہا: لو دیکھو! اب اونٹنی اتنا دودھ کیسے دے رہی ہے؟" بولے: ہاں! دودھ تو دے رہی ہے مگر بچے بھوکے رہ گئے۔

لیبیا اور تونس کی فتح

عمرو بن العاص نے مصر کے دارالسلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد آگے بڑھ کر مغرب میں برقہ (Cyrenaica) اور طرابلس (Tripoly) کو بھی فتح کر لیا تھا۔ اب حضرت عثمان کا دور آیا تو آپ نے

---

[۱] فتوح مصر و اخبارہا ابن عبدالحکم ص ۱۷۵،۶

[۲] ایضاً ص ۱۷۸

۲۵ھ میں عبداللہ بن ابی سرح کو لکھا کہ افریقیہ یعنی ٹیونس کی طرف پیش قدمی کریں، عبداللہ نے حکم کی تعمیل کی، لیکن تیونس فتح نہ ہو سکا۔ آخر ۲۷ھ مطابق ۶۴۷ء میں دوبارہ حضرت عثمان نے ایک لشکر جرار روانہ کیا جس میں حسن حسین، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن زبیر ایسے اکابر ملت شامل تھے۔ عبداللہ بن ابی سرح اس لشکر کو لے کر روانہ ہوا تو طرابلس میں رومیوں کے ایک عظیم لشکر نے مقاومت کی، لیکن آخر شکست کھائی، عبداللہ بن ابی سرح آگے ٹیونس کی طرف بڑھا۔ یہاں رومیوں کے گورنر نے ایک لاکھ بیس ہزار فوج سے اسلامی لشکر کا مقابلہ کیا، بڑی سخت جنگ ہوئی، آخر رومیوں کو شکست فاش ہوئی اور مسلمانوں کا تیونس پر قبضہ ہو گیا۔ یہ جنگ سوفیتلا موجودہ تیونس کا مقام ابیتلا (Sbeitla) میں ہوئی تھی۔ اور رومی افواج کا کمانڈر گرے گوری (Gregory) اسی جنگ میں عبداللہ بن زبیر کے ہاتھوں مارا گیا۔ جو مال غنیمت ہاتھ آیا اس کی بہتات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک ایک سوار کو تین تین ہزار دینار اور پیادہ فوج کو فی کس ایک ہزار دینار حصہ میں ملے۔ [1]

ٹیونس کے اس عظیم معرکہ میں کامیابی کے بعد بھی عبداللہ بن ابی سرح نے شمالی افریقیہ میں مشرق سے مغرب کی طرف اپنی پیش قدمی جاری رکھی، اور راستے میں جو شہر اور قلعے ملتے گئے وہ مفتوح ہوتے رہے۔ چنانچہ الجزائر فتح ہوا، آخر جبل طارق جو مراکش کا آخری سرا ہے وہاں جا کر دم لیا۔ اور اس طرح مصر سے لے کر مراکش تک کے پورے علاقہ پر خلافت عثمانی کا پرچم لہرانے لگا اور رومی افواج کا یہاں سے کلی طور پر انخلاء ہو گیا، بلاذری کا بیان ہے کہ اگرچہ بربری اہل کتاب نہیں تھے، لیکن شریعت اسلام جو رعائتیں

---

[1] the Cambridge History of Islam p.63 اور دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۶ ص ۱۵۸ مادہ عثم، و فتوح مصر و اخبارہا ابن عبدالحکم ص ۱۸۳۔ ۱۸۴

اہل کتاب کے لیئے روا رکھتی ہے، حضرت عثمان نے بربری لوگوں کے لیے بھی ان رعاتیوں کا اعلان کردیا[1]

اندلس پر حملہ مراکش کے فتح ہو جانے سے اسپین کا دروازہ کھل گیا تھا، اس لیے اب ۲۷ھ میں حضرت عثمان نے عبداللہ بن نافع بن الحصین اور عبداللہ بن نافع بن عبدالقیس کو لکھا کہ تم دونوں اندلس کی طرف پیش قدمی کرو اور ساتھ ہی جن بربریوں کو حضرت عثمان ان دونوں کے لشکر میں بھیجنا چاہتے تھے ان کو تحریر فرمایا کہ قسطنطنیہ کی فتح کا دروازہ اندلس کی طرف سے کھلیگا۔ ان سب نے تعمیل ارشاد کی اور روانہ ہوگئے، ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس معرکہ میں مسلمانوں کو جو کامیابی ہوئی اس سے مسلمانوں کی طاقت وقوت اور شوکت وحشمت میں اضافہ ہوا۔[2]

جزیرہ قبرص کی فتح قبرص جسے انگریزی میں سائپرس (Sypruss) کہتے ہیں بحرروم میں بازنطینی (رومی) حکومت کا ایک بڑا بحری مرکز اور شام کے ساحل سے قریب ہونے کے باعث شام میں مسلمانوں کے مقبوضات کے لیے ہر آن ایک خطرہ تھا، اس بناء پر امیر معاویہ بن ابی سفیان نے جو شام کے گورنر تھے حضرت عمر فاروق سے اس جزیرہ پر فوج کشی کی اجازت طلب کی تھی، لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ حضرت عمر بحری جنگ کو ناپسند فرماتے تھے، اس لیے اجازت دینے سے انکار کردیا، اسی قسم کی اجازت سعد بن ابی وقاص نے جب وہ عراق میں گورنر تھے تو ان کو بھی منع کردیا اور لکھا: مسلمانوں کے اور میرے درمیان سمندر حائل نہیں ہونا چاہیئے[3]

---

[1] فتوح البلدان ص ۲۳۷ - ۲۳۸

[2] الکامل بیروت اڈیشن ج ۳ ص ۹۳

[3] الفخری ص ۱۱۴

۲۸ھ مطابق ۶۴۹ء میں امیر معاویہ نے جزیرۂ قبرص کی اہمیت اور اس پر قبضہ کی ضرورت کے بارے میں حضرت عثمان کو باصرار پھر لکھا تو آپ نے ان کو اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ وہ اس مہم میں اپنی بیوی کو بھی اپنے ہمراہ لے جائیں گے اور اس بحری جنگ میں شرکت پر کسی کو مجبور نہیں کریں گے، اجازت ملنے کے بعد حضرت امیر معاویہ نے قبرص پر حملہ کیا تو یہاں کے باشندوں نے سات ہزار دینار سالانہ پر صلح کرلی، شرط یہ تھی کہ (۱) مسلمان اہلِ قبرص کی پوری حفاظت کریں گے (۲) اور رومیوں کے مقابلہ کے لیے یہ لوگ مسلمانوں کو اپنے جزیرہ سے گذرنے دیں گے اور (۳) ساتھ ہی مسلمانوں کو رومیوں کی نقل و حرکت سے واقف کرتے رہیں گے کئی برس تک یہ صلح قائم رہی، لیکن ۳۲ھ میں اہالیانِ قبرص نے مسلمانوں کے خلاف رومیوں کی مدد کر کے نقضِ عہد کیا تو امیر معاویہ نے حملہ کر کے اسے فتح کیا اور ایک اسلامی نوآبادی بنا دیا [1] پروفیسر ہٹی لکھتے ہیں کہ قبرص کی فتح بحری جنگ میں مسلمانوں کی پہلی فتح تھی، یہ پہلا جزیرہ تھا، جو اسلامی حکومت میں شامل ہوا۔ نیز معاویہ بن ابی سفیان اور عبداللہ بن ابی سرح دونوں تاریخ اسلام میں پہلے امیر البحر ہیں جنھوں نے بحری بیڑے کی نہایت شاندار قیادت کر کے سمندری لڑائی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ مگر ساتھ ہی پروفیسر ہٹی کو افسوس ہے کہ عربی مآخذ میں مسلمانوں کے بحری جنگی کارناموں کے متعلق جو کچھ مواد ملتا ہے وہ نہایت درجہ کم ہے [2]

جزیرۂ ارواد کی فتح

قبرص کی فتح کے دوسرے ہی برس جزیرۂ ارواد جسے انگریزی میں Aradus کہتے ہیں

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۳۵

[2] Hiti: History of the Arabs. P. 167

فتح ہوا۔[1] یاقوت حموی لکھتا ہے: ارواد قسطنطنیہ کے قریب سمندر میں ایک جزیرہ ہے، معاویہ بن ابی سفیان کے عہد حکومت میں ۵۴ھ میں مسلمانوں نے اس پر جنگ کی اور اسے فتح کیا۔[2] بلاذری، طبری اور ابن اثیر نے بھی یہی لکھا ہے، لیکن ابن اعثم الکوفی المتوفی ۳۱۴ھ نے جزیرہ ارواد کا ذکر فتوحات عثمانی میں کیا ہے[3]۔

جزیرہ رودس کی فتح

جزیرہ رودس جسے انگریزی میں Rhodes کہتے ہیں، بحیرہ روم میں ایشیائے کوچک کے جنوبی ساحل سے بارہ میل کے فاصلہ پر واقع اور تقریباً پنتالیس میل طویل ہے، اس جزیرہ کی زمین سطح سمندر سے تدریجی طور پر بلند ہوتی چلی گئی ہے: یہاں تک کہ اس کی سب سے اونچی چوٹی کی بلندی چھ ہزار فٹ ہے، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے قدیم دنیا کے براعظموں میں بحری جنگ کے نقطۂ نظر سے یہ جزیرہ کس درجہ اہمیت کا مالک تھا[4]۔ عام مورخین نے اس جزیرہ کی فتح کو ۵۲ھ یا ۵۳ھ کا، جب کہ امیر معاویہ خلیفہ تھے واقعہ بیان کیا ہے[5] لیکن ابن عبدالحکم المولود ۱۸۷ھ نے اسے خلافت عثمانی کے کارناموں میں شمار کیا ہے اور اسی کے حوالہ سے پروفیسر ہٹی نے لکھا ہے کہ ۶۵۴ء میں (یعنی خلافت عثمانی میں) جزیرہ

---

[1] (1) Hiti : History of the Arabs. P. 167

[2] معجم البلدان ج ۱ ص ۲۰۷

[3] کتاب الفتوح مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ج ۲ ص ۱۴۶

[4] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام عربی ترجمہ طہران اڈیشن ج ۱۰ ص ۲۱۴

[5] الضیا، نیز دیکھئے فتوح البلدان ص ۲۴۴، معجم البلدان تذکرہ روڈس، طبری و ابن اثیر

روڈس پر بھی قبضہ ہوگیا[۱]۔ اس کا مزید ثبوت اس بیان سے ہوتا ہے جو اس سلسلے میں ابن اعثم الکوفی المتوفی ۳۱۴ھ نے دیا ہے[۲] موصوف لکھتے ہیں: (مذکورہ بالا فتوحات کے بعد) معاویہ نے حضرت عثمان کو پھر لکھا کہ سمندر (بحر روم) میں ایک اور جزیرہ ہے جس کا نام رودس ہے، اس کو بھی فتح کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، حضرت عثمان نے مجلسِ شوریٰ سے رائے طلب کی، تو ان حضرات نے فرمایا: "امیرالمومنین! جزیرۂ قبرص کی فتح نے مسلمانوں کے حوصلے اونچے کر دیئے ہیں اور ان کو بحری جنگ کرنے میں کوئی تامل نہیں، اس لیے ہماری رائے ہے کہ آپ معاویہ کو اجازت عطا فرما دیں"

اس پر حضرت عثمان نے کہا:

انی قد اذنت لک فیما سالت، فاتق اللہ ولا تفضح الحزم، وان خوفت من البحر شیئاً فلا ترکبنہ فان ھولہ عظیم

جس چیز کی تم نے اجازت مانگی تھی میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں، اب تم اللہ سے ڈرو، دور اندیشی کو ہاتھ سے مت جانے دو، اور اگر تم کو سمندر کا ڈر ذرا سا بھی ہو تو ہرگز اس پر سوار مت ہونا، کیونکہ سمندر کا ہول بہت ہوتا ہے۔

آگے قصہ کافی طویل ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان کی اجازت مل گئی تو امیر معاویہ اپنا بحری بیڑہ لے کر روانہ ہوئے، جزیرۂ رودس کے لوگوں نے سمندر میں ہی مسلمان بیڑہ کا مقابلہ کیا، نہایت سخت جنگ ہوئی، فریقین کے آدمی کثرت سے قتل ہوئے، آخر کار مسلمانوں کو فتح ہوئی اور وہ جزیرہ میں داخل ہو گئے، یہاں ان کو مال غنیمت تو بہت کچھ ملا، لیکن آبادی نہیں ملی، بچے کھچے جو لوگ رہ گئے تھے انھوں نے خودکشی کر لی تھی، امیر معاویہ نے حضرت عثمان کو جزیرہ کی فتح کا حال لکھا تو آپ نے

---

[۱] ہسٹری آف دی عربس ص ۱۶۷ دسواں اڈیشن

[۲] کتاب الفتوح ج ۲ ص ۱۲۴ - ۱۲۷

بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔

لیکن فتح ہونے کے باوجود جزیرہ ویران رہا۔ یہاں تک کہ امیر معاویہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں اس جزیرہ کو آباد کیا، وہاں مسلمان بسائے، مسجد تعمیر کی، اور اسے ایک مضبوط اسلامی چھاؤنی بنا دیا[1] غالباً اسی وجہ سے عام مورخین لکھتے ہیں کہ یہ جزیرہ امیر معاویہ کے عہد خلافت میں فتح ہوا تھا۔

جزیرہ صقلیہ پر حملہ

جزیرہ صقلیہ (Sicily) بحر روم کے قلب میں ایک نہایت اہم جزیرہ ہے۔ زمانہ قدیم میں قبل از اسلام دنیا کی تین عظیم الشان قوموں، فینیقین، یونانیوں، اور رومیوں کی باہمی سیاسی چپقلش کا میدان کارزار رہا ہے، بحری جنگ میں اس کی اہمیت امیر معاویہ سے کس طرح مخفی رہ سکتی تھی چنانچہ انھوں نے حضرت عثمان کو لکھ کر اجازت طلب کی اور جب اجازت آگئی تو تین سو کشتیوں کا بیڑہ جو ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ تھا اسے لے کر سمندر میں کود پڑے، صقلیہ کے بادشاہ نے پہلے ترجمان کے ذریعہ گفتگو کی۔ لیکن جب گفتگو ناکام ہوگئی تو جنگ منازلت کی شکل میں شروع ہوئی۔ یہ ایک رومی پادری اور ایک بربری مسلمان کے درمیان تھی۔ اس میں پادری مارا گیا، اس کے بعد عام جنگ شروع ہوئی، صقلیہ کا فرماں روا خود فوج لے کر آگے بڑھا۔ ادہر مسلمانوں نے بھی صف بندی کر لی تھی، رومی فوج نے مسلمانوں کے میسرہ پر اس زور کا حملہ کیا کہ میسرہ پسپا ہوگیا مگر میمنہ اور قلب لشکر اپنی جگہ ثابت قدم رہے۔ دن بھر جنگ ہوتی رہی مگر کوئی فیصلہ نہیں ہوا اتنے میں مسلمانوں کو خبر لگی کہ شاہ روم نے صقلیہ کی مدد کے لیے چھ سو مسلح سپاہ کا بیڑہ روانہ کر دیا ہے اس لیے رائے یہ ہوئی کہ مسلمانوں کو واپس ہو جانا چاہیئے

---

[1] کتاب الفتوح ج ۲ ص ۱۲۷

چنانچہ پردۂ شب کی آڑ لے کر مسلمان بیڑہ صقلیہ کے ساحل سے روانہ ہو کر ساحلِ شام پر فروکش ہوا[1] یہ واقعہ ۳۲ھ مطابق ۶۵۲ء میں پیش آیا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جزیرۂ رودس کی فتح کی طرح صقلیہ پر اس حملہ کا ذکر بھی عرب مورخین نے عام طور پر خلافت عثمانی کے کارناموں میں نہیں کیا، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار صقلیہ لکھتا ہے۔

"۶۵۲ء میں ہی عربوں نے صقلیہ پر اپنا پہلا حملہ کیا۔ اگرچہ عرب مورخین میں سے کسی نے اس حملہ کا ذکر نہیں کیا۔ مگر ہمارے لیے تیوفانیس (Theophanes) کی شہادت کافی ہے، وہ لکھتا ہے کہ اولمپیس (Olympius) جو اس وقت بیزنطی (رومی) حکومت کی طرف سے صقلیہ کا گورنر تھا اس نے مسلمانوں کے حملہ کا مقابلہ کیا، لیکن مسلمان لشکر کو دوران جنگ جو کچھ مال غنیمت ملا۔ اور وہ بہت تھا۔ اسے لے کر کشتیوں میں دمشق پہونچ گئے۔[2]" پروفیسر ہٹی نے بھی اس حملہ کا ذکر کیا ہے[3]

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار اور پروفیسر ہٹی کو عرب مورخین سے بحری جنگوں کے متعلق کوتاہ قلمی کی جو شکایت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک عرب مورخین کی متداول اور مشہور کتابوں کا تعلق ہے۔ یہ شکایت بے جا نہیں ہے۔ لیکن علامہ ابو محمد احمد بن اعثم الکوفی المتوفی ۳۱۴ھ مطابق ۹۲۶ء اس عام الزام سے بری ہیں، یہ نہایت بلند پایہ مورخ اور ابن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ کے ہم عصر ہیں،

---

[1] کتاب الفتوح جلد ۲ ص ۱۳۸ - ۱۴۵

[2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام عربی ترجمہ تہران اڈیشن ج ۱۴ ص ۲۵۸

[3] تاریخ عرب دسواں اڈیشن ص ۱۶۷

ان کی نہایت اہم کتاب "کتاب الفتوح" میں مسلمانوں کی بحری جنگوں کا نہایت مفصل بیان موجود ہے لیکن ساری دنیا میں اس کتاب کا جو کئی جلدوں میں ہے صرف ایک نسخہ جو جرمنی کے ایک کتاب خانہ میں تھا، دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن نے بہت بڑا کام کیا کہ اس نسخہ کو حاصل کر کے تاریخ میں پہلی مرتبہ شائع کرنا شروع کیا اور پہلی جلد ۱۹۶۸ء میں، دوسری جلد ۱۹۶۹ء میں، ہلم جرا شائع ہوئی، پروفیسر ہٹی اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کی نظر سے اگر یہ کتاب گزری ہوتی تو وہ علی الاطلاق یہ ریمارک نہیں کر سکتے، ابن اعثم کے متند ہونے کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ صقلیہ کی جنگ کے بارہ میں اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید (جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ اقتباس میں آپ نے دیکھا) رومی سلطنت کے مغربی مورخین کے قلم سے نکلے۔

رومیوں کے زبردست بحری حملہ کی پسپائی

رومی دیکھ رہے تھے کہ اسلام ایک عظیم الشان طاقت سے مشرق میں پھیلتا جا رہا ہے۔ ملک ان کے قبضہ سے نکل کر مملکت اسلامی میں شامل ہو رہے ہیں۔ اب رومی سلطنت کے بحری مراکز بھی ان کے ہاتھ سے نکلنے لگے ہیں۔ اس بناء پر ۳۴ھ میں[1] قیصر روم، قسطنطین بن ہرقل (Constans) ایک عظیم بحری بیڑہ کے ساتھ جو عام مورخین کے بیان کے مطابق پانسو، ابن اثیر کی ایک روایت کے مطابق چھ سو اور ابن اعثم کے بیان کے

---

[1] عام عرب مورخین نے اس حملہ کا سن ۳۱ھ لکھا ہے، لیکن ابن اثیر (ج ۳ ص ۱۱۷ بیروت اڈیشن) نے ۳۱ھ کے ساتھ ۳۴ھ کا بھی ایک قول نقل کیا ہے، ہمارے نزدیک قرین قیاس یہی ہے اور مغربی مصنفین نے ۶۵۵ء لکھا ہے، یہ ۳۴ھ کے ساتھ منطبق بھی ہوتا ہے۔

مطابق ایک ہزار جہازوں پر مشتمل تھا ـــــــ سواحل شام پر فوج کشی کے خیال سے روانہ ہوا۔ شہنشاہ روم خود اس بیڑہ کی قیادت کر رہا تھا، اور تمام جہاز اسلحہ اور جنگی ساز و سامان سے لدے ہوئے تھے حضرت عثمان کو اس کی اطلاع ہوئی تو فوراً ایک طرف امیر معاویہ کو جو پورے شام کے گورنر تھے لکھا کہ تمہارے پاس جو شامی لشکر موجود ہے اسے لے کر روانہ ہو اور دوسری جانب عبداللہ بن سعد بن سرح کو جو مصر کے گورنر تھے حکم بھیجا کہ تم مصر کا لشکر لے کر سمندر میں اترو، ابن اعثم کا بیان ہے کہ ان دونوں کے ساتھ حضرت عثمان نے ایک تیسرا خط عمرو بن العاص کو بھی تحریر فرمایا کہ ان دونوں لشکروں کی مدد کریں۔

اس حکم کے مطابق مصر اور شام کی فوجیں بڑے ساز و سامان اور اسلحہ کے ساتھ پہلے شہر عکا کے شہر پر فروکش ہوئیں، پھر وہاں سے اسلامی بحریہ دونوں نامور کمانڈروں (امیر معاویہ اور عبداللہ) کی مشترکہ قیادت میں پانسو جہازوں کا بیڑہ سمندر میں روانہ ہوا۔ ان جہازوں پر گھوڑے، ہر قسم کے اسلحہ اور میگزین اور ساز و سامان رسد بافراط تمام لدا ہوا تھا۔ اسلامی فوج سمندر میں اتری ہی تھی کہ قیصر روم کے جنگی بیڑہ سے اس کا سامنا ہو گیا، مالک بن اوس بن الحدثان جو خود اس معرکہ میں شریک تھے، ان کا چشم دید بیان ہے کہ اس وقت باد مخالف بڑی تند و تیز چل رہی تھی، پھر ہم نے نظر اٹھا کے دیکھا تو قیصر روم کا نہایت عظیم الشان لشکر گھنگھور گھٹا بنا سمندر کی سطح پر موجزن نظر آیا۔ ہم پر خشوع و خضوع اور بارگاہ خداوندی میں تفرع و ابتہال کا عالم طاری ہو گیا۔ اب ہم نے اپنے جہاز لنگر انداز کیے تو رومی افواج نے بھی ہمارے بالمقابل لنگر ڈال دیئے، اس وقت ہوا رک گئی تھی اور دن بھی چھپ گیا تھا۔ مسلمانوں نے پوری شب تلاوت قرآن اور تسبیح و تہلیل میں بسر کی، ادھر

لشکر رات بھر شراب نوشی اور رقص و سرود میں مصروف رہا۔

صبح ہوئی تو دونوں طرف جنگ کی تیاری شروع ہوگئی۔ اس موقع پر امیر معاویہ اور عبداللہ بن سعد نے شہنشاہ روم کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ نامناسب نہ سمجھیں تو بہتر یہ ہے ہم دونوں ساحل پہ چل کر طاقت آزمائی کرلیں ہم میں جو کمزور ہوگا وہ مارا جائے گا۔ رومی سپاہ نے اس پیش کش کو رد کر دیا اور کہلا بھیجا کہ اب ہمارا اور مسلمانوں کی تقدیر کا فیصلہ جو کچھ بھی ہوگا سمندر میں ہوگا۔ مالک بن اوس بن حدثان کا بیان ہے: اب دونوں لشکروں نے آمنے سامنے ہوکر صف بندی شروع کردی۔ نیزے، تلوار، کمان اور تیر ہر ایک کے ہاتھ میں تھے، جنگ شروع ہوئی تو اس غضب کی گھمسان اور شدید جنگ تھی کہ لم یسمع بمثلہ " ایسی تو کبھی سنی بھی نہیں گئی، نیزہ بازی اور تیر اندازی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ تلواروں اور خنجروں سے دست بدست جنگ ہو رہی تھی۔ دونوں طرف کشت و خون کی افراط اس قدر ہوئی کہ سمندر کا پانی سرخ ہوگیا اور لاشوں کے تودے بن گئے، جنگ ابھی جاری تھی کہ شہنشاہ روم جو خود جنگ کی قیادت کر رہا تھا اچانک اس کا سر اور جسم اس قدر شدید زخمی ہوئے کہ تڑپ کر پیچھے لوٹا اور اپنے بیڑے کا لنگر اٹھا روانہ ہوگیا، اسے دیکھ کر رومی سپاہ کے قدم اکھڑ گئے اور اس نے بھی اس طرح بدحواس ہوکر راہ فرار اختیار کی کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ اب مسلمانوں کا بیڑہ فتح و کامرانی کا پرچم اڑاتا ہوا ساحلِ عکا پر لنگر انداز ہوا۔ امیر معاویہ اور عبداللہ بن سعد نے یہاں سے حضرت عثمان کو فتح کی خوش خبری کا خط لکھا تو آپ نے اسے پڑھ کر مسرت کا اظہار فرمایا[1]

---

[1] یوں تو یہ واقعہ تاریخ کی سب ہی کتابوں میں ہے، لیکن ابن اعثم نے حسب معمول اسے زیادہ تفصیل سے اور عینی شاہد کی سند سے لکھا ہے، چونکہ یہ جنگ خلافت عثمانی کی سب سے (بقیہ صفحہ پر)

بحری جنگ کے نقطۂ نظر سے اس جنگ کی کیا اہمیت تھی؟ اس کا اندازہ پروفیسر فلپ ہٹی کے اس بیان سے ہوگا۔ لکھتے ہیں:

"۶۵۵ء میں معاویہ اور عبداللہ کے مشترکہ شامی اور مصری بیڑہ نے بازنطینی بحری بیڑہ کو جو پانچ سو جہازوں پر مشتمل تھا فانکس (Phœnix) کے قریب لیسین (Lycian) ساحل سے پرے ہٹ کر تباہ و برباد کر دیا۔ قسطنطین دوم جو بنفس نفیس بیڑہ کی قیادت کر رہا تھا بس اپنی جان بچا کے نکل بھاگا، یہ جنگ جو عربی میں ذوالصواری (مستولوں کی جنگ) کے نام سے مشہور ہے بازنطینی حکومت کی بحری برتری کے لئے ایک زبردست چیلنج تھی۔ اسلامی مملکت میں اندرونی اختلافات کے باعث مسلمان افواج قسطنطنیہ کی طرف اپنی پیش قدمی جاری نہ رکھ سکیں، جو دراصل ان کا مطمح نظر تھا[۱]"

متفرق بحری حملے

مذکورہ بالا واقعات کے علاوہ امیر معاویہ، عبداللہ بن سعد اور ان کے نائبین نے چند اور بھی چھوٹے چھوٹے کارنامے کئے مثلاً ابن اثیر کا بیان ہے کہ ۳۲ھ میں معاویہ بن ابی سفیان تنگنائے قسطنطنیہ تک چلے گئے تھے اور اس سفر میں ان کی بیوی عاتکہ بنت قرظہ یا ایک روایت کے مطابق فاختہ ان کے ہمراہ تھیں[۲] علاوہ ازیں بلاذری کا بیان ہے کہ ۳۱ھ میں عبداللہ بن سعد نے نوبیہ پر حملہ کیا مگر مصالحت ہوگئی[۳]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۔) بڑی اور آخری بحری جنگ ہے اس لیے ہم نے کتاب الفتوح ج ۲ ص ۱۲۸۔ ۱۳۰ سے اخذ کر کے اس کا تذکرہ ذرا تفصیل سے کیا ہے۔

[۱] تاریخ عرب ص ۱۶۷

[۲] کامل ج ۳ ص ۱۳۱

[۳] فتوح البلدان ص ۲۳۷ و ۲۳۸

عراق اور ایران میں فتوحات

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ایران کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے بحرین اور ساتھ ہی کوفہ و بصرہ کو ایک فوجی چھاؤنی بنا لیا گیا تھا اور ایران پر حملے شروع ہو گئے اور اصفہان و ہمدان وغیرہ متعدد شہر فتح ہو گئے تھے، انہیں میں ایک شہر اصطخر[1] (Persepolis) بھی تھا لیکن یہ شہر بڑی مشکل سے فتح ہوا تھا۔ پھر بھی حضرت عمرؓ کے بعد ۲۹ھ مطابق ۶۴۹ء میں یہاں بغاوت شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ خراسان تک پھیل گئی۔ حضرت عثمانؓ کو اطلاع ہوئی تو عبداللہ بن عامر کو جو حضرت ابوموسیٰ اشعری کی معزولی کے بعد ابھی بصرہ کے گورنر مقرر ہوئے تھے لکھا کہ ماہک بن شاہک تیس ہزار فوج کے ساتھ خروج کر کے جو علاقے فتح ہو چکے ہیں ان کو مسلمانوں کے قبضہ سے نکالنے

---

[1] اصطخر اس زمانہ میں ایران کا صوبہ فارس کا جو خلیج فارس کے مشرقی کنارہ پر واقع ہے مشہور شہر تھا اور پورے صوبہ کا حاکم اعلیٰ (مرزبان) شہرک نام کا ایک مجوسی سردار تھا۔

کی سعی کر رہا ہے، تم فوراً روانہ ہو جاؤ اور فارس سے لے کر خراسان تک کے تمام شہر فتح کرو۔"

عبداللہ بن عامر ایک لشکر جرار لے کر بصرہ سے روانہ ہوئے، فارس کے قریب پہونچے تھے کہ صحرائے اصطخر میں دشمن سے مقابلہ ہوا۔ صبح سے لے کر ظہر کی نماز کے وقت تک سخت جنگ ہوتی رہی۔ آخر ماہک شکست کھا کر بھاگا، مسلمانوں نے تعاقب کیا، یزید بن الحکم الازدی نے ماہک کے سر پر پہونچ کر تلوار سے اس کا سر قلم کرنا چاہا تھا کہ خواہاں امن ہوا اور اپنا تاج سر سے اتار کر یزید کی طرف پھینک دیا۔ یزید نے تاج اٹھا لیا اور ماہک کو عبداللہ بن عامر کے سامنے پیش کیا۔ عبداللہ بن عامر نے جزیہ ادا کرتے رہنے کی شرط پر ماہک کو اصطخر میں قیام کرنے کی اجازت دے دی۔ اصطخر فارس کا سب سے بڑا اور مرکزی شہر تھا۔ اس کے فتح ہوتے ہی فارس پر قبضہ ہو گیا۔

خراسان کی فتح عبداللہ بن عامر نے حضرت عثمانؓ کی ہدایت اور حکم کے مطابق اب شمال مشرق میں خراسان کا رخ کیا۔ خراسان کی سرحد پر پہونچ کر مجاشع بن مسعود کو کرمان کا گورنر مقرر کر کے ایک ہزار سوار فوج کے ساتھ وہاں روانہ کر دیا۔ خود خراسان کی طرف بڑھے، لشکر کے ہراول کا انچارج احنف بن قیس کو بنایا، یہ لشکر جب نیشاپور پہونچا تو وہاں کے لوگوں نے مقاومت کی، عبداللہ بن عامر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، آخر طوس کے امیر کنادیک نے عبداللہ بن عامر کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ مجھ کو جان کی امان دیں تو میں نیشاپور کی بازیافت میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ عبداللہ بن عامر نے اسے منظور کیا، امیر طوس ایک لشکر لے کر عبداللہ بن عامر کی خدمت میں پہنچا۔ اب دونوں لشکر نیشاپور کی طرف بڑھے۔ نیشاپور کا بادشاہ اسوار ایک فوج گراں کے ساتھ مقابلہ پر آیا۔ کئی روز تک جنگ رہی۔ آخر اسوار نے

نے عبداللہ بن عامر سے جان کی امان لے کر شہر کے سب دروازے کھول دئے اور عبداللہ بن عامر نے نیشاپور پر قبضہ کر لیا[1]۔ اور کنادیک امیر طوس نے جس وفاداری کا مظاہرہ کیا تھا اس کی وجہ سے اس کو نیشاپور کا بھی امیر بنا دیا گیا[2]۔

دیگر فتوحات

مرو کے لوگوں کو جب نیشاپور اور طوس کے فتح ہونے کی خبر پہونچی تو ہمت ہار بیٹھے اور عبداللہ بن عامر کے پاس اپنا ایک سفیر بھیج کر اس شرط پر صلح کی پیش کش کی کہ ایک بہت بڑی رقم تو وہ ابھی نقد ادا کریں گے اور تین لاکھ درہم سالانہ بطور جزیہ کے ادا کرتے رہیں گے۔ عبداللہ بن عامر نے اس پیش کش کو منظور کیا اور عبداللہ بن عوف الحنظلی کو مرو کا امیر مقرر کر کے وہاں بھیج دیا۔ مرو سے فراغت ہوئی تھی کہ ہرات کا بادشاہ جس کا نام کنمود تھا عبداللہ بن عامر کی خدمت میں پہونچا اور اس شرط پر صلح کا خواستگار ہوا کہ ہرات اور فوشنج دونوں اس کے قبضہ میں رہنے دیے جائیں اور وہ ہر سال ایک لاکھ درہم[3] بطور جزیہ کے ادا کرتا رہے گا۔ عبداللہ بن عامر نے اسے منظور کیا اور ہرات کا پروانہ امارت اس کے نام لکھ کر اسے روانہ کر دیا۔ اس کے بعد سرخس کا فرماں روا ماہویہ عبداللہ بن عامر کے پاس آیا اور اس نے بھی یہی درخواست کی کہ سرخس اور اس سے ملحق گاؤں اور دیہات اس کے پاس رہنے دیے جائیں تو وہ اس کے بدلہ میں ہر سال ایک لاکھ درہم ایک ہزار بورے گیہوں کے اور ایک ہزار بورے جو کے ادا کرتا رہے گا۔ عبداللہ بن عامر نے اسے بھی منظور کر کے ماہویہ کو سرخس واپس کر دیا۔

---

[1] کتاب الفتوح ابن اعثم ج ۲ ص ۳ و ۱۰۲

[2] ایضاً [3] کتاب الفتوح ابن اعثم ج ۲ ص ۱۰۴ پر صرف دو ہزار درہم سالانہ لکھا ہوا ہے۔ لیکن یہ صریحاً غلط ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ "صد" کا لفظ اصل میں ہی یا نقل میں رہ گیا ہے۔

اسی طرح باری باری سے نسا اور ابورد کا فرمان روا بیہہ، فاریاب اور طالقان کا فرماں روا اداویہ اور ان کے علاوہ اور بھی آس پاس کے علاقوں کے حاکم عبداللہ بن عامر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اپنے علاقہ کی طرف سے سالانہ ایک معین رقم بطور جزیہ ادا کرنے کی شرط پر جان کی امان اور صلح کے خواہاں ہوئے اور عبداللہ بن عامر نے ان شرائط کو منظور کر کے ان سب علاقوں پر ان لوگوں کی امارت کو بحال رکھا اور انہیں وہاں واپس کر دیا۔[1]

---

[1] ایضاً

سیستان اور کابل کی فتح

سیتان کو عربی میں سجستان کہتے ہیں، ایران کا ایک بڑا صوبہ تھا۔ اس کے حدود اربعہ یہ ہیں۔ شمال میں ہرات، جنوب میں مکران، مشرق میں سندھ اور مغرب میں کوہستان۔ اس کا مشہور شہر زرنج تھا جہاں میوہ کثرت سے پیدا ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کے بالکل آخری سال ۲۳ھ میں عاصم بن عمر کے ہاتھ فتح ہو چکا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے عہد میں عراق عجم میں بغاوت کی جو لہر پیدا ہوئی اس کی لپیٹ میں سیتان بھی آگیا تھا، اسی لئے عبداللہ بن عامر نے فارس اور خراسان کی مہم سے فارغ ہو کر اس طرف توجہ کی اور اپنے چچیرے بھائی عبدالرحمٰن بن سمرہ بن جندب کو ایک لشکر کے ساتھ سیتان کی مہم پر روانہ کر دیا۔ عبدالرحمٰن جب شہر زرنج کے قریب پہونچے تو اہل شہر نے مقاومت کی، دونوں فریق میں سخت جنگ ہوئی آخر کار اسلامی لشکر فتحیاب ہوا اور شہر پر بزور

لہ ایضاً

شمشیر قبضہ ہوگیا۔

اب عبدالرحمٰن بن سمرہ نے اپنے لشکر کے مشورہ سے کابل کا ارادہ کیا۔ اور وہاں پہونچ کر شہر کے بیرونی میدان میں خیمہ لگادیا۔ شاہ کابل جو اعرج کے لقب سے مشہور تھا ایک لشکر جرار لے کر شہر سے نکلا اور لشکر اسلام سے نبرد آزما ہوا، سخت جنگ ہوئی لیکن پھر بھی کوئی فیصلہ نہ ہوا تو شاہ کابل اپنی فوج کو لے کر شہر میں واپس آیا اور حصار بند ہوگیا۔ اب اس نے یہ معمول کر لیا کہ جب کبھی موقع پاتا قلعہ سے باہر نکل کر جنگ کرتا اور پھر لوٹ کر حصار بند ہو جاتا، کامل ایک برس تک یہ کیفیت رہی، اس مدت میں عبدالرحمٰن اور اس کے لشکر کو سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، آخر کار بزور شمشیر شہر فتح ہوا۔ شاہ کابل گرفتار ہو کر عبدالرحمٰن کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ عبدالرحمٰن نے نہ صرف یہ کہ جان بخشی، بلکہ اس کی حیثیت کے مطابق اس کا احترام ملحوظ رکھا۔ اور سیستان و کابل کی فتح سے مطلع کرنے کے ساتھ مال غنیمت جو کچھ ہاتھ آیا تھا اس کا پانچواں حصہ بھی عبداللہ بن عامر کے پاس روانہ کر دیا اور خود اپنے لشکر کے ساتھ کابل میں قیام کیا۔[۱]

آل ساسان کی آخری یادگار

جس زمانہ میں اسلامی فوجیں خراسان کے حدود میں تنگ و تاز کر رہی تھیں، ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ آل ساسان کی آخری یادگار یزدگرد بن شہریار بن کسریٰ جو خلافت فاروقی میں مدائن کی جنگ میں شکست کھا کر بھاگا تھا، شہر بہ شہر پھرتا رہا۔ چنانچہ مدائن سے حلوان گیا پھر یہاں سے بھی نکلا تو اصفہان آیا، اصفہان بھی فتح ہوا تو اصطخر پہونچا جب اصطخر پر بھی اسلامی علم لہرانے لگا تو یہاں سے نکل کر کرمان کی راہ لی، کرمان میں

---

[۱] کتاب الفتوح ج ۲ ص ۶ و ۱۰۵

بھی اسے تقدیر کا ستارہ گردش میں نظر آیا تو وہاں سے سیتان اور سیتان سے خراسان پہونچا۔ خراسان کے شہر مرو میں ۲۹ھ یا ۳۰ھ میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ کیسے؟ اس سلسلے میں مختلف روایتیں ہیں جن کو طبری اور بلاذری نے یکجا کر دیا ہے، لیکن عام طور پر مشہور یہی ہے کہ یزدگرد نے مرو میں ایک شخص کے گھر میں پناہ لی تھی جو آٹا پینے کی چکی چلاتا تھا، اس شخص کی نظر یزدگرد کے تاج پر پڑ گئی اور اس نے اس کے لالچ میں ماہویہ جو مرو کا مرزبان (حاکم اعلیٰ) تھا اس کے ایما اور اشارہ پر یزدگرد کو قتل کر دیا[1]

اس طرح ایران کی شہنشاہیت جو ایک معمولی وقفہ کے ساتھ مسلسل بارہ صدیوں تک بڑی شان اور شوکت کے ساتھ قائم رہی تھی اس کا مکمل خاتمہ بھی خلافت عثمانی کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۳۱۲

آذربائیجان اور آرمینیہ پر فوج کشی

سنہ ۲۴ھ میں یعنی حضرت عثمان کی خلافت کے پہلے سال میں ہی خبر آئی کہ آذربائیجان[1] اور آرمینیہ[2] جو خلافت فاروقی میں فتح ہو گئے تھے حضرت عمر کی شہادت..... کی خبر سن کر باغی ہو گئے ہیں۔ حضرت عثمان کو اس کا علم ہوا تو فوراً امیر معاویہ کے نام حکم بھیجا کہ اس کا بند و بست کریں۔ امیر معاویہ نے قریش کے نامور جنرل حبیب بن مسلمۃ الفہری

---

[1] آذربائیجان سوویت روس کے ماتحت ایک جمہوریت کی حیثیت سے پہلے سنہ ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی تھی، کچھ ہی دنوں کے بعد اس کو آرمینیہ اور جارجیا کے ساتھ ملا کر ٹرانس کاکیشین فیڈریشن کا ایک جز بنا دیا گیا، سنہ ۱۹۳۶ء میں اس کو بھی ختم کر کے دوسری خود مختار جمہوریتوں کی طرح اسے بھی ایک جمہوریت قرار دے دیا گیا ہے، جس عہد کا ذکر ہے اس زمانہ میں آذربائیجان ایران کا ایک صوبہ اور مجوسیوں کا مرکز تھا، چنانچہ آتش کدوں کے باعث اس کا اصل نام "آذربائیگان" تھا، عربوں نے اس کو آذربائیجان بنا لیا، تبریز اس صوبہ کا صدر مقام اور اردبیل (باقی صفحہ ۔ پر)

کو چار ہزار سوار اور دو ہزار پیادہ فوج دیکر آذر بائیجان کے لیے روانہ ہوجانے کا حکم دیا۔ حبیب بن مسلمہ نے تعمیل کی اور شام سے روانہ ہوگئے۔ جب یہ فوج مقام شمشاط کے قرب و جوار میں پہونچی تو اطلاع ملی کہ مرزبان یعنی حاکم علاقہ کم وبیش تیس ہزار فوج لیے شمشاط میں پڑا ہے۔ حبیب بن مسلمہ نے اس کیفیت سے امیر معاویہ کو مطلع کیا اور امیر معاویہ نے حضرت عثمان کو لکھا تو حضرت عثمان نے ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو جو کوفہ کا گورنر تھا حکم بھیجا کہ کوفہ کے دس ہزار مجاہدین کی ایک فوج سلمان بن ربیعہ الباہلی کی قیادت میں حبیب بن مسلمہ کی مدد کے لیے فوراً روانہ کردی جائے۔ ولید بن عقبہ نے تعمیل کی[1] طبری[2] اور بلاذری[3] کا بیان ہے کہ اس فوج کا جنرل کمانڈر خود ولید بن عقبہ تھا۔ اگرچہ مختلف دستے الگ الگ دوسرے قائدین جنگ کے ماتحت تھے۔ اس موقع پر ابن اعثم کا بیان تو یہ ہے کہ ولید بن عقبہ کا لشکر ابھی پہونچا بھی نہیں تھا کہ شامی لشکر نے حبیب بن مسلمہ کی قیادت میں اچانک اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن لپسپا ہوگیا لیکن دوسرے مورخین اس فتح کا سہرا ولید بن عقبہ کے سر باندھتے ہیں، چنانچہ طبری کا بیان ہے کہ ولید بن عقبہ نے اہل آذر بائیجان سے آٹھ لاکھ سالانہ درہم پر مصالحت کرلی حضرت

بقیہ حاشیہ:۔ خاص شہر تھا[2] ارمینیہ بھی اب سوویت روس کے رقبہ میں شامل ہے۔ قدیم زمانہ میں جغرافیہ نویس ایران کو دو حصوں میں تقسیم کرتے تھے: شمالی اور جنوبی، پھر جنوبی کو چھ اقالیم پر اور شمالی ایران کو ۱۲ اقالیم پر تقسیم کرتے تھے، ان بارہ اقالیم میں سے اقالیم اول میں ارمینیہ اور اقلیم ثانی میں آذر بائیجان شامل تھے۔ (صبح الاعشیٰ قلقشندی ج ۴ باب مملکت ایران)

[1] کتاب الفتوح ابن اعثم ج ۲ ص ۱۰۸

[2] طبری ج ۴ ص ۲۴۶۔

[3] فتوح البلدان ص ۳۲۳

[4] طبری ج ۴ ص ۲۴۷

عمر کے عہد ۲۲ھ میں حذیفہ بن الیمان نے جب آذربائیجان فتح کیا تھا تو اتنی ہی رقم پر صلح کی تھی۔[1]

جب آذربائیجان کا معرکہ فتح ہو گیا تو اب سلمان بن ربیعہ الباہلی کے نام حضرت عثمان کا حکم پہونچا کہ بلاد ارمینیہ کی طرف پیش قدمی کریں، سلمان بن ربیعہ اپنی عراقی فوج کے ساتھ آگے بڑھے تو ارمینیہ کے راستے میں چھوٹے بڑے جتنے شہر اور قلعے پڑے ان سب کو صلحاً فتح کرتے ہوئے پیش قدمی کرتے رہے، یہاں تک کہ جب وہ بلنجر نامی شہر میں پہونچے تو ان علاقوں کا بادشاہ جو خاقان کہلاتا تھا اس نے تین لاکھ فوج کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مسلمان دشمن کی ٹڈی دل فوج سے بڑی بہادری سے لڑے، لیکن دس ہزار اور تین لاکھ کا کیا مقابلہ ہو سکتا تھا۔ ابن اعثم کا بیان ہے "حتی ما بقی من المسلمین احد" مسلمان اس جی داری اور ہمت سے لڑے کہ لڑتے لڑتے سب ختم ہو گئے اور ان میں سے ایک بھی نہیں بچا، چنانچہ ان سب شہدا کی قبریں آج بھی بلنجر میں موجود ہیں۔

حضرت عثمان کو اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ہوئی تو سخت غمگین اور مضطرب ہوئے، یہاں تک کہ رات کی نیند اڑ گئی، اور اب حبیب بن مسلمہ کو حکم بھیجا کہ وہ ارمینیہ کا رخ کریں، حبیب بن مسلمہ نے تعمیل کی اور صرف چھ ہزار کا ایک لشکر جس میں سوار بھی تھے اور پیادہ بھی، اسے لے کر روانہ ہو گئے، راستے میں چھوٹے بڑے جو شہر اور قلعے ملتے رہے انھیں صلح کے ذریعے مفتوح بناتے چلے گئے، یہاں تک کہ ایک مقام پر جس کا نام سراج تھا اور جو آرمینیہ کا ایک حصہ تھا، پہونچے تو وہاں کے روسا اور اعیان و امرا نے اسی ہزار درہم سالانہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔ اب حبیب بن مسلمہ نے اسی شہر کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا اور یہیں سے رفتہ رفتہ ارمینیہ کے مختلف علاقوں میں فوجی دستے پہونچ پہونچ کر ان

---

[1] طبری ج ۳ ص ۲۴۷

پر قبضہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ پورا ارمینیہ ہی زیرنگیں آگیا[1]

غرض کہ خلافت عثمانی کے بارہ برسوں میں مغرب میں مراکش سے لیکر مشرق میں کابل تک کا پورا طویل وعریض علاقہ مملکت اسلامیہ کا جزبن گیا۔ پروفیسر ہٹی لکھتے ہیں:

فارس کی فتح کے بعد عظیم الشان اور دورافتادہ صوبہ خراسان کی باری آئی جب وہ بھی فتح ہوگیا تو علاقۂ ماوراءالنہر کے لیے راستہ صاف تھا، علاوہ ازیں مکران جو بلوچستان کا ساحلی علاقہ ہے اس کی فتح نے عربوں کو ہندوستان کی سرحد کے بالکل دہانہ پر پہونچادیا[2]

ہندوستان پر فوج کشی کا ارادہ چونکہ فتوحات فاروقی کا قدم ہندوستان کی سرحد تک پہونچ چکا تھا اس بنا پر جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور عبداللہ بن عامر کو عراق کا گورنر بنایا تو عبداللہ کو حکم بھیجا کہ وہ ہندوستان کی سرحد کی طرف کسی ایسے شخص کو روانہ کرے جو اس ملک کے حالات سے باخبر ہو اور جب وہ واپس آئے تو اسے بارگاہ خلافت بھیجدیا جائے، اس حکم کے مطابق عبداللہ بن عامر نے حکیم بن جبلہ العبدی کو ہندوستان بھیجا اور جب وہ واپس آئے تو انھیں حضرت عثمانؓ کے پاس روانہ کردیا، جب یہ یہاں پہونچے تو حضرت عثمانؓ نے ہندوستان کے حالات دریافت کئے۔ حکیم بن جبلۃ العبدی نے کہا: امیرالمومنین!

---

[1] یہ واقعات جس تفصیل سے کتاب الفتوح ابن اعثم میں مذکور ہیں۔ کسی اور کتاب میں نہیں اس لیے ہم نے اسی سے نقل کئے ہیں۔ ج ۲ ص ۱۱۱۔۱۱۴

[2] تاریخ عرب ص ۱۵۷، آج کل مکران کا نصف علاقہ بلوچستان کا جز ہے، حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری سال یعنی ۲۳ھ میں حکم بن عمرو التغلبی کے ہاتھوں فتح ہوا تھا اور اس کو فتوحات فاروقی کی آخری حد مشرق میں سمجھنا چاہیے۔

میں نے ہندوستان کے شہروں کو خوب کھنگالا اور ان کی معرفت حاصل کی ہے،
حضرت عثمان نے فرمایا: اچھا، تو بیان کرو، انھوں نے کہا:

ماؤها وشلٌ، وثمرها دَقَلٌ، ولصها بَطَلٌ، ان قَلَّ الجیش ضاعوا وان کثروا جاعوا۔
اس ملک میں پانی کم ہے۔ اس کے پھل نکمے ہیں یہاں کے چور دلیر ہیں، اگر ہمارا لشکر تھوڑا ہوا تو ضائع ہوجائے گا اور بڑا ہوا تو بھوکوں مرجائے گا

حضرت عثمان نے پوچھا: تم خبر دے رہے ہو یا سجع بندی کر رہے ہو!" حکیم نے کہا "میں آپ کو صحیح خبر دے رہا ہوں" حضرت عثمان یہ سن کر خاموش ہو گئے اور ہندستان پر لشکر کشی کا ارادہ فسخ کردیا[۱]

فتوحات میں وسعت اور ان میں استحکام کے علاوہ اس سلسلے میں خلافت عثمانی کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس میں بحری جنگ کی ابتدا ہوئی اور ساتھ ہی اس درجہ مضبوط اور طاقتور بحری بیڑہ تیار ہوا کہ بازنطینی حکومت جس کا اس زمانہ میں سمندر پر سب سے بڑا اقتدار تھا، اس کے چھکے چھڑا دیئے اور بحر روم میں اس کی طاقت کو فنا کردیا۔ اس بحری بیڑے کے مرکز دو تھے، ایک سواحلِ شام اور دوسرا اسکندریہ، اول الذکر کے کمانڈر حضرت معاویہ بن ابی سفیان تھے اور ثانی الذکر کے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، یہ دونوں تاریخ اسلام کے پہلے امیر البحر ہیں اور وہ بھی اس شان کے کہ جس طرف رخ کرلیا مطلع صاف ہوگیا، مستشرقین نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری باب فتوح السند

نظم ونسق مملکت

حضرت عمرؓ نے وصیت کی تھی کہ جو شخص ان کا جانشین ہو وہ سال بھر تک ان کے مقرر کئے ہوئے گورنروں کو ان کے عہدوں پر قائم رکھے اور اس میں کوئی تبدیلی نہ کرے، حضرت عثمانؓ نے فاروق اعظم کی اس وصیت پر پورا عمل کیا۔ چنانچہ فاروق اعظم کی وفات کے وقت یہ حضرات گورنر تھے۔

مقام	گورنر کا نام	کیفیت
مکہ مکرمہ	نافع بن عبدالحارث الخزاعی	غیر قریشی
طائف	سفیان بن عبداللہ الثقفی	
صنعاء	یعلی بن منبہ	صلبی اعتبار سے قریشی نہیں ہیں۔ بنو نوفل بن عبدمناف کے حلیف ہیں۔
جند	عبداللہ بن ابی ربیعہ	قریشی ہیں اور بنو مخزوم سے ہیں۔
کوفہ	مغیرہ بن شعبہ	بنو ثقیف سے ہیں۔
بصرہ	ابو موسی اشعری	یہ یمن کے ہیں

کیفیت	گورنر کا نام	مقام
قرشی اور اموی ہیں	عمرو بن العاص	مصر
انصاری	عمیر بن سعد	حمص
قریشی اور اموی	معاویہ بن ابی سفیان	دمشق
بنو کنانہ سے ہیں	عبدالرحمٰن بن عقبہ	فلسطین
بنو ثقیف سے ہیں	عثمان بن ابی العاص	بحرین

حضرت عثمان نے ایک برس تک اسی نظام میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا۔

جمہوریت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فاروق کی طرح حضرت عثمان کا نظام حکومت بھی قطعاً جمہوری تھا ایک جمہوری حکومت کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ فرمانروائے مملکت اور عوام دونوں قانون کی نگاہ میں یکساں ہوں اور ان میں کوئی فرق امتیاز نہ ہو۔ حضرت عثمان کے عہد میں ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی تھی۔ جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ حضرت عمر نے تو اکابر مہاجرین و قریش پر پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ مدینے سے باہر بغیر اجازت کے نہیں جا سکتے تھے لیکن حضرت عثمان نے یہ پابندی اٹھا دی اور اب ہر شخص آزاد تھا کہ جہاں چاہے جائے، جس شہر میں مکان چاہے بنائے، اور جو پیشہ چاہے اختیار کرے، جہاں تک راعی اور رعایا کے یکساں حقوق کا تعلق ہے۔ اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان نے اہلِ کوفہ کے نام ایک گشتی مراسلہ اس مضمون کا بھیجا کہ جس کسی شخص کا کوئی حق، درہم و دینار یا زد و کوب کی صورت میں میرے ذمہ ہو وہ یہاں آئے، اور اپنا حق مجھ سے وصول کرے یا مجھے معاف کر دے تو یہ صدقہ ہوگا، اور اللہ تعالےٰ صدقہ کرنے والوں کو جزائے خیر عطا فرمائے گا، راوی کا بیان ہے کہ بعض لوگوں نے یہ اعلان عام سنا تو ان پر گریہ طاری ہو گیا اور بولے "تصدقنا" ہم نے صدقہ کر دیا۔ (حاشیہ صفحہ ۱۲۸ پر)

اسی طرح کعب بن عبیدہ نام کا ایک شخص کوفہ میں تھا جو اشتر نخعی اور اس کی جماعت کے لوگوں سے متاثر تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی ترنگ میں امیر المومنین کے نام ایک خط لکھا جس میں اس نے بزعم خود نہایت تند و تیز لہجے میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دیا تھا۔ حضرت عثمان نے یہ خط پڑھا تو ناگواری ہوئی اور مدینہ بلوا کر اس سے بازپرس کی۔ اس پر کعب اور زیادہ برہم ہوا اور نہایت بدتمیزی اور گستاخی سے پیش آیا۔ حضرت عثمان نے اس کو بیس کوڑوں کی سزا دی اور سعید بن العاص گورنر کوفہ کو لکھا کہ اسے قید میں ڈال دیا جائے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد حضرت عثمان کو کچھ خیال آیا تو آپ نے سعید کو لکھا کہ کعب بن عبیدہ کو قید سے رہا کر کے فوراً میرے پاس بھیج دو، وہ مدینہ آیا امیر المومنین نے اس سے کہا کہ تم نے مجھ کو نصیحتیں کی تھیں، اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے، لیکن تمہارا لب و لہجہ سخت گستاخانہ اور بدتمیزی کا تھا، اس پر مجھ کو غصہ آگیا اور میں نے تم کو کوڑے لگائے، اب میں اس پر نادم ہوں، لو یہ کوڑا موجود ہے۔ تم اٹھاؤ اور مجھ سے اپنا انتقام لے لو، اس پر کعب کی گردن شرم سے جھک گئی اور قصاص معاف کر دیا[۱]

مسجد نبوی تنگ ہو گئی، لوگوں نے حضرت عثمان سے اس میں اضافہ کرنے کی درخواست کی آپ نے صحابہ کرام کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ مروان بن حکم موجود تھا۔ اس نے کہا: امیر المومنین! آپ کے قربان! اس معاملہ میں مشورہ کی کیا ضرورت تھی، عمر فاروق نے مسجد میں اضافہ کا ارادہ کیا تو کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کیا تھا" حضرت عثمان یہ

صفحہ ۔۔ کا حاشیہ) [۱] العقد الفرید ج ۴ ص ۲۹۰

[۱] کتاب الفتوح ابن اعثم الکوفی، دائرۃ المعارف، حیدرآباد ج ۲ ص ۱۸۱-۱۸۸

سن کر برہم ہو گئے، فرمایا: خاموش! عمر کا معاملہ یہ تھا کہ لوگ ان سے اس درجہ خوف کھاتے تھے کہ اگر وہ لوگوں سے کہتے کہ گو (ایک بلی کی شکل کا جانور جسے عربی میں ضب کہتے ہیں اور جو دھوکہ دینے میں ضرب المثل ہے) کے بھٹ میں گھس جاؤ تو لوگ اس میں گھس جاتے، لیکن میرا معاملہ یہ ہے کہ میں نرم خو ہوں، اس لئے محتاط رہتا ہوں کہ وہ احتجاج نہ کریں [1]

غور کرنا چاہیئے کہ خلیفۂ سوم کی جمہوریت پسندی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

حضرت عمر نے اپنے دہ سالہ دور خلافت میں نظم ونسق مملکت اور دفتری وآئینی نظم وترتیب کا جو اعلیٰ معیار اور نمونہ قائم کر دیا تھا فوری طور پر اس پر بھی کوئی اضافہ ممکن نہ تھا۔ اس لیے حضرت عثمان نے اسے جوں کا توں باقی رکھا، البتہ ضرورت اور حالات کے ماتحت جزوی طور پر اس میں وقتاً فوقتاً تغیر وتبدل کرتے رہے اور ایک ارتقا پذیر معاشرہ میں ایسا ہونا ناگزیر ہے، ان تبدیلیوں کا ذکر آگے آئے گا۔

عام عمال کے نام ہدایات

خلیفہ ہونے کے بعد حضرت عثمان نے مختلف طبقات عمال اور عوام کے نام جو ہدایات ارسال کی ہیں ان سے ان کی پالیسی اور ان کے مطمح نظر کا پتہ چلتا ہے، اس لیے ہم ذیل میں ان کا خلاصہ نقل کرتے ہیں۔ عمال کے نام آپ نے ایک عام ہدایت نامہ بھیجا تھا اس میں فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سربراہوں کو امر کیا ہے کہ وہ لوگوں کے پاسبان بنیں اور ان سے یہ نہیں کہا کہ تم محصول وصول کیا کرو، اس امت کا پہلا گروہ پاسبان عالم ہی تھا نہ کہ ٹیکس وصول کرنے والا، مگر ہاں! وہ قریب قریب آگیا ہے جب کہ تمہارے

---

[1] وفاء الوفاء، سمہودی ج ۲ ص ۵۰۸

سربراہ ایسے نہیں رہیں گے، اس وقت حیا، امانت اور وفاءِ عہد ان سب کا خاتمہ ہوجائے گا میں تم سب کو تاکید کرتا ہوں کہ انصاف کی بات یہی ہے کہ تم مسلمانوں کے معاملات میں خوب غور کرو، پھر جو ان کا حق ہو وہ ان کو دو اور جو ان پر واجب ہو وہ ان سے لو، پھر رہ گئے دشمن! تو ان سے بھی تم نے جو وعدہ کرلیا ہے اسے پورا کرو۔[1]

عمال خراج کے نام اللہ تعالیٰ نے خلق کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس لیے بجز حق وہ کسی اور چیز کو قبول نہیں کرتا۔ اس بنا پر تم لوگ حق لو اور حق دو، امانت اور راست بازی کا ہمیشہ خیال رکھو، اس پر قائم رہو، جس سے جو وعدہ کرو اسے پورا کرو۔ یتیم اور جس سے عہد و پیمان ہے ان پر ظلم نہ کرو، کیوں کہ جو شخص ان پر ظلم کرتا ہے خدا خود اس کا مدعی ہوجاتا ہے۔[2]

عام مسلمانوں کے لیے ہدایت نامہ عام مسلمانوں کے نام آپ نے جو تحریر بھیجی اس میں فرمایا: پس دیکھو اس مرتبہ اور مقام تک جو پہونچے ہو تو اقتدار اور پیروی (حق) سے پہونچے ہو، پس دیکھو کہیں دنیا تم کو راہ سے بے راہ نہ کردے، کیونکہ اس امت میں جب تین چیزیں جمع ہوجائیں گی تو اس میں نئی نئی باتیں پیدا ہوجائیں گی، اور وہ تین چیزیں یہ ہیں، نعمتوں کا مکمل ہوجانا، جواری اور کنیزوں سے تم لوگوں کی اولاد کا بالغ ہوجانا۔ اور اعراب واعجام کا قرآن پڑھنا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "الکفر فی العجمۃ" قرآن کے الفاظ کا صحیح طور پر تلفظ نہ کرنا کفر کا موجب ہوسکتا ہے، کیونکہ عجمی لوگ جب صحیح تلفظ نہیں کرسکتے تو نئی نئی بدعتیں کرتے ہیں۔

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۴۵

[2] ایضاً

[3] ایضاً

سرحدوں پر فوجوں کے کمانڈروں کے نام

"تم لوگ مسلمانوں کی حمایت اور ان کی طرف سے دفاع کرنے والے ہو، عمر نے تمہارے لیئے کچھ قوانین بنائے ہیں جو ہم سے مخفی نہیں ہیں بلکہ وہ ہمارے مشوروں سے ہی بنائے گئے ہیں، اس بنا پر مجھ کو یہ اطلاع نہیں ملنی چاہیئے کہ تم نے ان میں کچھ تغیر و تبدل کر دیا ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تعالٰے تمہارے مرتبہ و مقام میں تبدیلی پیدا کر دے گا اور تمہاری جگہوں پر دوسروں کو لاکر بٹھا دے گا۔ اس لیئے تم اچھی طرح دیکھ لو کہ تم کو کیسا بن کے رہنا ہے، ادھر میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالٰے نے جو ذمہ داری میرے سپرد کی ہے اس کے تقاضے کیا ہیں اور ان سے کس طرح عہدہ برآ ہونا ہے [۱]

عام مسلمانوں کے نام پیغام

عمال و منصب داران حکومت کے علاوہ حضرت عثمان نے شہر شہر عام مسلمانوں کے نام بھی ایک الگ پیغام بھیجا جس میں آپ نے فرمایا: "تم سب لوگ معروف پر قائم رہو اور منکر سے بچو، اور کوئی مسلمان اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے: میں قوی کے بالمقابل ہر کمزور شخص کا اس وقت تک ساتھ دوں گا جب تک وہ مظلوم ہے انشاءاللہ تعالٰے [۲]

عمال کے کاموں کی نگرانی

حضرت عثمان نے محض زبانی یا تحریری وعظ و نصیحت پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ عمال کے کاموں کی کڑی نگرانی کرتے اور ان پر نظر رکھتے تھے۔ ہر سال حج کو تشریف لے جاتے۔ تمام عمال کو اور جن لوگوں کو عمال سے شکایت ہوتی ان کو تاکید تھی کہ حج کے موقعہ پر خلیفۂ وقت سے ملیں [۳]

---

[۱] ایضاً

[۲] طبری ج ۴ ص ۳۹۷

[۳] ایضاً

اس کے علاوہ یوں بھی دور دراز کے صوبوں میں کیا ہو رہا ہے اس کی ذرا ذرا خبر رکھتے تھے، چنانچہ جب حضرت عثمان کو معلوم ہوا کہ ابن ذی الحبکہ النہدی نامی ایک شخص ٹونے ٹوٹکے سے علاج کرتا ہے اور آپ نے کوفہ کے گورنر ولید بن عقبہ کو لکھا کہ اس معاملے کی تحقیق کی جائے اور اگر یہ سچ ہو تو ابن ذی الحبکہ کی گوشمالی کی جائے، تو راوی کا بیان ہے لوگوں کو سخت تعجب ہوا کہ حضرت عثمان مدینہ میں بیٹھے دور دور کی خبر رکھتے تھے[۱]

حضرت عثمان کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع کرنے سے پہلے لوگوں سے ملک کے اطراف واکناف کی خبریں پوچھتے اور وہ بیان کرتے تو انھیں توجہ سے سنتے تھے[۲] خاص خاص حالات میں ممالک محروسہ اسلامیہ میں تحقیقاتی وفود بھی بھیجے اور ان سے رپورٹ لیتے تھے، چنانچہ جب حضرت عثمان کے خلاف مصر وشام اور عراق میں شورش بڑھی تو آپ نے تحقیق حال کے لیے کبار صحابہ میں سے محمد بن مسلمہ کو کوفہ، اسامہ بن زید کو بصرہ عمار بن یاسر کو مصر، عبداللہ بن عمر کو شام اور دوسرے حضرات کو دوسرے مقامات کی طرف روانہ کیا[۳]

تنفیذ احکام

پھر اگرچہ حضرت عثمان طبعاً نرم خو، عفو درگذر کی طرف مائل تھے اور حضرت عمر کی طرح متشدد نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود امور نظم ونسق حکومت میں کسی قسم کی مداہنت اور چشم پوشی کے روادار نہیں تھے، کسی کے خلاف اگر کوئی بات ان کے علم میں آتی تو اس کی تحقیق کرتے اور تحقیق سے ثابت ہو جاتی تو بڑی سے بڑی شخصیت کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے میں انھیں تامل نہیں ہوتا تھا، حضرت سعد بن ابی وقاص

---

۱ الفباص ۱۰۲

۲ مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۷۳

۳ طبری ج ۴ ص ۳۴۱

عشرہ مبشرہ اور السابقون الاولون میں شامل تھے لیکن جب انھوں نے بیت المال سے ایک بیش قرار رقم عبداللہ بن مسعود سے جو خزانچی (Treasurer) کے عہدہ پر فائز تھے ادھار لی اور عبداللہ بن مسعود کے تقاضے اور مطالبے کے باوجود اسے ادا نہ کر سکے اور معاملہ حضرت عثمان کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے سعد بن ابی وقاص کو فوراً کوفہ کی گورنری سے معزول کر دیا۔ یہ واقعہ ۲۵ھ کا ہے، یعنی حضرت سعد کو گورنر ہوئے ابھی ایک برس ہی ہوا تھا[1]

حضرت عمرو بن العاص کی معزولی

اسی طرح عمرو بن العاص بڑے جاہ و جلال کے فاتح مصر تھے اور حضرت عمر کے زمانہ سے مصر کے گورنر بھی تھے، لیکن جب حضرت عثمان نے یہ محسوس کیا کہ مصر سے جتنا خراج آنا چاہیئے نہیں آرہا ہے تو عمرو بن العاص کے احتجاج کے باوجود ان کو معزول کر کے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا گورنر مقرر کر دیا[2]

ولید بن عقبہ کی معزولی اور سزایابی

حضرت سعد بن ابی وقاص کی معزولی کے بعد ولید بن عقبہ بن ابی معیط جو خلافت فاروقی میں عرب الجزیرہ کے عامل رہ چکے تھے کوفہ کے گورنر مقرر ہوئے، لیکن کوفہ اور بصرہ کے لوگوں کی فطرت عجیب وغریب تھی، جو شخص ان کے ہاں گورنر مقرر ہو کر آتا تھا شروع میں اس سے خوش رہتے اور اس کی تعریف کرتے تھے، لیکن چند سال گزرتے ہی اس سے بیزار ہو جاتے۔ چنانچہ ولید بن عقبہ کے ساتھ بھی ان کا معاملہ یہی ہوا، طبری کا بیان ہے کہ اول اول جب ولید بن عقبہ کوفہ آئے تو لوگ ان سے بے حد خوش تھے اور

---

[1] ایضاً ص ۲۵۲

[2] ابن اثیر ج ۳ ص ۳۱

ان سے محبت کرتے تھے پانچ برس تک یہی کیفیت رہی [1] پھر ان لوگوں کی طبیعت حسب معمول برگشتہ ہوگئی۔ یہاں تک کہ ایک جماعت نے باقاعدہ منصوبہ بنا کر دربار خلافت میں منصوبہ بنا کر ولید بن عقبہ کی شراب نوشی کی شکایت پہونچائی۔ حضرت عثمان نے اس کی تحقیق کی تو اگرچہ الزام صاف طور پر ثابت نہیں تھا کیونکہ ایک شخص بھی شراب نوشی کا عینی شاہد نہیں تھا۔ تاہم رفع شر کے خیال سے حضرت عثمان نے ولید بن عقبہ کو گورنری سے معزول کر دیا اور سزا کا معاملہ حضرت علی کے سپرد کر دیا [2]۔ امام حسن کو جب اس کی اطلاع ہوئی کہ سزا کا معاملہ حضرت علی کے سپرد کیا گیا ہے تو فرمایا: دَلِ حارھا من تولی قارھا، یہ عربی کا ایک محاورہ ہے وضع الشئ فی محلہ کے موقع پر بولتے ہیں [3]۔

امور شریعت میں عدم مداہنت

حضرت عثمان امور شریعت میں مداہنت کے بالکل روادار نہ تھے، کسی شخص میں اگر یہ عیب پاتے تو اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرتے چنانچہ ولید بن عقبہ کے اس معاملہ میں تحقیق حال کے لیے حضرت عثمان نے اپنے غلام حمران کو متعین کیا تھا لیکن جب آپ کو یہ اطلاع ملی کہ حمران نے ولید بن عقبہ سے رشوت لے لی ہے اور اس کی شہادت جھوٹی ہے تو آپ کو حمران پر سخت غصہ آیا اور اس سے فرمایا: "اب میں اور تم دونوں کبھی ایک جگہ نہیں رہ سکتے، اس لیے مدینے سے باہر جہاں کہیں تمہارا جی چاہے

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۷۱

[2] صحیح البخاری کتاب المناقب باب فضائل عثمان، طبری میں یہ واقعہ نہایت مفصل مذکور ہے۔ اس کی روئداد سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ ولید بن عقبہ کے خلاف ایک سازش کا نتیجہ تھا۔

[3] المستقصی فی امثال العرب زمخشری ج ۲ ص ۳۸۱

چلے جاؤ" حمران نے بصرہ پسند کیا تو حضرت عثمانؓ نے وہاں رہنے کے لیے انھیں ایک متوسط درجہ کا گھر عنایت فرما دیا۔[۱]

حرث بن الحکم حضرت عثمان کا چچازاد بھائی اور داماد تھا۔ حضرت عثمان نے اس کو محتسب مقرر کیا تھا۔ یعنی اس کا کام یہ تھا کہ بازار میں اشیائے خرید و فروخت ان کی قیمتوں اور دکان داروں کے باٹوں، پیمانوں اور سکوں کی نگرانی رکھیں تاکہ بائع اور مشتری کسی کو شکایت کا موقع نہ ہو، لیکن اس رشتہ داری اور قرابت کے باوجود جب حضرت عثمان کو اس کا علم ہوا کہ حرث بن الحکم اپنے فرائض منصبی ایمان داری سے ادا نہیں کر رہے ہیں اور اپنے عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بازار کی بعض اشیا اپنے لیے مخصوص کر لی ہیں تو حضرت عثمان نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور فوراً معزول کر دیا۔[۲]

ولید بن عقبہ کی گورنری کے زمانہ میں چند شورہ پشت آدمیوں نے رات کے وقت ایک شخص کے مکان میں نقب لگایا، وہ شخص بیدار ہو گیا اور پڑوسیوں کو بلانے کے لیے چیخنا شروع کر دیا۔ نقب زنوں نے اسے قتل کر دیا۔ ولید بن عقبہ نے ان لوگوں کو گرفتار کر کے جیل خانے میں بند کر دیا لیکن جب حضرت عثمان کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ نے قتل کے جرم میں نقب زنوں کے لیے سزائے موت کا حکم دیا، یہ پورا واقعہ بھی طبری میں موجود ہے۔

صوبوں کی تقسیم

حضرت عمرؓ نے مملکتِ اسلامی کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا تھا جن کے نام یہ ہیں: مکہ[۱]، المدینہ[۲]، شام[۳]، الجزیرہ[۴] (یعنی خاص عراق) البصرہ[۵] کوفہ[۶]، مصر[۷]، فلسطین[۸]۔ بیزنطینی حکومت کے ماتحت فلسطین ایک صوبہ تھا جس میں دس ضلعے تھے

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری، باب تمصیر البصرہ ص ۳۴۷

[۲] تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۲۶۸

ان ضلعوں کا دارالحکومت ایلیہ تھا۔ حضرت عمر نے انتظام کے نقطۂ نظر سے پورے فلسطین کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا تھا، ایک حصہ کا دارالحکومت ایلیہ تھا اور دوسرے کا رملہ، دونوں کا گورنر الگ الگ ہوتا تھا۔ ایران کی تقسیم پہلے سے جو چلی آرہی تھی، یعنی فارس، کرمان، خراسان، مکران، سجستان، اور آذربائیجان، حضرت عمر نے اسی کو قائم رکھا۔

حضرت عثمان نے حضرت عمر کی صوبوں کی تقسیم کو اصولاً تو باقی رکھا، لیکن اس میں حسب ذیل ترمیمیں کیں۔

(۱) حضرت عمر نے صوبہ شام کو چار فوجی علاقوں میں تقسیم کر دیا تھا: دمشق، حمص، اردن اور فلسطین (مرج ابن عامر جسے انگریزی میں Esdraelon کہتے ہیں اس کے بڑے میدان کا جنوبی علاقہ) حضرت عثمان نے اس تقسیم کو ختم کر کے پورے شام کو ایک صوبہ اور ایک فوجی علاقہ بنا کر امیر معاویہ کو بلاشرکت غیرے اس کا گورنر مقرر کر دیا۔[۱]

(۲) حضرت عمر کے زمانہ میں مصر دو حصوں میں تقسیم تھا: اعلیٰ مصر (Upper Egypt) اور اسفل مصر (Lower Egypt)، عمرو بن العاص اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ان دونوں حصوں کے الگ الگ گورنر تھے، حضرت عثمان نے ان دونوں کو ایک کر کے ایک گورنر مقرر کر دیا۔[۲]

(۳) حضرت عثمان کے عہد میں ٹیونس، الجزائر، مراکش اور قبرص اور دوسری طرف ارمینیہ، طبرستان، اور کابل کے نئے صوبوں کا اضافہ ہوا۔

دیوان عطا حضرت عمر کے عہد میں بڑے عہدہ داران صوبہ یہ تھے: والی (گورنر) عامل، قاضی، کاتب الدیوان (چیف سکریٹری) صاحب بیت المال (فائنس

---

[۱] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۱۷ و تاریخ عرب ہٹی ص ۱۵۴

[۲] فتوح مصر و اخبارہا ابن ابی عبدالحکم ص ۱۷۳

سکرٹیری، صوبہ کے ماتحت جو ضلع ہوتے تھے، ان میں سے ہر ضلع کا ایک افسر (عامل) اور قاضی الگ ہوتا تھا۔ یہ سب صوبہ کے گورنر (والی) کے ماتحت ہوتے تھے۔ حضرت عثمان نے اس ترتیب کو قائم رکھا۔ البتہ حضرت عمر کے زمانہ میں دیوان عطا (دفتر عطیات و وظائف) میں لوگوں کے جو وظائف لکھے ہوئے تھے ان میں فی کس سو درہم کا اضافہ کر دیا۔

علاوہ ازیں اصحاب فئے[۱] کے لیے حضرت عمر نے یہ دستور مقرر کیا تھا کہ ان کے گھر میں ایک بچہ بھی پیدا ہوتا تو رمضان میں اس بچہ سمیت فی کس ایک درہم اور ازواجِ مطہرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو درہم روزانہ دیے جاتے تھے۔ کسی نے حضرت عمر سے کہا کہ اگر آپ ان کے کھانے کا بھی انتظام کر دیں تو اچھا ہے، لیکن حضرت عمر نے اس کی ضرورت نہ سمجھی، فرمایا: میں تو ان کے گھروں میں ان کو شکم سیر کر دیتا ہوں، لیکن جب حضرت عثمان کا زمانہ آیا تو آپ حضرت عمر کے دستور کو باقی رکھنے کے ساتھ رمضان رمضان ان سب کا کھانا بھی مقرر کر دیا، ان کے علاوہ مسجد میں پیچھے رہ جانے والے لوگ، یعنی بے گھر کے لوگ، مسافر، اور فقرا کو بھی رمضان میں کھانا تقسیم ہوتا تھا۔[۲]

اسی طرح حضرت عمر نے اہل عوالی یعنی مدینہ کے اردگرد کی اونچی زمینوں کے باشندوں کے جو وظائف مقرر کر رکھے تھے حضرت عثمان نے ان میں بھی اضافہ کیا اور

---

[۱] فئے ان خاص زمینوں کا نام تھا جو خلافت کی ملک ہوتی تھیں، یا کسی کی بھی مملوکہ نہیں ہوتی تھیں، یا جن کو باغیوں سے ضبط کیا جاتا تھا اور وہ زمینیں بھی فئے کہلاتی تھیں جن کی آمدنی کو رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کرنے کے لیے مخصوص کر لیا جاتا تھا، جو لوگ اسلام کی کوئی عظیم خدمت انجام دیتے تھے بعض مرتبہ ان کو بھی فئے کی زمین دے دی جاتی تھی۔ یہی حضرات اصحاب فئے یا اہل فئے کہلاتے تھے۔

[۲] طبری ج ۳ ص ۲۴۵ و ۴۶

نقد رقم کے ساتھ کپڑے دینے کا بھی حکم فرمایا۔[1] حضرت عمرؓ نے مجاہدین کے بال بچوں اور گھر کے دوسرے لوگوں کو زمینیں دے رکھی تھیں، حضرت عثمانؓ نے اس انتظام کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ ان زمینوں کو ان پسماندگان میت کے لیے موروثی قرار دے دیا جن کا نام دیوان عطا میں درج نہیں تھا۔ سلیمان بن حبیب کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس وراثتی نظام کو پسند نہیں کیا اور مجھ کو بلا کر فرمایا تم اس کو ختم کر دو اور اس کی جگہ وظیفہ کا دستور جاری کر دو۔ میں نے عرض کیا: ممکن ہے آپ کے بعد جو حکمراں ہوں وہ قطع وراثت پر تو آپ کی پیروی کریں، لیکن اجرائے وظیفہ میں نہ کریں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا: "تم سچ کہتے ہو اور وراثت کے ختم کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔[2] ابو اسحاق کا بیان ہے کہ ان کے دادا کا گذر حضرت عثمانؓ کے پاس سے ہوا تو حضرت عثمانؓ نے ان سے دریافت کیا: آپ کے بال بچے کتنے ہیں؟ انھوں نے کہا: "اتنے" حضرت عثمانؓ نے فرمایا: اچھا تو پھر، ہم نے تمہارے لیے اور تمہارے اہل وعیال کے لیے فی کس سو درہم کا وظیفہ مقرر کر دیا۔[3]

یہ معلوم ہے کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ میں شکر رنجی پیدا ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود حضرت زبیر بن عوام کا بیان ہے کہ عبداللہ بن مسعود کے انتقال کے بعد جب میں خلیفۂ سوئم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ عبداللہ بن مسعود کی اولاد اب اس وظیفہ کی مستحق ہے جو ان کے والد کو ملتا تھا تو حضرت عثمانؓ نے اس سے اتفاق کیا اور چونکہ زبیر بن عوام، عبداللہ بن مسعود کی وصیت کے مطابق ان کی

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۳۸

[2] ایضاً ص ۴۴۵

[3] ایضاً

اولاد کے سرپرست تھے اس لیئے بیت المال سے پندرہ ہزار درہم ان کو دلوادیئے[1]

بعض خاص لوگوں کو تنخواہیں

دیوان عطا میں جن حضرات کے نام درج تھے ان کے علاوہ کچھ اور لوگ تھے جو مختلف کام کرتے تھے لیکن عہد نبوت اور عہد صدیقی میں ان کو اس کام کی تنخواہ نہیں ملتی تھی اور وہ خود بھی اس خدمت کو حبتہ للہ انجام دیتے اور اس کا معاوضہ لینا پسند نہیں کرتے تھے مثلاً موذن، امام اور معلم وغیرہ، اس میں شبہ نہیں کہ یہ جذبہ تو بڑا اچھا اور مبارک تھا، اس بنا پر حضرت عمر نے ان سب حضرات کی ماہوار تنخواہیں مقرر کریں حضرت عثمان کا دور آیا تو آپ نے بھی اسے قائم رکھا، علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں۔

انّ عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان کان یرزقان المؤذنین والائمۃ والمعلمین	عمر بن الخطاب اور عثمان بن عفان موذنوں، اماموں اور معلمین کو تنخواہ دیتے تھے،

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ دیوان عطا یعنی دفتر عطیات و وظائف جس کو حضرت عمر نے قائم کیا اور حضرت عثمان نے ترقی دے کر اسے باقی رکھا بہ ظاہر ان میں احدی پن پیدا ہو جائے وہ کسی کام کے عادی نہ رہیں، ایک معاشرہ کی ترقی اور اس کی فلاح و نجاح کے لیے یہ صورتِ حال سخت نقصان دہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دیوان عطا سے جو عطیات و وظائف ملتے تھے وہ سب کو نہیں بلکہ خاص خاص افراد و اشخاص اور ان کے اہل خانہ کو ملتے تھے ان کی تقسیم

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۷

[2] سیرت العمرین

یہ تھی۔

(۱) ازواج مطہرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت

(۲) مہاجرین وانصار جنھوں نے غزوات میں حصّہ لیا تھا۔ ان میں اصحاب بدر کو سب سے مقدم رکھا گیا تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں باقاعدہ ماہانہ تنخواہوں کا رواج نہیں تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو صحابۂ کرام کسی دینی خدمت کا معاوضہ لینا گوارا نہ کرتے تھے۔ پھر غزوات وفتوحات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور ہر بالغ مسلمان گویا ایک فوجی تھا جو عندالطلب ہر وقت جنگ پر جانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اب اس صورت میں ان کے اور ان کے متعلقین کے لیئے معاش کے انتظام کی صورت بجز اس کے کوئی اور نہیں ہوسکتی تھی کہ بیت المال ان کا تکفل کرے، ان حضرات کے علاوہ دیوان عطا میں جن کے نام درج تھے وہ لوگ تھے جن کے پاس نہ کوئی جاگیر جائداد تھی اور نہ کوئی اور ذریعۂ معاش تھا وہ ضعیف اور سن رسیدہ اشخاص جو کوئی کام کرہی نہیں سکتے تھے اس قسم میں ذمی مرد اور عورتیں ان کے پجاری بھی شامل تھے، اب اگر ایک خلاصی ریاست (welfare state) کی تعریف یہ ہے کہ ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جس کا معاشی تکفل ریاست نہ کرتی ہو تو غور کرنا چاہیئے کہ ایسی ریاست خلافت فاروقی وعثمانی سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے [1]

---

[1] چنانچہ ڈاکٹر ایس۔ اے۔ کیو۔ حسینی کہتے ہیں: دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک حکومت نے ریاست کی پوری آبادی کے ایک ایک متنفس کو غذا اور لباس کو بہم پہونچانے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ "عرب ایڈمنسٹریشن (انگریزی) ص ۵۴، سر ولیم میور بھی اعتراف کرتا ہے کہ مسلمانوں کی عظیم الشان قوم جس طرح ملک کی آمدنی کو آپس میں اولاً اخوت باہمی اور ثانیاً روحانی اور فوجی کمالات وامتیازات کی بنیاد پر تقسیم کرتے تھے، تاریخ عالم میں اس کی (باقی حاشیہ صفحہ ۔ پر)

مالیاتی نظام

حضرت عمر کے زمانہ میں ریاست کی آمدنی کے جو ذرائع تھے یعنی زکوٰۃ جزیہ، عشر، خراج، فے، غنیمت معادن، اور چنگی، حضرت عثمان نے اس نظم کو بعینہ باقی رکھا، البتہ زکوٰۃ کے معاملہ میں پہلے جو یہ پابندی تھی کہ بیت المال میں ہی جمع کی جائے گی، اب چونکہ بیت المال بہت خوش حال تھا اس لیے حضرت عثمان نے یہ قید اٹھادی، البتہ دوسری آمدنیاں جو بیت المال کے علاوہ کہیں اور جمع نہیں ہوسکتی تھیں ان پر کڑی نگاہ رکھتے تھے، اور اگر خراج کی آمدنی توقع سے کم ہوتی تھی تو فوراً احتساب کرتے تھے، چنانچہ مصر کی آمدنی حضرت عمرو بن العاص کی گورنری کے زمانہ میں مصر کی حیثیت کے مقابلہ میں کم وصول ہوئی تو حضرت عثمان نے ان کو تنبیہ کی۔ مگر جب اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو ان کو معزول کر کے، جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا گورنر بنادیا اور خراج کا انتظام بھی ان کے سپرد کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمرو بن العاص کے زمانہ میں عورتوں اور بچوں کو مستثنیٰ کر کے فی کس دو دینار کے حساب سے مصر کے خراج کی آمدنی ۲۰ لاکھ تھی۔ مگر اب دگنی یعنی چالیس لاکھ ہوگئی[1]۔

فوجی چھاؤنیاں

مملکت اسلامیہ کی غیر معمولی وسعت اور اس کے پھیلاؤ کے باعث ضرورت تھی کہ اہم فوجی مقامات پر چھاؤنیاں قائم کر کے ان میں فوج اور جنگی اسلحہ و ساز و سامان کا انتظام ہر وقت رکھا جائے، اس بنا پر حضرت عمر نے فوجی اعتبار سے مملکت کو حسب ذیل نو ضلعوں میں تقسیم کیا تھا: مدینہ، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، مصر، دمشق، حمص، اور فلسطین، حضرت عثمان کے عہد میں ان فوجی مراکز میں طرابلس، قبرص، طبرستان اور آرمینیہ کا مزید اضافہ ہوا۔ بحری بیڑہ تمام تر خلافت عثمانی کی ایجاد ہے،

(بقیہ حاشیہ) نظر نہیں مل سکی۔ (Amrals of Early caliphate. P. 227

[1] فتوح البلدان بلاذری باب فتوح مصر والمغرب ص ۲۲۰

اس کے بھی دو مرکز تھے. ایک سواحل شام میں اور دوسرا اسکندریہ میں. اول الذکر امیر معاویہ بن ابی سفیان اور ثانی الذکر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی کمانڈ میں تھا. چنانچہ جب شہنشاہ روم ایک عظیم بحری بیڑہ کے ساتھ روانہ ہوا ہے تو حضرت عثمان نے امیر معاویہ اور عبداللہ دونوں کو ہدایت بھیجی کہ اپنا اپنا بیڑہ (fleet) لے کر روانہ ہوں.

بری فوج کی چھاؤنیوں میں فوجیوں کی رہائش کے لیے باقاعدہ بیرکیں بنی ہوئی تھیں ساتھ ہی بڑے بڑے اصطبل ہوتے تھے جن میں ایک بڑی تعداد گھوڑوں کی (ایک روایت کے مطابق چار ہزار) ہر وقت تیار رہتی تھی. ان گھوڑوں کو چرانے کے لیے مخصوص چراگاہیں تھیں جن کو حمی کہتے تھے، ان چراگاہوں میں حکومت کے جانوروں . . . . . کے علاوہ کوئی اور جانور نہیں چر سکتا تھا، گھوڑوں کے ساز و سامان اور اسلحہ کا بھی یہاں مکمل انتظام رہتا تھا، ہر گھوڑے کی ران پر "جیش فی سبیل اللہ" لکھا ہوتا تھا، یہ انتظام حضرت عمر کے عہد سے چلا آرہا تھا حضرت عثمان نے اس کو اور ترقی دی. چنانچہ آپ کے زمانہ میں چراگاہوں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا. ان کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ علامہ سمہودی کے بیان کے مطابق ایک ضربہ کی چراگاہ میں چالیس ہزار اونٹ پرورش پاتے تھے [1]

محکمہ احتساب

حضرت عثمان نے عوام کے اخلاق اور ان کے معمولات کی نگرانی کے لیے ایک محکمہ احتساب بھی قائم کیا تھا جس کے ماتحت لوگ بازاروں اور آبادیوں میں گشت کرتے رہتے تھے، چنانچہ مدینہ میں کبوتر بازی کا رواج شروع ہوا تو حضرت عثمان نے اس کو روکا اور ایک شخص کو اس کی نگرانی کے لیے مقرر کر دیا.

---

[1] وفاء الوفاء ؟

اسی طرح لوگوں میں نشہ بازی کا رجحان ہونا شروع ہوا تو حضرت عثمان نے چند آدمی مقرر کیے جو لاٹھی لئے گشت کرتے رہتے اور لوگوں کو اس سے منع کرتے تھے. لیکن جب اس پر بھی اس کا انسداد نہیں ہوا تو ارباب رائے سے مشورہ کر کے بنبید کے استعمال پر بھی سزا کا اعلان کر دیا. چنانچہ جو لوگ اس جرم میں پکڑے جاتے. ان کے کوڑے لگائے جاتے تھے [۱]

مدینہ کو پاک و صاف رکھنے کی کوشش

مدینہ چوں کہ دار الخلافہ تھا اور یوں بھی اس کا بڑا اونچا مرتبہ و مقام تھا اس بنا پر حضرت عثمان کی کوشش یہ رہتی تھی کہ مدینہ اخلاقی اور دینی حیثیت سے پاک و صاف رہے اور اس میں شر و فساد کے جراثیم نہ پیدا ہوں، چنانچہ جب مدینہ میں چند ناگوار واقعات پیش آئے تو حضرت عثمان نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا: اے مدینہ کے لوگو! تم اسلام کی جڑ ہو، تم اگر درست رہو گے تو سب درست رہیں گے اور اگر تم بگڑ گئے تو اور لوگ بھی بگڑ جائیں گے. اس کے بعد زور دے کر فرمایا: خدا کی قسم! تم میں سے جس کسی شخص کے متعلق میرے علم میں آئے گا کہ وہ فتنہ کا بیج بو رہا ہے میں اس کو مدینے سے چلتا کر دوں گا، راوی کا بیان ہے کہ حضرت عثمان نے جو کہا تھا وہی کیا، چنانچہ جس کسی شخص کی نسبت ان کو معلوم ہوتا کہ کسی قسم کا شر پیدا کر رہا ہے، آپ اس کو جلا وطن کر دیتے تھے، بعض لوگوں نے اس پر چہ می گوئی شروع کی تو آپ نے فرمایا: لوگو! میں کوئی نئی بدعت تو نہیں کر رہا ہوں، حکم بن ابی العاص مکی تھا. اس سے ایک گناہ سرزد ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو طائف بھیج دیا، پھر آپ نے اس کا گناہ معاف کر دیا اور وطن واپس جانے کی اجازت دے دی

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۳۹۸

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو بکر و عمر جو آپ کے جانشین ہوئے ان کا معمول بھی یہی رہا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ معاملات بگڑتے جا رہے ہیں، اس لیے میں پورے طور پر ہشیار اور خبردار ہوں، تم بھی ہوشیار اور خبردار رہو[۱] ایک شخص کے متعلق معلوم ہوا کہ حضرت عباس بن عبد المطلب کی شان میں گستاخی کی ہے تو آپ نے اس کو ضرب کی سزا دی۔ کسی نے اس پر سوال کیا تو فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے چچا کی تعظیم کریں اور یہ شخص ان کی توہین کرے، میں اسے کیسے برداشت کر سکتا ہوں، اس فعل سے تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت لازم آتی ہے۔[۲]

ایک شخص ضابی بن الحرث البرجمی نے چند انصار سے ایک شکاری کتا مستعار لیا۔ مگر اسے لے کر بیٹھ گیا اور واپس نہیں کیا۔ انصار نے اسے زبردستی چھین لیا۔ ضابی کو اس پر غصہ آیا اور انصار کی ہجو لکھ ڈالی، انصار نے شکایت کی تو حضرت عثمان نے ضابی کو قید کر دیا یہاں تک کہ اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا[۳]

اجرائے حد میں احتیاط

باایں ہمہ اجرائے حد میں احتیاط برتتے اور عجلت نہیں کرتے تھے۔ حضرت عثمان کے غلام محجن کا بیان ہے کہ ایک عورت پھٹے پرانے حال میں آئی اور بولی: "مجھ سے زنا کا ارتکاب ہو گیا ہے" حضرت عثمان نے یہ سن کر مجھ سے فرمایا: "محجن! اس عورت کو نکال دو، میں نے تعمیل کی، لیکن یہ عورت واپس آ گئی اور پھر اسی بات کا اعادہ کیا۔ حضرت عثمان نے حسب سابق فرمایا: "محجن! اسے نکال دو" میں نے تعمیل کی، لیکن عورت پھر لوٹ آئی اور اسی کی

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۳۹۹۔

[۲] ایضاً ص ۴۰۰ و ابن اثیر کامل ج ۳ ص ۱۸۲

[۳] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۸۳

تکرار کی. اب حضرت عثمان نے فرمایا: افسوس! محجن! میں اس عورت کو زبوں حال دیکھتا ہوں اور یہ زبوں حالی ایسی بری بلا ہے جو انسان کو برائی پر آمادہ کرتی ہے، اس لیئے تم اس عورت کو لے جاؤ، پیٹ بھر کے کھانا کھلاؤ اور اسے کپڑے پہناؤ، اس کے بعد ایک گدھے پر کھجور، آٹا اور کشمش لاد کر کوئی قافلہ جاتا ہو تو عورت کو گدھے کے ساتھ اس کے ہمراہ کر دو۔ محجن کا بیان ہے: "میں نے اثنائے راہ میں عورت سے پوچھا: کیا تم اب بھی اقرار کرو گی؟" بولی: نہیں۔ میں تو امیر المومنین کے سامنے اقرار اپنی زبوں حالی کی وجہ سے کر رہی تھی[۱]

تعمیرات حضرت عثمان کے عہد میں تعمیرات میں بھی بڑی ترقی ہوئی ۲۶ھ میں آپ نے مسجد حرام کی مرمت کرائی اور اس میں توسیع کی، اس سلسلے میں آپ نے آس پاس کی زمینیں خریدنے کا ارادہ کیا تو بعض مالکان زمین خوشی سے اس پر راضی ہو گئے۔ لیکن دوسرے مالکان اس پر راضی نہ ہوئے۔ بلکہ توسیع حرم پر اعتراض کرنے لگے، حضرت عثمان نے ان کے مکان حکماً منہدم کرا دیے اور ان کی قیمت بیت المال میں جمع کر دی۔ ان لوگوں نے اس پر شور و غل مچایا اور ہنگامہ کیا تو حضرت عثمان نے فرمایا: "یہی معاملہ تمہارے ساتھ عمر نے کیا تھا تو تم نے چیخ پکار نہیں کی۔ اب کیوں ہنگامہ کرتے ہو۔" اور ان کو قید میں ڈال دیا۔ آخر عبداللہ بن خالد بن اسید کی سفارش پر انہیں رہا کیا گیا[۲]

---

[۱] کنز العمال طبع دوم ج ۱۵ ص ۲۷

[۲] ابن اثیر کامل ج ۳ ص ۸۷، حضرت عمر نے ۱۷ھ میں حرم کی توسیع کی، اس کی چہار دیواری بنوائی تو آس پاس کے مکانات کو خرید کر ہدم کرایا اور ان کی زمینیں حرم میں شامل کر لی تھیں، حضرت عثمان نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مسجد نبوی کی توسیع و تزئین

۲۹ھ میں حضرت عثمان نے مسجد نبوی کی توسیع کی اور اسے خوب صورت بنایا۔ یہ کام ربیع الاول کے مہینہ میں شروع ہوا تھا۔ گچ کے پتھر اس مقصد کے لیے وادی نخل سے لائے جاتے تھے مسجد کی دیواروں اور فرش پر پچی کاری کا کام کرایا گیا۔ اور اس کے ستون ان پتھروں سے بنائے گئے تھے جن میں سیسہ بھرا ہوا تھا۔ چھت میں شیشم کی لکڑی لگائی گئی اور اب مسجد کا طول ایک سو ساٹھ گز اور عرض ایک سو پچاس گز ہو گیا تھا، البتہ دروازوں میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ حضرت عمر کے زمانہ میں اس کے چھ دروازے تھے وہی اب بھی رہے [۱]

لیکن عجیب بات ہے کہ جس طرح مسجد حرام کی توسیع کی بعض لوگوں نے مخالفت کی اور شور مچایا۔ اسی طرح مسجد نبوی کی توسیع پر کچھ لوگوں کو اعتراض تھا اور وہ اپنے مکانات دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ آخر حضرت عثمان نے تمام صحابہ کے مشورہ سے خطبہ جمعہ میں نہایت پرزور تقریر کی اور اس میں مسلمانوں کی غیر معمولی کثرت کے باعث مسجد کی توسیع کی اہمیت و شدت ضرورت کو بیان کیا تو لوگ خوشی سے اپنے مکانات دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ تعمیر کا کام شروع ہوا تو حضرت عثمان خود اس کی نگرانی کرتے تھے [۲]

رفاہ عام کے کام

ان مقدس تعمیرات کے علاوہ آپ نے رفاہ عام کے لیے بھی بہت سے تعمیری کام کیے سڑکیں اور پل بنائے، دفاتر کے لیے وسیع عمارتیں بنوائیں، ممالک محروسہ اسلامیہ میں شہر شہر مسجدیں تعمیر کرائیں۔ کوفہ ایک

---

[۱] طبری ج ۵ ص ۲۷۰ و بخاری کتاب الصلوۃ باب بنیان المسجد

[۲] مسند ابی عوانہ ج ۱ ص ۳۹۱ و خلاصۃ الوفا ص ۱۲۴

بہت بڑا تجارتی مرکز تھا۔ حضرت عثمان نے وہاں مسافروں کی راحت و آسائش کے لیے عقیل اور ابن ہبار کے مکانات خرید کر ایک بڑا مہمان خانہ تعمیر کرایا۔[1]

بصرہ میں عبداللہ بن عامر گورنر تھے ان کو بھی لکھا کہ بصرہ میں ایک مہمان خانہ بناؤ جس میں مدینہ کے مسافر اور دوسرے لوگ ٹھہر سکیں۔ عبداللہ بن عامر کو خود تعمیرات اور رفاہِ عام کے کاموں کا بڑا ذوق تھا۔ انھوں نے ایک ہی جگہ دو مہمان خانے تعمیر کرائے جو آمنے سامنے تھے۔ ایک کا نام حضرت عثمان کے نام پر قصرِ عثمان تھا اور دوسرے کا ان کی بیوی کے نام پر قصرِ رملہ![2]

ملک کے حسن انتظام اور لوگوں کی راحت و آسائش کا تقاضہ تھا کہ مدینہ طیبہ جو دار الخلافہ تھا اس کے آنے جانے کے تمام راستوں کو آرام دہ بنایا جائے، چنانچہ حضرت عثمان نے ان راستوں پر جگہ جگہ چوکیاں، سرائیں اور پانی کے چشمے بنوائے، نجد کی راہ میں مدینہ سے چوبیس میل کے فاصلہ پر ایک شاندار سرائے تعمیر ہوئی، سرائے کے ساتھ ایک مختصر سا بازار بھی تھا اور ساتھ ہی شیریں پانی کا ایک کنواں بھی بنوایا گیا جس کا نام بئر السائب تھا۔[3]

بند مہزور مدینہ میں مہزور اور مذنیب نام کی دو وادیاں تھیں جن میں کبھی کبھی خیبر کی طرف سے سیلاب آجاتا اور اہل مدینہ کے لیے پریشانی کا باعث ہوتا تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرف توجہ تھی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا تھا: "تمیسک حتیٰ الکعبین ثم یرسل الاعلیٰ علی الاسفل" ترجمہ: ان وادیوں کا پانی ٹخنوں تک

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۷۳

[2] معجم البلدان ج ۷، ص ۹۸

[3] وفاء الوفا ص ۲۵

روک کر نشیب کی طرف بہا دیا جائے[1] لیکن یہ خوش قسمتی خلیفہ سوم کے لیے مقدر تھی کہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق مدینہ سے تھوڑے فاصلہ پر ایک بند بنوایا اور نہر کھود کر سیلاب کا رخ دوسری طرف کر دیا، اس بند کا نام سدّ مہزور تھا[2] اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عثمانی عہد کے رفاہ عام کے کاموں میں اس کارنامہ کی بڑی اہمیت ہے، مکہ اور مدینہ کے درمیان عسفان نامی ایک مقام ہے جو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے، اس میں آب شیریں کے کنوئیں ہیں، اس میں ایک کنواں حضرت عثمان کا بنایا ہوا اور آپ کی طرف منسوب ہے، ابن بطوطہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔[3]

اکابر قریش کو مدینہ سے باہر آباد ہونے کی اجازت

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا خلافت عثمانی کے نظم و نسق کی بنیادی طور پر صورت اور ہیئت وہی تھی جو خلافت فاروقی کی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت عثمان مقلد تھے بلکہ ان کی جو رائے تھی خود ان کی فہم و بصیرت، تجربہ و مشاہدہ اور وقتی حالات و ظروف پر مبنی تھی، چنانچہ انھوں نے بعض معاملات میں حضرت عمر کا جو معمول تھا اس میں اضافہ کیا۔ مثلاً دیوان عطا میں، جس کا ذکر گذر چکا ہے، اور بعض امور میں حضرت عمر کی مخالفت بھی کی۔ چنانچہ حضرت عمر نے بعض سیاسی مصالح کی بنا پر اکابر قریش پر یہ پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ اجازت کے بغیر مدینہ سے باہر سکونت پذیر نہیں ہو سکتے تھے۔ اس پر اکابر قریش کو شکایت ہوئی تو ایک دن حضرت عمر نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا: لوگو! اچھی طرح سن لو! میرے نزدیک اسلام کی عمر

---

[1] موطا امام مالک باب القضاء فی الماء بیروت اڈیشن ص ۵۲۸

[2] وفاء الوفا ج ۲ ص ۲۱۷

[3] سفر نامہ ابن بطوطہ ص ۱۲۹

کے مدارج و مراتب وہی ہیں جو اونٹ کی عمر کے ہوتے ہیں، اونٹ پہلے جذع (ایک دانت والا) ہوتا ہے پھر علی الترتیب دو، چار اور چھ دانت نکل آتے ہیں اور اب اونٹ سدیس کہلاتا ہے، جب اس کی عمر نو برس ہوتی ہے تو اسے بازل کہتے ہیں۔ یہ اونٹ کے نشو ونما اور ترقی کی آخری منزل ہے اس کے بعد اونٹ کا زوال شروع ہو جاتا ہے، لوگو! اسلام بھی اپنی عمر کے منازل و مدارج طے کر کے اب اپنے نشو ونما اور ترقی کی آخری منزل کو پہنچ چکا یعنی بازل ہو گیا ہے۔ اس تمہید کے بعد حضرت عمر اصل موضوع سخن کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ہاں! مجھے معلوم ہے قریش اب یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے دوسرے بندوں کو نظر انداز کر کے اموال پر قبضہ کریں (دوسرے ملکوں میں آباد ہو کر جاگیر جائداد پیدا کریں) خبردار! جب تک میں زندہ ہوں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" حضرت عمر کو اس امر میں اتنا اصرار تھا کہ ان اکابرین مہاجرین میں سے اگر کوئی غزوہ میں شریک ہونا چاہتا تھا تو حضرت عمر اس کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے، لیکن حضرت عثمان نے اس قید و بند کو ختم کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سب مختلف ملکوں اور شہروں میں پھیل کر بس بسا گئے[۱]۔

ڈسپلن حضرت عثمان ڈسپلن کے سخت عادی تھے، کوئی شخص کیسا ہی مجرم ہو اس کو پبلک سزا دے اس کے روادار نہیں تھے۔ ولید بن عقبہ کی گورنری کے زمانہ میں ایک شعبدہ باز یا جادوگر تھا، جندب نامی ایک شخص نے جادوگر کو زدوکوب کیا اور حضرت عثمان کو اس کی اطلاع ہوئی تو فوراً ولید بن عقبہ کو لکھا: "جندب سے اس بات کی قسم لے لو کہ اس کو اس بات کا علم نہ تھا کہ تم خود جادوگر کو سزا دینے کا فیصلہ کر چکے ہو، اگر جندب یہ حلف اٹھا لے تو اسے تعزیر کر کے چھوڑ دو، اور وہ لوگوں

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۳۹۶-۹۷

کو یہ جتادو کہ محض ظن و تخمین پر عمل نہ کریں اور قانون کو کبھی اپنے ہاتھ میں نہ لیں [۱]

ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک اسلام میں ذمیوں کے جو حقوق ہیں، حضرت عثمان ان کا بھی بڑا خیال رکھتے اور ان کی جو بجا شکایات ہوتی تھیں انھیں رفع کرتے تھے، چنانچہ نجران[۲] کے عیسائی جن کو حضرت عمر نے کسی مصلحت سے جلاوطن کرکے شام اور عراق میں آباد کر دیا تھا۔ ان کا ایک وفد ایک مرتبہ حضرت عثمان کی خدمت میں چند شکایات لے کر حاضر ہوا تو آپ نے ولید بن عقبہ کو جو کوفہ کے گورنر تھے یہ فرمان ارسال فرمایا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ امیر المومنین عبداللہ عثمان کی طرف سے ولید بن عقبہ کے نام۔ السلام علیکم!

"میں اس معبود برحق کا شکر گذار ہوں جس کے سوا کوئی دوسرا عبادت کے لائق نہیں ہے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ اسقف (بشپ) عاقب (Vecar) اور نجرانی عیسائیوں کے اکابر جو اس وقت عراق میں مقیم ہیں وہ مجھ سے ملے اور اپنی شکایات و مشکلات بیان کیں، اور انھوں نے عمر کی وہ تحریر دکھائی جس میں انھوں نے یمن میں متروکہ اراضی کے بدلہ میں نجرانیوں کو عراق و شام میں اراضی دینے کا حکم صادر کیا تھا۔ علاوہ ازیں تم ان زیادتیوں سے بھی واقف ہو جو مقامی مسلمان ان لوگوں کے ساتھ کر رہے ہیں ان امور کے پیش نظر میں نے ان کے جزیہ کی رقم میں سے تیس حلے (چھ سو روپیہ سالانہ) کی تخفیف کر دی ہے، اور میں سفارش کرتا ہوں کہ ان لوگوں کو وہ سب اراضی دیدی جائے جو عمر نے عراق میں ان کو دلوائی تھی۔ علاوہ ازیں لوگوں کو اچھی طرح سمجھا دو کہ نجرانیوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئیں، کیونکہ یہ ذمی ہیں جن کے ساتھ حسن سلوک

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۲۷۵ [۲] یمن اور مکہ کے مشرق میں ایک سرسبز و شاداب شہر

کرنے کا ہم نے ذمہ لیا ہے، پھر میں ان سب سے پہلے سے واقف ہوں۔ عمر نے جو دستاویز ان کو لکھ کر دی تھی اسے خود بھی دیکھو اور اس میں جو وعدہ ان لوگوں کے ساتھ کیا گیا ہے اس کو پورا کرو، اور پڑھنے کے بعد یہ دستاویز ان کو واپس کر دو[1]

ارض عراق کی تقسیم اسی طرح عراق فتح ہوا تو حضرت عمر نے مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم نہیں کیں اور ان پر خراج لگا کر انھیں اصل مالکوں کے قبضہ میں ہی رہنے دیا اس میں مصلحت یہ تھی کہ مجاہدین کھیتی باڑی کے کام میں پڑ کر کہیں جوہر شجاعت اور جنگی اسپرٹ سے محروم نہ ہو جائیں، لیکن کثرت فتوحات اور مملکت اسلامیہ کی غیر معمولی وسعت کے باعث اب حضرت عمر کی اس پالیسی پر عمل نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ حضرت عثمان نے یہ ممانعت بھی دور کر دی اور خود آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عمار بن یاسر، خباب بن الارت، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبداللہ، اسامہ بن زیدؓ اور دوسرے بہت سے لوگوں کو اس علاقہ میں جائدادیں عطا کیں، بلاذری نے ان سب جگہوں کے نام لکھے اور ان کی نشاندہی کی ہے،[2]

گم شدہ اونٹوں کے متعلق فیصلہ حضرت عمر کے عہد میں جو اونٹ لاوارث یا گم شدہ ہوتے تھے ان کو حکومت کے خزانہ سے کھلایا پلایا جاتا تھا اور ان کی نسل بڑھتی رہتی تھی۔ کوئی شخص انھیں ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا لیکن حضرت عثمان نے اب قاعدہ یہ مقرر کر دیا کہ ایسے اونٹوں کی تشہیر کی جائے اگر اس پر بھی ان کا کوئی مدعی نہ آئے تو ان کو فروخت کر کے قیمت بیت المال میں جمع کر دی جائے اس کے بعد اگر کوئی مالک آنکلے تو اونٹ کی قیمت اس کے حوالہ کر دی جائے[3]

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۴۲ و معجم البلدان یاقوت حموی ج ۸ ص ۲۶۴

[2] فتوح البلدان ص ۲۷۲، ۲۷۳

[3] موطا امام مالک بیروت اڈیشن ص ۵۳۸

مہر خلافت خلافت عثمانی سے جو احکام یا فرامین صادر ہوتے تھے ان پر باقاعدہ حضرت عثمان کے ہاتھ کا لکھا ہوا حکم ہوتا[1] اور پھر اس پر مہر خلافت ہوتی تھی یہ مہر خلافت پہلے تو وہی تھی جو دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے چاندی کی بنوائی تھی۔ اس پر محمد رسول اللہ" تین سطروں میں کندہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بھی اسی مہر کو استعمال کرتے رہے حضرت عثمان کا زمانہ آیا تو آپ نے بھی اپنا معمول یہی رکھا۔ لیکن ایک مرتبہ حضرت عثمان اس انگشتری کو پہنے بیراریس نامی ایک کنویں کی منڈیر پر بیٹھے تھے کہ اچانک انگشتری گرگئی، عجیب بات یہ ہے کہ پورا کنواں کھنگال ڈالا گیا مگر انگشتری کا سراغ نہ ملا، اس کے بعد آپ نے ایک دوسری انگوٹھی بنوائی اس پر بھی حسب سابق" محمد رسول اللہ" کا نقش تین سطروں میں کندہ تھا[2]

محکمہ قضا محکمۂ قضا پہلے سے چلا آرہا تھا۔ حضرت عثمان کے زمانہ میں قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس حضرت زید بن ثابت تھے۔ اور شام کی صوبائی عدالت کے جج ابوالدردا تھے[3]

محکمۂ پولیس البتہ پولیس کا محکمہ آپ کی ایجاد ہے، ابن عبدربہ نے اس کی تصریح کی ہے اور لکھا ہے کہ خلافت عثمانی میں اس محکمہ کے افسر اعلیٰ عبیداللہ بن تنفذ تھے، یہ قنفذ وہی ہیں جن کا نسب ابن درید نے کتاب الاشتقاق میں: قنفذ بن عمیر بن جدعان لکھا ہے[4]

---

[1] العقد الفرید ج ۳ ص ۲۰۶ جدید اڈیشن

[2] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۸

[3] طبری ج ۴ ص ۴۲۲

[4] العقد الفرید ج ۳ ص ۲۸۴ مع حاشیہ

محکمہ افتاء افتاء کا محکمہ شروع سے چلا آرہا تھا۔ حضرت عثمان کے عہد میں صدر مفتی ابوذر جندب بن جنادۃ الغفاری تھے [1]

بیدار مغزی بیدار مغزی اور روشن خیالی ایک فرماں روا کے لیے نہایت ضروری وصف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک صدر ریاست کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی مملکت میں کس کس قسم کے لوگ کہاں کہاں کتنے اور کیسے ہیں۔ ان کے امیال و عواطف کیا ہیں، اور ان سے کیا خدمت لی جاسکتی ہے اور کونسی نہیں ؟ حضرت عثمان میں یہ وصف بدرجہ کمال تھا، رہتے تھے مدینہ میں مگر وہاں سے ہزاروں میل دور جہاں ان کی فوجیں مصروف جنگ ہوتی تھیں، ان تک کی خبر رکھتے تھے، چنانچہ . . عبدالرحمن بن ربیعہ، ایک مشہور صحابی اور فوجی کمانڈر تھے۔ اور خراسان کے متعدد معرکوں میں شاندار کامیابی حاصل کرچکے تھے لیکن ترک اور ایرانی ایک مرتبہ مسلمان فوجوں کی گھات میں بیٹھ گئے اور اس طرح دھوکہ سے انھوں نے مسلمان فوج کا کافی نقصان کردیا تھا اس بنا پر ان لوگوں کی پست ہمتوں میں جان پڑگئی اور اس میں پندار پیدا ہوگیا، اسی عالم میں عبدالرحمن بن ربیعۃ الباہلی نے جو خراسان کے ایک شہر باب میں مقیم تھے شہر بلنجر کی طرف پیش قدمی کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ حضرت عثمان کو اس کا اندازہ تھا کہ ایک طرف حریف کے حوصلے بلند ہوگئے ہیں اور دوسری طرف عبدالرحمن بن ربیعہ کے لشکر میں وہ لوگ آکر شریک ہوگئے ہیں جو خوش حال اور صاحب دولت و ثروت ہیں۔ اس بنا پر یہ مہم کامیاب نہ ہوگی اور مسلمانوں کو نقصان پہونچے گا، چنانچہ امیرالمومنین نے عبدالرحمن کو لکھا

اِنّ الرعیۃ قد ابطر کثیرًا منھم البطنۃ فقصر، ولا تقتحم بالمسلمین، فانی خاشٍ ان یبتلوا

حریف کو کمین میں بیٹھنے سے جو کامیابی ہوئی ہے اس پر وہ اکڑا ہوا ہے، اس بنا پر تم جہاں ہو وہیں رک جاؤ اور مسلمانوں کو لے کر آگے نہ بڑھو، ورنہ مجھے ڈر ہے کہ ان کو کہیں ابتلا نہ پیش آجائے

[1] اعلام النبلاء ذہبی ج ا ص ۳۱

لیکن عبدالرحمن پرجوش اور حوصلہ مند کمانڈر تھے، انھوں نے حضرت عثمان کی تنبیہ کی پرواہ نہ کی اور فوج لے کر بلنجر پر پیش قدمی کر بیٹھے، آخر نتیجہ وہی ہوا جس کا خطرہ حضرت عثمان کو تھا، شروع میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی، لیکن پھر ترکوں اور اہل بلنجر نے پلٹ کر اس زور سے حملہ کیا کہ نہایت سخت جنگ ہوئی، اور یہ لوگ اس پامردی اور جوش سے لڑے کہ اسلامی فوج کو شکست ہو گئی اور عبدالرحمن بن ربیعۃ الباہلی جن کا لقب ذوالنور تھا اس معرکہ میں کام آ گئے [۱]

مذہبی امور میں سخت گیری

حضرت عثمان نرم خو اور حلیم و بردبار ہونے کے باوصف جس طرح انتظامی معاملات میں متشدد تھے۔ جس کی مثالیں گذر چکی ہیں۔ مذہبی اور دینی معاملات میں بھی بڑے سخت گیر تھے چنانچہ ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود نے جو کوفہ میں تعلیم قرآن کی خدمت انجام دیتے تھے حضرت عثمان کو لکھا کہ یمامہ کے قبیلہ بنو حنیفہ کے لوگ جو مسلمان تھے اور کوفہ میں آباد ہو گئے تھے ان میں بعض اشخاص و افراد ایسے ہیں جو مسیلمہ کذاب کے گن گاتے اور اس کی طرح مدح سرائی کرتے ہیں، میں نے ان لوگوں کو گرفتار کر لیا ہے، حضرت عثمان نے جواب میں لکھا:

"ان لوگوں کو دین اسلام اور کلمۂ شہادت کی دعوت دو، ان میں سے جتنے آدمی اس دعوت کو قبول کریں اور مسیلمۂ کذاب سے قطعاً منکر ہو جائیں ان کو قید سے رہا کر دو اور جو ایسا نہ کرے اس کو تہ تیغ کر دو" [۲]

امن وخوش حالی

حضرت عثمان کی بیدار مغزی رعایا کی خبرگیری اور حسن نظم و نسق کا یہ نتیجہ تھا کہ ملک سے افلاس اور تنگدستی کا خاتمہ اور ہر طرف

---

[۱] تاریخ کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۳۱،

[۲] سنن کبریٰ بیہقی ج ۸ ص ۲۰۱

امن وامان، اور خوش حالی وفارغ البالی کا دور دورہ ہوگیا۔ حسن بصری سے روایت ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: میں نے حضرت عثمان کا عہد دیکھا ہے، لوگ ان پر نکتہ چینی کرتے تھے، حالاں کہ حال یہ تھا کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا جب کہ (ضرورت مند) لوگوں کو عطیات نہ ملتے ہوں، روزانہ منادی ہوتی تھی کہ لوگو! اپنے روزینے لے جاؤ، لوگ دامن بھر بھر کر لے جاتے تھے، اسی قسم کی منادی اشیائے خورد و نوش، گھی اور شہد کے متعلق ہوتی تھی اور لوگ ہر چیز بافراط لے جاتے تھے، غرض کہ عہد عثمانی میں مکمل امن وامان تھا ہر طرف خوش حالی تھی، دشمن خوف زدہ تھا، لوگوں کے باہمی تعلقات خوش گوار تھے، فوز و فلاح عام تھی، کوئی مسلمان دوسرے مسلمان سے نہیں ڈرتا تھا، وہ سب آپس میں بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے، حسن بصری فرماتے ہیں: یہ سب کچھ نتیجہ تھا اس محبت والفت اور جذبۂ خیرسگالی و خیر اندیشی کا جو حضرت عثمان سب مسلمانوں کے ساتھ رکھتے تھے[۱]

ایک مکمل فلاحی ریاست

ہمارے زمانہ میں جو علوم وفنون اور انسانی تہذیب و تمدن کی انتہائی ترقی اور عروج کا زمانہ ہے ایک فلاحی ریاست (welfare state)، کا جو تصور ہے خلافت عثمانی اس کا مکمل نمونہ اور مظہر تھی۔ اس ریاست کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) سب اہل مملکت امن وامان اور خوش حالی سے رہیں اور حکومت نے روزگار، کسب سے معذور اور ضرورت مند لوگوں کے لیے زندگی کی ضروری اشیا کی متکفل ہو۔

(۲) کسب معاش کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوں، کسی شخص اور کسی طبقہ کے ساتھ امتیاز نہ برتا جائے۔

(۳) ہر شخص کو براہ راست سربراہ حکومت تک اپنی شکایات پہونچانے کا حق ہو۔

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ، ص ۲۱۴، ابن کثیر نے یہ روایت امام بخاری کی کتاب (باقی صفحہ پر)

(۴) حکام اور منصب داران حکومت مطلق العنان نہ ہوں، ان کو حکومت کی جانب سے بازپرس اور جواب طلبی کا ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہو۔

ان خصوصیات کی روشنی میں خلافت عثمانی کا جائزہ لیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ خلافت ان سب کی بہمہ وجوہ جامع تھی، اس کو دفعہ وار اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ابھی آپ نے حضرت حسن بصری کی زبانی سنا کہ کس طرح خلافت کی طرف سے ارزاق و عطیات اور اشیائے خورد و نوش کی تقسیم عمل میں آتی تھی۔ حضرت عثمان کو اس معاملہ میں اتنا اہتمام تھا کہ اگر کسی گھر میں کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو سخت نازک اوقات میں اس کا بھی خیال رکھتے تھے چنانچہ محمد بن ہلال اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ میں امیرالمومنین کے محصور ہونے کے دنوں میں روزانہ خدمت عالی میں حاضر ہوتی تھی۔ ایک دن میں حاضر نہ ہو سکی امیرالمومنین نے دریافت فرمایا، کسی نے کہا: اس کے شب میں بچہ (ہلال) پیدا ہوا ہے۔ امیرالمومنین نے سنتے ہی پچاس درہم اور کپڑے کا ایک ٹکڑا میرے پاس ارسال فرمایا، اور ساتھ ہی کہلا بھیجا: یہ بچہ کا وظیفہ ہے جو ہر ماہ ملتا رہے گا۔ اور بچہ جب سال بھر کا ہو جائے گا تو وظیفہ دگنا یعنی سو درہم ماہانہ کر دیا جائے گا۔[۱]

(۲) حضرت عمر فاروق مہاجرین کو مدینے سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے، اس کے علاوہ لوگوں پر کچھ اور پابندیاں بھی تھیں جن کی وجہ سے لوگ تنگ دلی محسوس کرتے تھے۔ حضرت عثمان نے یہ سب پابندیاں یک قلم ختم کر دیں اور اب ہر شخص آزاد تھا کہ جہاں چاہے جائے اور کسب معاش کے لیے جو طریقہ چاہے اختیار کرے۔[۲]

(بقیہ حاشیہ) - التاریخ الکبیر کے حوالہ سے نقل کی ہے: ابن عبداللہ نے بھی اس کو استیعاب ذکر عثمان بن عفان میں بعینہٖ نقل کیا ہے۔

۱۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۲۱۴

۲۔ طبری ج ۴ ص ۹۷، ۳۹۶

(۳) اب تیسری اور چوتھی خصوصیت کو لیجئے، پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت عثمان کے ہاں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ ہر شخص کو آزادی تھی کہ جب چاہے بے تکلف اپنی شکایت بیان کرسکتا ہے، اس کے علاوہ آپ خود بہ طور خود حالات معلوم کرتے رہتے تھے، خصوصاً جمعہ کے دن منبر پر خطبہ کے لیے بیٹھتے تھے تو خطبہ شروع کرنے سے پہلے اور دونوں خطبوں کے درمیانی وقفہ میں لوگوں سے ان کے احوال وکوائف معلوم کرتے اور حج کے موقع پر اذن عام تھا کہ جس کسی کو والی یا عامل کے خلاف شکایت ہو وہ بے تکلف اس کا اظہار کرے، پھر صرف سننے پر اکتفا نہیں تھا۔ بلکہ معاملہ کی خاطر خواہ تحقیق فرماتے اور جو شکایت یا بے عنوانی کا ذمہ دار ہوتا اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرتے تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت عثمان کی خلافت ایک اعلیٰ درجہ کی فلاحی ریاست نہیں تھی۔؟

ایک عظیم سماجی کارنامہ

اس سلسلے میں حضرت عثمان کا ایک عظیم سماجی کارنامہ یہ ہے کہ قریش کے کچھ افراد ارض بطحا سے رشتہ منقطع کرکے دوسرے مقامات میں آباد ہوگئے تھے اور وہاں شادی بیاہ کرکے دوسرے قبائل کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ ان کو علمائے انساب قبائل قریش الظواہر کہتے ہیں، قریش اپنے حسب ونسب کے پندار میں ان کو قریش تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے، اور ان کے شعرا ان کی ہجو ومذمت کرتے تھے۔ لیکن جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو آپ نے ان قبیلوں کو بھی قریش میں شامل کرلیا[1]

---

[1] کتاب المحبر ابن حبیب ص ۱۶۹

بغاوت اور اس کے اسباب

حضرت عثمان کی خلافت جس کی مدت بارہ برس ہے اس کو دو ادوار پر تقسیم کیا جاتا ہے. دور اول جو نصف مدتِ خلافت سے زیادہ پر مشتمل ہے. غیر معمولی عروج و ترقی، وسعتِ فتوحات اور رفاہیت و خوش حالی کا دور ہے. اس دور میں مملکت اسلامی کا رقبہ مراکو سے کابل تک پھیل گیا، دولت کی ریل پیل ہوئی، لیکن دور ثانی جو چار پانچ برسوں پر مشتمل ہے، سخت انتشار و پراگندگی اور فتنہ و فساد کا دور ہے، اب ہم اس صورت حال کے اسباب پر غور کریں گے.

عناصرِ فساد عہدِ نبوی میں دنیا میں کوئی اہم اور بڑا واقعہ پیش آتا ہے تو اچانک ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس کے اسباب جلی ہوں یا خفی پہلے سے کار فرما ہوتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پورا عرب حلقہ بگوش اسلام ہو گیا تھا، لیکن طبیعت کی افتاد، مزاج، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب و معیت اور شرف صحبت و تعلیم و تربیت کے اعتبار سے یہ سب یکساں مرتبہ و مقام کے حضرات نہیں

تھے۔ پھر انھیں مسلمانوں میں ملے جلے وہ لوگ بھی تھے جو مدینہ کے اطراف واکناف کے باشندے تھے اور اعراب کہلاتے تھے، قرآن مجید میں ان اعراب کے بارہ میں ہے۔

اعراب کہتے ہیں: ہم ایمان لائے" اے محمد! آپ ان سے کہدیجئے کہ تم یہ مت کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ کیونکہ ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہوا ہی نہیں ہے، ہاں البتہ اسلمنا کہو (جس کے معنی ہم اسلام لائے" اور" ہم نے اطاعت قبول کی،" دونوں ہیں)

اعراب کے علاوہ دو اور طبقے تھے جو اس وقت اسلامی معاشرہ کا جز بنے ہوئے تھے ایک منافقین اور دوسرے مولفۃ القلوب، اول الذکر طبقے نے مار آستیں بن کر اسلام کو نقصان پہونچانے کی غرض سے کیا کچھ نہیں کیا؟ قرآن میں اسے تفصیل سے اور بار بار اس لیۓ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان ہوشیار رہیں اور ان کی ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں کا شکار نہ ہوں، دوسرا طبقہ مولفۃ القلوب کا تھا، یہ لوگ مسلمانوں میں گھلے ملے رہے، ان کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تالیف قلب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ ایک غزوہ کے موقع پر اسی بنا پر شکایت پیدا ہوئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر کے بعد فوراً ہی رفع بھی ہوگئی۔ لیکن اس کے باوجود سب نہیں تو ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنھوں نے سچے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور محض اپنے دنیوی منافع اور جان ومال کی حفاظت کی غرض سے مسلمانوں سے وابستہ رہے چنانچہ۔ عیینہ بن حصن الفزاری جو اعیان مولفۃ القلوب میں سے تھا مرتد ہونے کے بعد جب خلافت صدیقی میں گرفتار کر کے مدینہ لایا گیا اور اس سے پوچھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے ساتھ معاملہ بڑی داد ودہش اور

لطف وکرم کا تھا، پھر آخر وہ کیوں مرتد ہوگیا تھا تو اس نے صاف جواب دیا واللہ ما اٰمنت قط۔ خدا کی قسم میں کبھی ایمان لایا ہی نہیں تھا۔

ان دو طبقوں کے علاوہ یہود کا اگرچہ مدینہ سے خاتمہ ہوچکا تھا لیکن اسرائیلیات کی شکل میں وہ اپنے اثرات چھوڑ گئے تھے، غرض کہ یہ وہ عناصر تھے جو اسلام کی سالمیت اور اس کے استحکام (Security and solidarity) کے لیے ہر وقت خطرہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روز افزوں طاقت و قوت کے باعث ان کو اُبھرنے اور علانیہ مخالفت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی

خلافت صدیقی میں ان عناصر سے جنگ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فوراً ہی ان عناصر میں ایک ابال اور ہیجان کی کیفیت پیدا ہوئی اور وہ مختلف شکلوں اور صورتوں میں اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرنے کے لیے میدان میں آگئے ان عناصر کے محاذ تین تھے۔ (۱) مدعیان نبوت (۲) مرتدین (۳) مانعین زکوٰۃ۔ حضرت ابوبکر صدیق نے بیک وقت تینوں محاذوں پر ان عناصر فتنہ وفساد کا نہایت شدید مگر کامیاب مقابلہ کرکے انھیں ختم کردیا اور اسلام کی وحدت وسالمیت کو مجروح ہونے سے محفوظ کرلیا۔ خلیفۂ اول کا یہ کارنامہ اس درجہ اہم اور عظیم الشان تھا کہ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا۔ لولا ابوبکر لما عبد اللہ علی الارض۔ اگر ابوبکر نہ ہوتے تو زمین پر خدا کی عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ اسی قسم کا ایک فقرہ حضرت عائشہ سے بھی منقول ہے[۱]

خلافت فاروقی میں ایک نیا عنصر فساد

عہد نبوی اور عہد صدیقی میں یہ عنصر فساد عرب تک محدود تھا

---

[۱] ملاحظہ فرمایئے راقم الحروف کی کتاب "صدیق اکبر"

لیکن حضرت عمر کے عہد میں بیرونِ عرب فتوحات کے باعث جب عرب وعجم کا اختلاط ارتباط ہوا (جسے آگے چل کر ہم ذرا کسی قدر تفصیل سے بیان کریں گے) تو اب عناصر فساد میں ایک اور عنصر کا اضافہ ہوا اس عنصر کی ہلاکت انگیزی اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی تھی کہ حضرت عمر ایسا خلیفہ جس کے رعب داب اور دبدبہ سے بڑے بڑے سلاطین وقت ڈرتے تھے اس عنصر کی دسیسہ کاری کا نشانہ بن کر جام شہادت نوش کر گیا۔ حضرت عمر کی شہادت کا واقعہ ایک انفرادی اور استثنائی ہرگز نہیں ہے، بلکہ ایک سازش کا نتیجہ ہے، حضرت عمر خود اس خطرہ کو محسوس کرتے تھے چنانچہ جب ان پر حضرت مغیرہ بن شعبہ کے غلام ابولؤلؤ فیروز نے قاتلانہ حملہ کیا اور حضرت عمر کو حملہ آور کا نام ونشان معلوم ہوا تو آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے طنزاً کہا۔

"تم اور تمہارے والد ہی ان غلاموں کو مدینے میں رکھنے کے بڑے حامی تھے[1]"

پھر آپ نے یہ بھی دریافت فرمایا: أعن ملأ منكم هذا[2] کیا یہ تمہاری کسی جماعت کی طرف سے ہے، یعنی یہ حادثہ کسی سازش کا نتیجہ ہے؟

حضرت عمر کا شبہ بالکل صحیح تھا۔ ورنہ ایک مجوسی غلام کو مدینے جیسے شہر میں جو اسلامی حکومت کا مرکز تھا۔ حضرت عمر جیسے عظیم المرتبت خلیفہ پر عین فجر کی نماز میں جب کہ نمازیوں کی کئی کئی صفیں حضرت عمر کے پیچھے موجود ہیں اس دلیری کے ساتھ حملہ کرنے کی جرأت ہرگز نہیں ہوسکتی تھی اور وہ بھی ایک معمولی سی بات پر یعنی یہ کہ فیروز نے حضرت عمر سے شکایت کی کہ اس کے آقا (مغیرہ بن شعبہ) اس کی محنت مزدوری کا معاوضہ خاطر خواہ نہیں دے رہے ہیں اور حضرت عمر نے تحقیق کے بعد اس شکایت کو نامعقول سمجھ کر اس پر توجہ نہیں کی۔

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۴۴   [2] ایضاً، ۲۴۷

یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے اندازہ ہو گا کہ عہد عثمانی میں فتنہ کے جو اسباب پیدا ہوئے وہ اچانک پیدا نہیں ہو گئے، بلکہ ان کے جراثیم شروع سے موجود تھے اور عہد بہ عہد ان میں ترقی ہوتی رہی تھی۔ اب اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ان اسباب کا جائزہ لینا چاہیئے جو حضرت عثمان کے عہد میں پیدا ہوئے۔

فتنہ کے اسباب

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیرون عرب فتوحات کا آغاز ہوا تھا، حضرت عثمان کے عہد میں ان میں استحکام پیدا ہوا اور ان کے دائرہ میں بڑی وسعت بھی ہوئی، اس کی وجہ سے معاشرہ کی کیفیت کیا ہو گئی؟ اس پر ہم کسی قدر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں، تاکہ صحیح صورتِ حال کا اندازہ کرنا آسان ہو۔ اس عہد میں ممالک محروسۂ اسلامیہ میں جو مختلف قومیں اور قبائل آباد تھے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) عراق جب فتح ہوا ہے اس وقت وہ عرب کے مشہور قبیلے ربیعۃ اور مضر اور ان کی بعض شاخوں کا وطن تھا۔ باشندوں کا ایک حصہ فارسیوں پر مشتمل تھا جن میں سے بعض مزدک کے مذہب کے پیرو تھے اور بعض زردشتی مذہب کے، حضرت عمر نے ۱۵ھ میں بصرہ اور ۱۷ھ میں کوفہ جو آباد کیا تھا اس میں مصلحت یہی تھی کہ عرب صحرا کی ہوا اور فضا سے متمتع ہوتے رہیں اور مدائن اور قادسیہ کی شہری زندگی کی گھٹن سے محفوظ رہیں۔

(۲) فارس فتح کے وقت ایرانیوں کا وطن تھا جو عام طور پر مذہباً آتش پرست (مجوسی) تھے یہاں ایک مختصر تعداد یہودیوں اور رومیوں کی بھی تھی جو روم اور ایران کی لڑائیوں میں گرفتار ہو کر یہاں آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔

(۳) شام قدیم زمانہ سے فینیق، اموری، اور کنعانی وغیرہ مختلف قوموں اور ان کے تہذیب و تمدن کا مرکز تھا، فراعنۂ مصر، یونانی، رومی، اور آخر میں غسانۂ عرب کا رزم گاہ رہ چکا تھا

اسلام کے زیرنگیں آیا ہے اس وقت یہ رومی سلطنت کے ماتحت تھا، اس کے باشندے مذہبًا عیسائی اور تہذیب وتمدن کے اعتبار سے رومی تھے، اصل باشندگان ملک کے علاوہ یہاں ارمن، یہود، رومی، اور بعض عرب قبائل جن میں مشہور غسان، لخم، جذام، کلب، قضاعہ، اور تغلب ہیں، آباد تھے، یہ عرب قبائل شام کے جنوبی حصہ میں بہ نسبت شمالی حصہ کے زیادہ تھے، ان عرب قبائل کی زبان آرامی اور عربی کا مرکب تھی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو شامی النسل ہی سمجھتے تھے حجاز کے عربوں سے ان کا تعلق محض تجارتی تھا، یہی وجہ ہے کہ شام کے محاذ پر جب جنگ ہوئی تو انھوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں رومیوں کا ساتھ دیا۔

(۴) اب مصر کو لیجئے، وہ ایک قدیم تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہ چکا تھا جس کی تعمیر میں قدیم اہل مصر، یونانیوں اور رومیوں نے حصہ لیا تھا۔ اسکندریہ جو مصر کا ہی جزء تھا، فلسفہ اور مذہب کے مختلف مکاتبِ فکر، اور مشرقی ومغربی افکار ونظریات کا مرکز رہ چکا تھا۔ یہاں مصر کے اصل باشندوں کے ساتھ یہود اور رومی بھی رہتے تھے، مصر کے علاوہ طرابلس، ٹیونس، الجزائر اور مراکش جو تنگنائے جبل الطارق تک حضرت عثمان کے عہد میں فتح ہوئے وہ رومن امپائر کے ماتحت تھے۔

مسلمانوں نے ان ملکوں کو فتح کیا تو فاتح اور مفتوح میں جو عام تعلقات علیحدگی اور امتیاز کے ہوتے ہیں ان کے برعکس مسلمانوں اور مفتوحہ اقوام میں اختلاط وارتباط بہت شدید اور گہرا ہوگیا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام چھوت چھات اور انسان انسان کے درمیان فرق وامتیاز کا قائل نہیں ہے، علاوہ ازیں اس زمانہ استرقاق کا جو قاعدہ رائج تھا اس کی وجہ سے مسلمانوں کا ایک ایک گھر مفتوحہ اقوام کے جوان مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان مفتوحہ اقوام میں تھوڑے بہت دنوں قسم کے لوگ تھے، ایک وہ جو مسلمان ہوگئے تھے اور دوسرے وہ جو اب تک اپنے

مذاہب پر قائم تھے اور جزیہ دیتے تھے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا وہ سب یکساں فطرت اور طبیعت کے نہیں ہو سکتے تھے۔ ان میں ایک طبقہ جو اقلیت میں تھا ان حضرات کا تھا جنھوں نے اسلام کو صدق دل، خلوص نیت اور عزم بالجزم کے ساتھ قبول کیا اور اسی بنا پر قبل اسلام زندگی کی ہر چیز سے وہ پاک وصاف ہو گئے، یہی وہ حضرات تھے جن میں اکابر علماء مشائخ اور ارباب زہد وورع پیدا ہوئے، لیکن اس طبقہ کے برخلاف اکثریت ایسے افراد واشخاص پر مشتمل تھی جو اگرچہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے تاہم ان کے قدیم مذاہب اور ثقافت کے اثرات اور ان کے باعث ان کا قومی افتخار اور تہذیبی برتری کا اذعان واحساس ان کے قلب ودماغ سے فنا نہیں ہوا تھا، یہی وہ احساس ہے جس نے آگے چل کر شعوبیہ تحریک کی شکل اختیار کر لی یہ طبقہ حلقہ بگوشان اسلام کا تھا۔ ان کے علاوہ وہ طبقہ تو تھا ہی جس نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ تہذیبی وتمدنی میلانات، ورجحانات اور قومی افتخار واحساس برتری میں یہ دونوں طبقے ایک تھے، ان کی وجہ سے ممالک اسلامیہ اور مدینہ بھی ان سے مستثنیٰ نہیں تھا، مختلف میلانات ورجحانات اور افکار ونظریات کے سخت تصادم وتزاحم اور ان کی کشمکش کی آماج گاہ بن گئے۔

اس کشمکش کا مذہبی فکری اور تہذیبی اثر عربوں پر کیا ہوا؟ یہ ہمارے موضوع سے باہر ہے، البتہ اس کشمکش کا سیاسی پہلو کیا تھا؟ اس کا جائزہ لینا ضروری ہے اس کا ذکر مصر کے ایک نامور مصنف ڈاکٹر علی حسن الخربوطلی کی زبان سے سنئے، موصوف کہتے ہیں:

حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کے جو سیاسی اسباب ہیں، ان میں پہلا سبب یہ ہے کہ اسلامی ممالک کے بعض لوگ سرے سے اسلامی عربی حکومت کے ہی خلاف تھے، یہ حقیقت سب سے زیادہ نمایاں عراق میں

تھی۔ اگرچہ اس کی شاخیں مصر اور شام میں بھی پھیلی ہوئی تھیں، عراق میں موالی اور حیرہ کے عرب اسلامی عربی حکومت کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایران کی حکومت نے حیرہ کے والی نعمان بن منذر (بن ماء السماء) کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا اور حیرہ کی آزادی ختم کر دی تو اس وقت سے عرب حیرہ ایران کے سخت مخالف اور دشمن ہو گئے تھے، چنانچہ جنگ ذی قار جو ۶۱۰ھ میں ہوئی وہ اسی کا نتیجہ تھی۔ جب حضرت عمرؓ کے عہد میں عراق پر حملہ ہوا تو حیرہ کے عربوں نے اس جنگ میں ایران کے برخلاف مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ کیونکہ انھیں توقع تھی کہ اس طرح ان کی آزادی انھیں واپس مل جائے گی، لیکن جب ان پر جزیہ لگایا گیا اور ذمیوں کا معاملہ ان سے کیا گیا تو انھیں مایوسی ہوئی اور اب وہ عربوں کی اسلامی حکومت کے بھی مخالف ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں تو یہ کچھ کر نہ سکتے تھے، اس لیے خاموش رہے، حضرت عثمانؓ کے خلاف لوگوں کو چہ میگوئیاں کرتے سنا تو اب ان کو بھی شورش و بغاوت برپا کرنے کی ہمت ہوئی [۱]

عرب حیرہ کے علاوہ موالی نے جو فتنہ پیدا کیا تھا، امیر معاویہ بن ابی سفیان نے اس کو اسی وقت بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: "میں دیکھتا ہوں کہ فارس اور روم کے موالی کی بڑی کثرت ہو گئی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ عربوں اور ان کے اقتدار پر حملہ کریں گے۔ [۲]

علاوہ ازیں اس وقت یعنی خلافت عثمانی میں عام سیاسی جوڑ توڑ کا کیا عالم تھا؟

۱؎ الدولة العربية الاسلامية : قاہرہ ص ۹۸ - ۱۰۰

۲؎ العقد الفريد ابن عبد ربہ ج ۲ ص ۹۰

اس کا اندازہ مصر کے ایک اور نامور مصنف اور مورخ استاذ احمد امینی کے اقتباس ذیل سے ہوگا، کہتے ہیں:

"سچ یہ ہے کہ اگرچہ مورخین نے اس کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ اس وقت اسلام میں اور دوسرے مذاہب میں سخت کشمکش برپا تھی۔ نہ صرف مذہب میں' بلکہ عربی زبان اور دوسری فارسی، قبطی، یونانی وعبرانی زبانوں میں، عربی آرزوؤں اور تمناؤں میں اور غیر عرب قوموں کی امنگوں اور امیدوں میں، عربوں کے سیدھے سادے نظام زندگی میں اور ایرانی اور رومی اقوام کے طور طریق زندگی میں، غرض کہ کوئی شعبہ زندگی ایسا نہیں تھا جس میں عرب اور غیر عرب اقوام وملل میں شدید کشمکش اور نزاع برپا نہ ہو، اہل فارس اپنی قدیم مملکت کی یاد کو دل سے لگائے بیٹھے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ مہذب اور متمدن قوم کی نشانی ہیں۔ اسی طرح رومیوں کو اپنے نظام زندگی پر فخر تھا، مصر جو دنیا کی ایک عظیم تہذیب کا مرکز رہ چکا تھا وہ بھی استقلال وآزادی اور خود مختاری کی آرزو میں کسی سے کم نہیں تھا۔ اس ہمہ جہتی کشمکش اور نزاع باہمی کے باعث درحقیقت پوری مملکت اسلامیہ اس وقت افکار ونظریات اور میلانات ورجحانات کی معرکہ زار بنی ہوئی تھی"۔[1]

بنوہاشم کی مخالفت

اس صورت حال کا زیادہ افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ یہ کشمکش اور تصادم صرف عرب اور غیر عرب میں نہیں تھا بلکہ اسلام نے جس قبائلی عصبیت کو ختم کر دیا تھا وہ پھر ابھر آئی تھی اور بنو ہاشم اور بعض ان کے ساتھی قبیلے بنو امیہ میں خلافت کو پسند نہیں کرتے تھے اور اس لیے حضرت عثمان کے مخالف تھے بنو ہاشم شروع سے خلافت کو اپنا واجبی حق سمجھتے تھے اور اس کے حصول کے لئے مساعی

---

[1] فجر الاسلام دسواں اڈیشن ص ۹۵

بھی تھے، چنانچہ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن حضرت علی مکان سے باہر نکلے، لوگوں نے پوچھا: اب رسول اللہ کا مزاج کیسا ہے؟ چونکہ حالت سنبھل گئی تھی اس لیے حضرت علی نے اطمینان کا اظہار فرمایا۔ اس پر حضرت عباس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا: خدا کی قسم تم تین دن کے بعد غلامی کرو گے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ رسول اللہ عنقریب اس مرض میں وفات پائیں گے۔ کیونکہ مجھ کو اس کا تجربہ ہے کہ خاندان عبدالمطلب کا چہرہ موت کے قریب کس طرح متغیر ہو جاتا ہے، آؤ چلیں، رسول اللہ سے پوچھ لیں کہ آپ کے بعد یہ منصب خلافت کس کو حاصل ہو گا اگر ہم اس کے مستحق ہیں تو رسول اللہ ہمارے لیے وصیت فرما دیں گے، حضرت علی نے جواب دیا: "میں نہ پوچھوں گا کیونکہ اگر پوچھنے پر آپ نے انکار کر دیا تو پھر آئندہ کوئی امید باقی نہیں رہے گی [1] ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی نے فرمایا: میں ہرگز نہ پوچھوں گا۔ کیونکہ رسول اللہ حضرت ابوبکر سے نماز میں جو امامت کرا رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ان ہی کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں اور درحقیقت ہیں بھی وہ اس کے مستحق۔[2]

حضرت علی نے جو کچھ فرمایا بنی ہاشم نے اس پر قناعت نہ کی، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد حضرت فاطمہ کے مکان میں خلافت پر مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عمر کی زبانی روایت ہے کہ جب اللہ نے اپنے نبی کو اٹھا لیا تو انصار نے ہم مہاجرین کی مخالفت کی اور وہ سب سقیفۂ بنی ساعدہ میں مجتمع ہوئے۔ ان کے علاوہ علی، زبیر اور جو ان کے ساتھی تھے (یعنی بنی ہاشم) وہ

---

[1] صحیح بخاری باب مرض النبی

[2] ملاحظہ کیجیے۔ صدیق اکبر

بھی ہمارے مخالف تھے، مہاجرین ابوبکر کے پاس جمع ہوئے۔[1]

بقول مولانا شبلی کے[2] "یہ تقریر حضرت عمر نے ایک بہت بڑے مجمع عام میں کی تھی جس میں سیکڑوں صحابہ موجود تھے، اس لیے اس بات کا گمان نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے کوئی امر خلاف واقعہ کہا ہو، ورنہ لوگ ان کو وہیں ٹوکتے۔" حافظ ابن حجر نے امام مالک اور معمر سے ایک روایت نقل کی ہے اس میں صراحت کے ساتھ یہ مذکور ہے کہ حضرت علی حضرت زبیر اور ان کے ساتھیوں کا یہ اجتماع حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ کے گھر میں ہوا تھا[3] پھر تاریخ طبری میں تو یہاں تک ہے کہ:

تخلف علی والزبیر واخترط الزبیر	علی اور زبیر نے علیحدگی اختیار کی، اور زبیر نے
سیفه وقال: لا اغمد نه حتی یبایع	تلوار کھینچ لی اور بولے: جب تک علی کے ہاتھ پر
علی[4]	بیعت نہ ہوگی میں تلوار کو میان میں نہ رکھوں گا۔

ان روایات سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت سے ہی بنی ہاشم اس خیال اور فکر میں تھے کہ خلافت ان کو ملنی چاہیے، لیکن شیخین کے عہد میں اس بنیاد پر انھوں نے محاذ آرائی نہ کی۔ کیونکہ خلافت صدیقی کا زمانہ اسلام کی بنیادیں مضبوط کرنے اور اس کی شدید مخالفتوں کے قلع قمع کرنے میں بسر ہوا اور خلافت فاروقی کا عہد توسیع مملکت اور پے درپے فتوحات کا عہد تھا۔ علاوہ ازیں شیخین کا طرز حکومت ایسا تھا کہ بڑے سے بڑے مخالف کو بھی ان کی علانیہ مخالفت

---

[1] صحیح بخاری کتاب الحدود باب رجم الحبلیٰ

[2] الفاروق ج ۱ ص ۶۲

[3] فتح الباری جلد ۱۵ ص ۱۶۳

[4] ج

کرنے کی جرأت نہ ہوسکتی تھی۔ حضرت عثمان طبیعت کے نرم تھے اور انھوں نے بنوامیہ پر جو لطف وکرم کیا اس کی وجہ سے اور چند وجوہ سے ملک میں ان کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہوئیں تو اب بنی ہاشم کا دیرینہ جذبۂ خیال از سرنو بیدار ہو گیا اور وہ علانیہ اس کا چرچا کرنے لگے۔

حضرت علی کی شخصیت

اس موقع پر اس کا اظہار کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ حضرت علی بنی ہاشم کی سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز شخصیت تھے اور بنو ہاشم جو کچھ کہتے یا کرتے تھے حضرت علی کی خلافت کے عنوان سے کہتے یا کرتے تھے، لیکن جہاں تک خود حضرت علی کی ذات کا تعلق ہے ان کا ذہن اس معاملہ میں بالکل صاف تھا۔ چنانچہ حضرت عباس کو انھوں نے جو جواب دیا وہ گذر چکا ہے۔ پھر حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب "صدیق اکبر" میں ثابت کیا ہے حضرت علی نے بھی بلا تاخیر بیعت عامہ کے وقت حضرت ابوبکر سے بیعت کی ہے، اس پر ابوسفیان نے ان کو طعنہ دیا تو انھوں نے اس کا نہایت سخت جواب دے کر ابوسفیان کو خاموش کر دیا۔ علاوہ ازیں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے عہد میں ان کا جو مصالحانہ اور اشتراک وتعاون کا معاملہ رہا ہے وہ تاریخ کی روشن حقیقت ہے، خلیفۂ دوم کی شہادت کے بعد جب عبدالرحمن بن عوف نے بحیثیت حکم کے خلافت کے لیے حضرت عثمان کو منتخب کر لیا تو حضرت علی نے ان کے اس فیصلہ کو بطیب خاطر قبول فرمالیا، چنانچہ خلیفۂ سوم سے سب سے پہلے بیعت آپ نے کی اور اشارۃً وکنایتًا بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کیا کہ ان کی حق تلفی ہوئی ہے۔ ورنہ اگر اس وقت شیر خدا کا ذرا سا اشارہ بھی ملتا تو ہزاروں تلواریں نیام سے باہر آسکتی تھیں، اور حق یہ ہے کہ ولایت ومعرفت اور انابت الی اللہ کے جس اعلیٰ مقام پر حضرت علی فائز تھے اس کا تقاضہ ہی یہی تھا، آئندہ اس کی اور شہادتیں آئیں گی، اوپر آپ نے پڑھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

وفات کے بعد انصار کا اجتماع سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا تو ساتھ ہی بنو ہاشم کا اجتماع حضرت فاطمہ کے گھر میں ہوا جس میں خود حضرت علی بھی شریک تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس اجتماع میں عمائد بنی ہاشم نے حضرت علی پر ضرور زور ڈالا ہوگا کہ وہ ادعائے خلافت کریں اور حضرت علی نے اس سے صاف انکار کردیا ہوگا چنانچہ مذکورۂ بالا روایات متعلقہ میں اس کا تو ذکر ہے کہ حضرت علی اور حضرت زبیر وغیرہما جمع ہوئے، لیکن وہاں کیا گفتگو ہوئی؟ اس کا ذکر نہیں ہے، نیز بنی ہاشم کے اس اجتماع کا ایسا چرچا بھی نہیں ہوا جیسا کہ انصار کے اجتماع کا ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ بنی ہاشم کو خیال ضرور تھا۔ انھوں نے بیٹھ کر آپس میں گفتگو بھی کی۔ لیکن جب حضرت علی کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی تو بات رفت گذشت ہو گئی۔

تاہم جس طرح ہر تحریک کا قاعدہ ہے کہ اس کو موثر بنانے کے لیے کسی بڑی شخصیت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ خلافت عثمانی میں بنو ہاشم کی یہ تحریک شروع ہوئی تو اس کا ہیرو حضرت علی کو ہی قرار دیا گیا۔ پھر اس مرتبہ بنو ہاشم میدان میں نہ تھے بلکہ عرب اور غیر عرب لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان کی ہم نوا تھی۔ ڈاکٹر علی حسنی خربوطلی لکھتے ہیں

> "حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کے سیاسی اسباب میں سے ایک دوسرا سبب یہ ہے کہ عرب ہوں یا موالی، ان کی بڑی تعداد بنو امیہ کو پسند نہیں کرتی تھی جس کے مظہر حضرت عثمان تھے، اور ان کے بالمقابل بنو ہاشم کو سب پسند کرتے تھے جس کے نمائندہ حضرت علی تھے، حضرت عثمان کی خلافت کے زیر سایہ بنو امیہ جس طرح اقتدار اور دولت پر قابض ہوتے چلے گئے اس سے بنو ہاشم کی تحریک کو بڑی تقویت ہوئی [۱]۔"

---

[۱] الدولۃ العربیۃ الاسلامیۃ ص ۱۰۵

علاوہ ازیں جیسا کہ پروفیسر آرنلڈ نے لکھا[1] ہے یہ امر بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ حضرت علی کی طرف فارس کے لوگوں کے عام میلان و رجحان کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ امام حسین کا نکاح ایران کے آخری شہنشاہ یزدگرد کی بیٹی شہر بانو سے ہوا تھا، اس رشتہ کے باعث اہل فارس کو توقع تھی کہ اگر خلافت حضرت علی کی طرف منتقل ہوگئی تو ان کو اس سے بہت کچھ فوائد پہونچیں گے اور نفسیاتی طور پر ان کو یہ اطمینان بھی رہے گا کہ فارس پر ساسانی خاندان کا قبضہ نہ سہی اس کے سمدھیانہ کا تو ہے۔

افراط زر اور دولت کی فراوانی

تیسرا سبب یہ ہے کہ فتوحات کی غیر معمولی وسعت اور تجارت وصنعت اور زراعت میں عام ترقی کے باعث ملک میں دولت کی فراوانی پیدا ہوگئی۔ دولت کی فراوانی کے باعث لوگوں کا معیار زندگی اونچا ہوا۔ رومیوں اور ایرانیوں کے ساتھ اختلاط کے باعث عیش وعشرت اور تکلفات کے جو طور طریقے اور انداز ان کے تھے وہ عربوں نے بھی اختیار کر لیے۔ خود حضرت عثمان کا حال یہ تھا کہ مدینہ میں اپنی بیویوں اور بیٹوں کے لیے الگ الگ سات عظیم الشان مکانات بنوائے جن کی تعمیر اس زمانہ کے اعلیٰ ساز وسامان سے ہوئی تھی اس کے علاوہ ایک ہزار غلام اور لاکھوں روپیہ کی جاگیر و جائدادیں مدینہ اور دوسرے شہروں میں اور ہزاروں مویشی آپ کی ملکیت میں تھے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب دولت وہ تھی جو حضرت عثمان نے تجارت سے پیدا کی تھی اور جس کی وجہ سے ان کا لقب شروع سے غنی تھا، چنانچہ حضرت عثمان کی اس دولت مندی کا ذکر کرنے کے بعد استاذ کرد علی لکھتے ہیں:

---

[1] دی پریچنگ آف اسلام عربی ترجمہ از ڈاکٹر حسن ابراہیم وغیرہ ص ۱۸۱

ولم یخلط من اموال المسلمین و اخماس الغنائم فی مالہ شیئاً قط۔[1]	اور حضرت عثمان نے مسلمانوں کے اموال اور مال غنیمت کے خمس میں سے کسی چیز کو کبھی اپنی ذاتی دولت کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا۔

اسی طرح اور بعض اکابر صحابہ کا حال بھی یہی تھا۔ مثلاً حضرت زبیر بن عوام نے بصرہ میں ایک شاندار مکان بنوایا تھا جو مسعودی المتوفی ۳۴۲ھ کے زمانہ میں بھی باقی اور مشہور تھا اس کے علاوہ کوفہ، مصر اور اسکندریہ میں بھی ان کے عالیشان مکان اور جائدادیں تھیں، جب ان کی وفات ہوئی تو ترکہ کا اندازہ پچاس ہزار دینار، ایکہزار گھوڑے اور ایک ہزار باندی غلام کیا جاتا ہے[2] طلحہ بن عبید اللہ التیمی نے کوفہ محلہ میں ایک عالیشان مکان بنایا تھا جو دار الطلحیین کے نام سے عرصہ تک مشہور رہا، ان کی آمدنی جو عراق کی جائدادوں سے آتی تھی ایک ہزار دینار روزانہ تھی مدینہ میں ان کا جو پرانا مکان تھا انھوں نے اس کی بھی تعمیر نو، پختہ اینٹ، گچ اور شیشم سے کرائی تھی[3] حضرت عبد الرحمن بن عوف الزہری کا مکان بھی ایک محل تھا، اصطبل میں سو گھوڑے اور چراگاہ میں ایک ہزار اونٹ اور دس ہزار بکریاں موجود رہتی تھیں، ان کا ترکہ تین لاکھ چھتیس ہزار دینار تھا حضرت سعد بن ابی وقاص نے گھر عقیق سے بنوایا تھا۔ کاتب وحی حضرت زید بن ثابت کی وفات پر ان کے ترکہ میں سونے اور چاندی کی ایسی اینٹیں دست یاب ہوئیں جنھیں کلہاڑیوں سے توڑا گیا۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ دینار کی جائداد الگ چھوڑی تھی، مقداد بن اسود نے مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر ایک عالیشان مکان تعمیر کرایا تھا جس میں کنگرے بنے ہوئے تھے اور اندر باہر سب گچ سے تیار ہوا تھا۔ یعلی بن منیہ کا انتقال ہوا تو پانچ لاکھ دینار نقد

---

[1] الاسلام والحضارۃ العربیۃ ج ۱ ص ۱۵۹

[2] مروج الذہب ج ۲ ص ۳۴۲

[3] ایضاً

اور تین لاکھ دینار کی جائداد چھوڑی۔[۱]

گرانی

جب ایک طبقہ میں افراط زر کا دور دورہ ہوتا ہے تو اشیاء کی قیمتوں میں گرانی اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، چنانچہ مورخین کا بیان ہے کہ حضرت عثمان کے زمانہ میں ایک ایک گھوڑے کی قیمت ایک لاکھ درہم اور مدینہ میں ایک ایک باغ کی قیمت چار چار لاکھ درہم ہوتی تھی۔[۲]

حضرت ابوذر غفاری کی تحریک

یہ معلوم ہے کہ قریش کا پیشہ تجارت تھا اور انصار ارباب زراعت و فلاحت تھے، اس بنا پر عہد نبوی اور عہد شیخین میں بھی صحابہ میں بڑے بڑے دولت مند اور متمول لوگ تھے، لیکن ان کی دولت اسلام اور ملت کی خدمت کے لیے وقف تھی، خود ان کا طرز بود و باش سادہ تھا اور قرآن مجید میں ایک شخص کی دولت میں جن لوگوں کے حقوق معین کر کے بیان کئے گئے ہیں یہ حضرات ان سب حقوق کا پورا خیال اور لحاظ رکھتے تھے لیکن حضرت عثمان کے عہد میں اب صورت حال یہ ہوگئی کہ مسلم معاشرہ بلاوت کی زندگی۔ (Rural Living) سے نکل کر حضارت اور شہریت (Urbane life) کی زندگی میں داخل ہو رہا تھا۔ ایرانی اور رومی تکلفات اور عیش و عشرت کے ساز و سامان معاشرہ میں رواج پذیر تھے۔ یہ تو عرب سوسائٹی کا حال تھا۔ مفتوحہ اقوام میں جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام پہلے سے رائج تھا۔ امراء اور ارباب دولت و ثروت عیش و عشرت، راحت طلبی اور غریبوں کی محنت و جفاکشی کے بل بوتہ پر تن آسانی کی زندگی کے پہلے سے عادی تھے نتیجہ وہی ہوا جو ان حالات میں ناگزیر طریقہ پر ہوتا ہے۔ ملک میں طبقاتیت پیدا ہوگئی

---

[۱] یہ سب واقعات مروج الذہب ج ۲ ص ۳۴۲ و ۳۴۳ سے ماخوذ ہیں

[۲] الاسلام والحضارۃ العربیہ کرد علی ج ۱ ص ۱۶۰

ایک طرف طبقہ امرا تھا اور دوسری طرف غریبوں اور مالی اعتبار سے بدنصیب لوگوں کا طبقہ۔ قانون فطرت کے مطابق موخر الذکر طبقہ کو پہلے طبقہ پر سخت غیظ وغضب تھا اور اس طرح وہ طبقاتی کشمکش شروع ہوئی جس نے تاریخ میں بڑے بڑے انقلابات پیدا کیے ہیں۔

حضرت[1] ابوذر غفاری المتوفی ۳۲ھ مطابق ۶۵۲ء اکابر صحابہ میں سے تھے، اسلام لانے میں ان کا مرتبہ چوتھا یا پانچواں ہے، سچائی میں ضرب المثل ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت مسیح سے تشبیہ دی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تحیہ اسلامی طریقہ پر کیا ہے، خود تارک الدنیا تھے، جمع زر کو مطلقاً (اس پر زکوٰۃ دی گئی ہو یا نہ دی گئی ہو) حرام جانتے تھے اور استدلال اس آیت سے تھا۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم ٭ یوم یحمٰی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون

(سورۃ التوبہ)

اور جو لوگ سونا چاندی سینت سینت کر رکھتے ہیں اللہ کے راستے میں اسے خرچ نہیں کرتے آپ ان کو سخت دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے جو اس دن ہوگا جب کہ ان کے سونے چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیوں کو اور ان کے پہلوؤں اور کمروں کو داغا جائے گا کہ لو! یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر کے رکھا تھا۔ اب اس کا مزہ چکھو!

---

[1] حضرت ابوذر غفاری کے حالات کے لیے دیکھئے: طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۱۶۱-۱۷۵، الاصابۃ ج ۴ ص ۶۰، صفۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۲۳۸، حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۱۵۶ (باقی صفحہ ۔ پر)

ان کا مسلک تھا کہ ایک شخص کو اپنی کمائی میں سے صرف اتنا رکھنا چاہیئے جو اس کی ضرورت کے لیے کافی ہو ان کا یہ نظریہ قرآن مجید کی ان دو آیات پر مبنی تھا۔

(۱) یسئلونک ماذا ینفقون ، اے پیغمبر! آپ سے پوچھتے ہیں: کتنا خرچ کریں"
قل العفو آپ کہہ دیجئے: جتنا بھی زائد ہو،

(۲) وفی اموالکم حق معلوم ہ اے مسلمانو! تمہاری دولت میں فقیروں اور حاجتمندوں
للسائل والمحروم ہ کا بھی مقررہ حق ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد شام چلے گئے اور کسی دیہات میں رہنے لگے، شیخین کے عہد خلافت میں بھی یہیں قیام پذیر رہے، حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو دمشق میں سکونت اختیار کرلی۔ شام دولت وغربت کی بنا پر طبقاتی کشمکش کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ حضرت ابوذر غفاری اسے کس طرح برداشت کر سکتے تھے، دیکھا کہ طبقۂ امراء عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں کا جو حق مقرر کیا ہے، اس کو کماحقہ ادا نہیں کیا جا رہا ہے تو اب انھوں نے اپنا معمول یہ بنالیا کہ وہ امیروں کے پاس جاتے اور فرماتے: اے لوگو! تم فقیروں کی خبر گیری کرو، اور جن آیات میں جمع زر کی مذمت کی گئی ہے، انھیں پڑھ پڑھ کے سناتے اور عذاب آخرت سے ڈراتے تھے" حضرت ابوذر کی ان برملا تقریروں کا اثر یہ ہوا کہ غربا نے امرا پر دست درازی شروع کردی، جس سے ان کی زندگی اجیرن ہوگئی، ان لوگوں نے امیر معاویہ گورنر شام سے شکایت کی، امیر معاویہ نے حضرت عثمان کو خط لکھا کہ ابوذر نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے، یہاں وہ ایسی ایسی باتیں کر رہے ہے

(بقیہ حاشیہ:) ذیل المذیل ص ۲۷، الذہبیۃ ج ۱ ص ۳۱۶، الکنیٰ والاسماء، ج ۱ ص ۲۸، سیر اعلام النبلاء امام ذھبی جلد ثانی

ہیں"۔ یہ سن ۳۰ھ کی بات تھی، حضرت عثمان نے جواب میں لکھا: فتنہ نے اپنی سونڈھ ہلانی شروع کردی ہے، اس لیے تم اغماض اور مصالحت سے کام لو اور زخم مت کریدو، اور ابوذر کو ایک راہنما۔ اور سامان سفر کے ساتھ میرے پاس روانہ کردو، اور دیکھو! ابوذر کے ساتھ ملاطفت اور نرمی کا معاملہ کرنا، اور جہاں تک ہوسکے تم خود اپنے آپ کو اور لوگوں کو ان سے تعرض کرنے سے روکے رہو۔

امیر معاویہ نے حکم کی تعمیل کی اور حضرت ابوذر کو مدینہ روانہ کردیا، لیکن مدینہ وہ نہیں تھا جو پہلے تھا۔ اب یہاں شاندار عمارتیں، مکانات اور حویلیاں کھڑی ہوئی تھیں، حضرت ابوذر نے یہ رنگ دیکھا تو بولے: اے مدینہ والو! ڈرو اس لوٹ مار اور ضرب وحرب سے جس کا ہنگامہ یہاں برپا ہونے والا ہے" پھر حضرت عثمان سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے پوچھا: "کیا بات ہے کہ شام کے لوگ آپ کی شکایت کرتے ہیں، تو حضرت ابوذر نے فرمایا: "مال کو یوں نہ کہو کہ وہ اللہ کا مال ہے، بلکہ یہ کہو کہ وہ مسلمانوں کا مال ہے، اس کے علاوہ انھوں نے فرمایا میں دولتمندوں سے کہتا ہوں کہ مال کا جمع رکھنا جائز نہیں ہے، اس کو ضرورت مندوں پر تقسیم کردو حضرت عثمان نے جواب میں کہا: ابوذر! تم اس معاملہ کو میرے اوپر چھوڑ دو، میرا جو فرض ہے میں اس کو انجام دوں گا اور لوگوں پر جو واجب ہے وہ میں ان سے وصول کروں گا پھر فرمایا: میں لوگوں کو زہد پر مجبور نہیں کروں گا۔ بلکہ میں ان کو جد وجہد اور میانہ روی کی دعوت دیتا ہوں۔"

ان حالات میں حضرت ابوذر کا مدینہ میں قیام کرنا مشکل تھا، اس لیے حضرت عثمان کی اجازت سے ربذہ جو مدینہ (جو مکہ کے راستے میں مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک دیہات ہے) وہاں آئے اور سکونت پذیر ہوگئے۔ یہاں انھوں نے ایک مسجد تعمیر کی حضرت عثمان نے ان کی گذر بسر کے لیے دو غلاموں اور چند اونٹوں کا انتظام کردیا

اور درخواست کی کہ آپ وقتاً فوقتاً مدینہ آتے جاتے رہیں، تاکہ آپ پر بدویت غالب نہ ہو، چنانچہ راوی کا بیان ہے کہ حضرت ابوذر مدینہ آتے جاتے رہتے تھے[۱] عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ اسی اثنا میں ایک مرتبہ ربذہ سے مدینہ آئے، یہاں حضرت عثمان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ فرمایا: جو لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں ان کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے، بلکہ ان کو اپنے پڑوسیوں اور بھائیوں کے ساتھ احسان اور اعزا و اقربا کے ساتھ صلۂ رحمی کا بھی معاملہ کرنا چاہیئے" کعب الاحبار اس مجلس میں موجود تھے انھوں نے کہا: جس شخص نے زکوٰۃ ادا کردی اس نے اپنا فرض ادا کردیا حضرت ابوذر کو یہ سن کر غصہ آگیا، انھوں نے اپنی سپر اٹھائی اور کعب الاحبار کو اس سے زخمی کردیا۔ حضرت عثمان نے سپر ان سے لے لی اور فرمایا: ابوذر! خدا کا خوف کرو اور اپنے ہاتھ اور اپنی زبان قابو میں رکھو[۲]

حضرت ابوذر جس بات کی تلقین دوسروں کو کرتے تھے خود ان کا عمل بھی بڑی شدت سے اس پر تھا۔ ایک مرتبہ امیر معاویہ نے (غالباً بغرض امتحان) انکی خدمت میں ایک ہزار دینار بھیجے، انھوں نے اسے قبول فرمالیا۔ لیکن دوسرے دن امیر معاویہ نے آدمی بھیجا کہ وہ رقم ان سے واپس لے آئے تو انھیں یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ حضرت ابوذر نے رقم لیتے ہی فوراً رقم تقسیم کردی اور اس میں سے اپنے لیے ایک حبہ بھی نہیں رکھا، ماہ ذی الحجہ ۳۲ھ میں جب ان کا انتقال ہونے لگا تو گھر میں ایک بکری تھی، بیٹی کو وصیت کی کہ میرے انتقال کے بعد تم کو چند آدمیوں کا ایک قافلہ جاتا ہوا ملے گا۔ تم اس قافلہ کو میرے انتقال کی خبر دینا۔ پھر جب وہ قافلہ میری تکفین و

---

[۱] تاریخ الطبری ج ۴ ص ۲۸۳ و ۲۸۴

[۲] ایضاً

تدفین سے فارغ ہوکر جانے لگے تو تم میری طرف سے ان کو قسم دے کر اس بکری کو ذبح کر کے ان سب کو کھانا کھلانا۔ بیٹی نے وصیت پر عمل کیا۔ اتفاق سے یہ قافلہ جن حضرات پر مشتمل تھا ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود بھی تھے ان کو حضرت ابوذر غفاری کی وفات کی اور وہ بھی اس تنہائی اور کس مپرسی کے عالم میں، خبر ہوئی تو بے ساختہ رو پڑے، اور بولے: سچ فرمایا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ابوذر تنہائی کی حالت میں مرے گا اور اسی حالت میں قیامت میں اٹھایا جائے گا۔ اس کے بعد قافلہ نے میت کو غسل دیا، تکفین و تدفین کی، اس سے فارغ ہو کر جب چلنے لگے تو صاحب زادی نے باپ کا پیغام پہونچا کر سب کو کھانا کھلایا۔ جب یہ قافلہ جو غالباً حج کرنے جا رہا تھا مکہ پہونچا اور وہاں حضرت عثمان کو اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع دی تو آپ کو سخت ملال اور صدمہ ہوا، مکہ سے واپسی میں ربذہ کا راستہ اختیار کیا، اور وہاں حضرت ابوذر غفاری کے متعلقین کو ہمراہ لے کر مدینہ پہونچے اور اپنے متعلقین کے ساتھ ہی ان سب کے قیام کا انتظام فرمایا۔[1]

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

حضرت ابوذر غفاری کے تذکرہ میں ہم نے قصداً کسی قدر تفصیل سے کام لیا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مورخین کے بیانات سے اس سلسلے میں متعدد غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں ہم ان کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) امین احمد۔[2] خیر الدین الزرکلی،[3] علی حسن الخربوطلی،[4] ان تینوں نے لکھا ہے کہ حضرت

---

[1] تاریخ طبری ج ۴ ص ۳۰۸ و ۳۰۹، یہی واقعہ ابن اثیر اور نویری نے لکھا ہے۔

[2] فجر الاسلام دسواں اڈیشن ص ۱۱۱

[3] اعلام الرجال ج ۲ ص ۱۳۶

[4] الدولۃ العربیۃ الاسلامیہ ص ۱۰۳

ابوذر غفاری مزدک کی تحریک اور اس کے مکتبۂ خیال سے متاثر تھے۔ اس بنا پر انھوں نے ان کو "اول اشتراکی فی الاسلام" یعنی اسلام میں سب سے پہلا کمیونسٹ کہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ابوذر غفاری جیسے جلیل القدر صحابی کی توہین اور تنقیص اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی تھی کہ ان کی کسی تحریک یا ان کے کسی نظریہ کو زمانۂ قدیم کے کسی باطل مذہب کے نظریہ سے مستفاد اور متاثر بتایا جائے، اصل یہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاری کا نظریہ جو کچھ بھی تھا قرآن کی آیات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خود اپنی زندگی اور فقر و درویشی اور زہد و اتقا کے بارہ میں آپ کے ارشادات پر مبنی تھا اور شروع سے تھا، چنانچہ ان کی زندگی میں کبھی کوئی دن ایسا نہیں آیا جب کہ انھوں نے دولت کو منہ لگایا ہو۔

(۲) اس سلسلے میں ایک دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ جب حضرت ابوذر غفاری مدینہ تشریف لائے اور یہاں بھی دولت مندوں کے خلاف آپ نے اپنی تحریک جاری رکھی تو حضرت عثمان نے آپ کو ربذہ کی طرف جلاوطن کر دیا، حالانکہ طبری کے حوالہ سے جس کی تائید دوسرے ماخذ سے بھی ہوتی ہے، یہ بات صاف ظاہر ہے کہ حضرت عثمان کی خواہش یہ تھی کہ حضرت ابوذر، مدینہ میں آپ کے پاس رہیں اور آپ ان کے اخراجات کے متکفل ہوں، لیکن آپ (حضرت ابوذر) نے مدینہ میں دولت و ثروت کے جو مظاہرے دیکھے اس سے آپ کو وحشت ہونے لگی، اور آپ خود حضرت عثمان کی اجازت سے ربذہ میں آکر مقیم ہو گئے، اور حضرت عثمان نے یہاں ان کے لیے خورد و نوش کا انتظام فرما دیا[۱] پھر جب حج کے موقعہ پر مکہ میں حضرت ابوذر کی وفات کا

---

[۱] علامہ ذہبی صاف طور پر لکھتے ہیں: "خدا کی قسم! حضرت عثمان نے حضرت ابوذر کو جلاوطن نہیں کیا تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "ابوذر! جب مدینہ (باقی صفحہ ۔ پر)

علم ہوا تو آپ کو سخت صدمہ ہوا، مکہ سے ربذہ آئے اور حضرت ابوذر غفاری کی صاحب زادی کو اپنے ساتھ لے آئے اور اولاد کی طرح رکھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمان دوسرے اکابر صحابہ کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ حضرت ابوذر جو کچھ فرماتے ہیں وہ غایت زہد و تقوی کی بات ہے، اس پر خواص ہی عمل کر سکتے ہیں اور جو چیز (یعنی جمع زر و مال) شرعاً مباح ہے، اس کے ساتھ حرام تسے کا سا برتاؤ کرنا انفرادی طور پر ایک اعلی اخلاقی فضیلت تو ہو سکتا ہے، ایک عام سماجی اصول اور طرز زندگی ہرگز نہیں ہو سکتا۔

عبداللہ بن سبا کی تحریک

قاعدہ ہے کہ جب کسی ملک کے سماجی اور اقتصادی حالات اتھل پتھل اور عام اخلاق اور ذہن ان سے متاثر ہوتے ہیں تو بعض لوگ کسی تحریک کے بانی اور قائد کی حیثیت سے ابھرتے ہیں اور اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کی غرض سے ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، چنانچہ اس وقت مملکت اسلامیہ کے جو حالات تھے انھیں دیکھ کر عبداللہ بن سبا نے نہ صرف خلافت عثمانی بلکہ سرے سے اسلام کے خلاف ہی ایک تحریک شروع کر دی یہ شخص عملاً یہودی اور یمن کا باشندہ تھا، حضرت عثمان کے عہد میں مسلمان ہونے کا اعلان کیا، لیکن یہ پہلا شخص ہے جس نے حضرت علی کی الوہیت کا دعویٰ کیا[1] علاوہ ازیں

(بقیہ حاشیہ) مدینہ کی تعمیرات سلع تک پہونچ جائیں تو تم مدینہ چھوڑ دینا" ایک شخص نے حسن بصری سے پوچھا: کیا حضرت عثمان نے حضرت ابوذر کو جلاوطن کیا تھا؟ انھوں نے فرمایا "پناہ بخدا! ایسا کیوں ہوتا! سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۵۲، ذہبی کا بیان یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان نے حضرت ابوذر غفاری سے فرمایا: "میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ساتھیوں میں رہیں، ورنہ مجھ کو آپ کے بارہ میں جاہل لوگوں کی طرف سے اندیشہ ہے" ایضاً ص ۵۰

[1] الملل والنحل: شہرستانی ج ۱ ص ۲۰۴

وہ رجعت کا قائل تھا۔ یعنی کہتا تھا ایک زمانہ آئے گا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں پھر ظہور ہوگا۔ اس کا قول تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا تو نزول ہو اور نبی آخر الزماں کا نہ ہو[1]۔ حضرت عثمان کی خلافت کو ناجائز کہتا تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ حضرت عثمان نے حضرت علی کا حق چھین لیا ہے، اور اس کو ثابت کرنے کے لیے خلافت عثمانی میں ہر قسم کے عیب نکالتا اور ان کا پروپیگنڈہ اور اپنے عقائد اور افکار کی تبلیغ خفیہ طور پر کرتا تھا، اس سلسلے میں یہ پہلے حجاز گیا، پھر کوفہ اور بصرہ کا سفر کیا پھر دمشق پہونچا، یہاں کے لوگوں نے دمشق سے نکال دیا تو مصر کا رخ کیا، متعدد وجوہ و اسباب سے اُس کی تحریک کو مصر میں پروان چڑھنے کا موقعہ ملا۔ خیر الدین الزرکلی نے حافظ ابن حجر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: میرے خیال میں حضرت علی نے اس کو زندہ در آتش کر دیا تھا[2] لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سنہ ۴۰ھ حضرت علی کی شہادت کا سال ہے اور اسی سال عبداللہ بن سبا کا انتقال ہوا ہے۔ حضرت علی کی وفات کے وقت یہ موجود تھا۔ چنانچہ جب اس نے یہ خبر سنی تو بولا: "اگر تم لوگ علی کا سر ہزار مرتبہ بھی میرے سامنے لاکر پیش کروگے تو میں پھر بھی ان کی موت کی تصدیق نہیں کروں گا، وہ ہرگز اس وقت تک مر ہی نہیں سکتے جب تک وہ ساری دنیا کو عدل اور انصاف سے ایسا ہی پُر نہ کر دیں گے جیسا کہ اس وقت ظلم و جور سے بھری ہوئی ہے[3]۔

اقتصادی امور میں عبداللہ بن سبا اشتراکی نظریہ کا حامل تھا، متوسط اور غریب طبقات میں اس کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی، غرض کہ اس طرح اس نے عراق و شام میں عموماً اور مصر میں خصوصاً اپنے پیروکاروں کا ایک خاصا حلقہ پیدا کر لیا تھا جو

---

[1] احمد امین لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن سبا کا یہ عقیدہ یہودیت کا اثر تھا، کیونکہ یہود کا عقیدہ رہا ہے کہ حضرت الیاس پیغمبر آسمان پر چڑھ گئے ہیں، وہ دنیا میں پھر واپس آئیں گے اور دین کا احیاء کریں گے، فجر الاسلام دسواں اڈیشن ص ۲۷۰ (باقی صفحہ ۱۸۲ پر)

حضرت عثمان کے خلاف ایک باقاعدہ اور منظم سازش میں مصروف تھا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنو ہاشم کے دل میں حضرت عثمان کے خلاف بے زاری اور ناراضگی کے جو جذبات تھے اور حضرت ابوذر غفاری نے امیروں اور دولت مندوں کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی تھی۔ عبداللہ بن سبا کو ان دونوں سے بڑی مدد ملی [1]

خوارج

خوارج کا وجود ایک فرقہ کی شکل میں اگرچہ واقعہ تحکیم کے بعد ہوا ہے، لیکن درحقیقت شیعیت کی طرح خارجیت کے جراثیم بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے ہی پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، چنانچہ ابوالعباس المبرد نے خوارج کے باب میں ایک حدیث کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر کے پاس ایک اعرابی آیا اور بولا: میں نے حالت احرام میں ایک ہرن کو مار ڈالا ہے، اب مجھے کیا کرنا چاہیئے" اس مجلس میں عبدالرحمٰن بن عوف موجود تھے، حضرت عمر نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: "آپ جواب دیجئے" انھوں نے فرمایا: "ایک بکری ذبح کر دے" حضرت عمر نے یہی جواب اعرابی کو دیا تو وہ بولا: بخدا! امیر المومنین کو مسئلہ معلوم نہ تھا۔ جبھی تو دوسرے شخص سے دریافت کیا" حضرت عمر سمجھ گئے کہ یہ خارجی ہے اور درہ سے اس کی خبر لی [2]

صحیح بخاری کے حوالہ سے یہ واقعہ پہلے گذر چکا ہے کہ عبداللہ بن عمر کے پاس ایک شخص آیا اور پے بہ پے تین سوالات کئے (۱) کیا عثمان غزوہ بدر میں شریک نہ تھے (۲) کیا

(بقیہ حاشیہ) [1] الاعلام ج ۴ ص ۲۲۰

[2] ابن حزم: الملل والنحل

[1] پچھلے دنوں الہادی، قم (ایران) میں کئی قسطوں میں مسلسل عبداللہ بن سبا پر ایک طویل مضمون سید ہادی الخسروشاہی کے قلم سے شائع ہوتا رہا ہے۔

[2] الکامل ج ۲ ص ۱۳۲

انھوں نے غزوہ احد میں فرار اختیار نہیں کیا تھا (۳) کیا انھوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ کے ہاتھوں پر بیعت نہیں کی تھی۔ عبداللہ بن عمر اس شخص کے ہر سوال پر ہاں ہاں کرتے رہے اور پھر ہر ایک کی وجہ بیان فرمائی، محدثین لکھتے ہیں کہ یہ شخص خارجی تھا، اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کا ہنگامہ اچانک نہیں ہوا بلکہ معاشرہ میں شروع سے ایسے لوگ تھے جو خارجی ذہنیت رکھنے کے باعث حضرت عثمان کی خلافت کے منکر اور ان کے دشمن تھے، اسلام کے لیے یہ لوگ کس درجہ خطرناک تھے، اس کا قیاس اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت علی پر قاتلانہ حملہ کے بعد جب ابن ملجم پکڑا گیا اور اس سے پوچھا گیا کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی تھی تو اس نے جواب دیا: میں نے خانہ کعبہ کے حطیم میں بیٹھ کر قسم کھائی تھی کہ میں شر الناس یعنی علی اور معاویہ کو قتل کروں گا۔[۱] چنانچہ حضرت عثمان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والوں میں ایک بڑی تعداد خوارج کی بھی تھی، ابن جریر طبری اور حافظ ابن کثیر دونوں نے اس کا ذکر کیا ہے، بلکہ ابن کثیر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ دو ہزار خارجی تھے جو برسر جنگ تھے۔[۲]

حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کے مذکورہ بالا اسباب، ان کے علاوہ بعض لوگوں کو ذاتی اور شخصی طور پر رنجش اور شکایت تھی، ان میں سے بعض نے مخالفت میں کھل کر اور سرگرمی سے مثبت حصہ لیا، اور بعض اگرچہ خاموش رہے لیکن مخالفین نے ان کی خاموشی سے فائدہ اٹھایا، پہلی قسم میں یہ لوگ شامل ہیں:

(۱) محمد بن ابی بکر پر ایک معاملہ میں حضرت عثمان نے سخت گرفت کی تھی، اس بنا پر وہ خلیفۂ سوم سے ناراض تھا، چنانچہ ایک مرتبہ اس نے خود اقرار کیا کہ حضرت عثمان کے خلاف

---

[۱] الفخری ص ۱۰۰ و ۱۰۱

[۲] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۱۸۰

اس کی تشدید باغیانہ حرکت کا باعث دو چیزیں تھیں ایک غیظ و غضب اور دوسری طمع اور لالچ [۱]

(۲) کعب بن ذی الحبکہ باغیوں کا سرغنہ تھا، ایک مرتبہ حضرت عثمان نے کسی جرم کے ارتکاب پر سزا دی تھی اس لیئے وہ باغیوں میں شریک ہوگیا [۲]

(۳) ابو فروہ ایک شخص حرث جو ایک گورکن اور حضرت عثمان کا آزاد کردہ غلام تھا۔ اس طرح ابو فروہ حضرت عثمان کے غلام کا غلام ہوا مگر کسی بات پر حضرت عثمان سے ناراض ہوگیا تو باغیوں میں یہ بھی شامل ہوگیا۔ [۳]

(۴) ایک شخص نے سعید بن المسیب سے محمد بن ابی خذیفہ کے متعلق پوچھا کہ انھوں نے باغیوں کا ساتھ کیوں دیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا۔ محمد بن خذیفہ یتیم تھا، حضرت عثمان نے اس کو گود لے لیا کیوں کہ حضرت عثمان کی عادت تھی کہ ان کے خاندان میں جو کوئی یتیم ہوتا تھا وہ اسے اپنی سرپرستی میں لے لیتے اور اس کی پرورش کرتے تھے، جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو محمد بن خذیفہ نے اپنے لیے کوئی عہدہ طلب کیا، حضرت عثمان نے فرمایا" فرزندمن! اگر تمہاری حرکات پسندیدہ ہوتیں تو میں ضرور تم کو کوئی عہدہ دے دیتا" یہ شخص اس پر ناراض ہوگیا اور اب اس نے قسمت آزمائی کے لیئے مدینہ سے باہر جانے کی اجازت مانگی تو حضرت عثمان نے نہ صرف اجازت دی، بلکہ اس کے لیئے سواری اور زاد راہ کا انتظام بھی کیا، لیکن مصر پہونچ کر یہ ان لوگوں میں شامل ہوگیا جو خلیفۂ ثالث سے صرف اس لیے ناراض تھے کہ آپ نے ان کی طلب کے مطابق انھیں کہیں کا والی نہیں بنایا تھا [۴]

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۴۰۰ و ابن اثیر کامل ج ۳ ص ۱۸۱، محمد بن ابی خذیفہ کی طرح یہ بھی کسی عہدہ اور منصب کا طلب گار تھا لیکن حضرت عثمان اس کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ اور بعد کے واقعات نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ حضرت عثمان کا عدم اطمینان صحیح تھا۔ اسی لیئے اس کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ اور یہ مخالف کیمپ میں چلا گیا۔ (باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

(۵) اب سائل نے عمار بن یاسر کی نسبت پوچھا کہ وہ حضرت عثمان کے مخالف کیوں ہو گئے تھے ؟ سعید بن المسیب نے جواب دیا: "بات یہ ہے کہ ایک مرتبہ عمار بن یاسر اور عباس بن عتبہ میں باہم سخت کلامی ہو گئی جس میں ایک دوسرے پر بہتان طرازی کی گئی تھی، حضرت عثمان کے سامنے جب یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ نے دونوں کو ضرب کی سزا دی، اس وقت سے دونوں خاندانوں میں مستقل عداوت قائم ہو گئی اور اب تک ہے [۱]

(۶) بغاوت کے سرغنہ لوگوں میں اشتر نخعی، جندب بن کعب، صعصعہ اور عمیر بن الصابی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ کوفہ کے رہنے والے اور طبعاً سخت شرپسند اور فتنہ جو تھے، بہانہ بہانہ سے کوفہ میں آئے دن کوئی نہ کوئی نیا فتنہ کھڑا کرتے رہتے تھے باشندگان کوفہ نے دربار خلافت میں شکایت پہونچائی اور درخواست کی کہ ان لوگوں کو کوفہ سے نکال دیا جائے تو حضرت عثمان نے کوفہ سے جلاوطن کر کے انھیں امیر معاویہ کی نگرانی میں شام بھیج دیا [۲] اس پر یہ سب حضرت عثمان کے سخت دشمن اور مخالف ہو گئے۔

اب رہی دوسری قسم ان حضرات کی جن کو حضرت عثمان سے کوئی شکایت تھی لیکن وہ خاموش تھے، فتنہ پردازوں کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن فتنہ پردازوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس قسم میں وہ حضرات شامل تھے جن کو حضرت عثمان نے گورنری سے معزول کیا اور ان کی جگہ بنو امیہ کے افراد کو متعین کیا۔ مثلاً مغیرہ بن شعبہ، ابوموسیٰ اشعری،

(باقی حاشیہ) [۲] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۸۲

[۳] الفخری لابن طقطقا ص ۱۰۷

[۴] طبری ج ۴ ص ۳۹۹

[۱] ایضاً

[۲] ابن اثیر کامل ج ۳ ص ۵۳

سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، (یہ ناظم بیت المال تھے) اور عمرو بن العاص

غرض کہ یہ ہیں وہ اسباب جن کے باعث حضرت عثمان کے خلاف پہلے چہ می گوئیاں شروع ہوئیں، اور خفیہ ریشہ دوانیاں ہوئیں، پھر انھوں نے منظم سازش اور بغاوت کی شکل اختیار کر لیں، لیکن اس موقع پر ان اعتراضات یا الزامات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے جو مخالفین حضرت عثمان پر عائد کرتے تھے، مخالفین نے یہ اعتراضات اس زور شور سے کئے ہیں کہ عام تاریخوں میں ان کی صدائے بازگشت سننے میں آتی ہے اور اس سے بعض لوگوں نے غلط نتائج نکالے ہیں۔

مخالفین کے اعتراضات

ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت عثمان کے خلاف چہ می گوئیوں کا آغاز اس سے ہوا کہ حضرت عثمان نے منیٰ اور عرفہ میں بجائے صلوٰۃ قصر یعنی دو رکعتوں کے چار رکعتیں پڑھنی شروع کر دیں، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کا دستور دو رکعت پڑھنے کا تھا اور خود حضرت عثمان بھی خلافت کے شروع سالوں میں نماز قصر ہی ادا کرتے تھے[۱]

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ عبیداللہ بن عمر نے ہرمزان اور جفینہ کو قتل کر دیا جو "بیگناہ" تھے، لیکن حضرت عثمان نے ان سے قصاص نہیں لیا۔

منیٰ میں چار رکعات حضرت عثمان نے بیشک خلافت کے آخری سالوں میں منیٰ اور عرفہ میں بجائے قصر کے اتمام صلوٰۃ کرنا شروع کر دیا تھا حضرت

---

[۱] ایضاً ص ۱۰۳

علی اور بعض دوسرے صحابہ نے آپ سے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا: مکہ پہونچ کر وہاں قیام کی بنیت کر لیتا ہوں، اور میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ کوئی شخص کسی مقام پر پہونچ کر وہاں قیام کا ارادہ کر لے تو اسے نماز پوری پڑھنی چاہیئے[۱] چنانچہ مسئلہ بھی یہی ہے، لیکن حضرت شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں حضرت عثمان کے فعل کی توجیہہ یہ کی ہے کہ آپ کے نزدیک سفر میں قصر کرنا رخصت تھا، عزیمت نہیں، اور امام شافعی کا مذہب بھی یہی ہے، پھر لکھتے ہیں: میں بھی اسی کو ترجیح دیتا ہوں[۲] شاہ صاحب نے جو توجیہہ کی ہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مسند ابوعوانہ میں عروۃ بن زبیر (جو حضرت عائشہ کے بھانجے تھے) ان سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ سفر میں اتمام صلوٰۃ کرتیں یعنی چار رکعات پڑھتی تھیں[۳]

لیکن جب حضرت عثمان خود اپنے فعل کی ایک وجہ بیان کرتے ہیں تو پھر کسی کو اپنی طرف سے توجیہہ پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، چنانچہ عبداللہ بن عمر کہتے ہیں: حضرت عثمان سفر میں ہمیشہ قصر کرتے تھے[۴] سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان خلافت کے شروع کے دو برسوں میں منیٰ میں دو رکعت ہی پڑھتے تھے لیکن اس کے بعد انھوں نے چار رکعت پڑھنی شروع کر دی تھیں، امام ابن شہاب الزہری سے کسی نے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عثمان حج کے بعد قیام کا ارادہ کر لیتے تھے[۵] اس سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عثمان کے اس فعل سے یہ

---

[۱] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۶۲

[۲] ازالۃ الخفا ص

[۳] مسند ابوعوانہ ج ۲ ص ۲۸

[۴] ایضاً ص ۳۶۷

[۵] ایضاً ص ۳۶۹

یہ استدلال کرنا درست نہیں ہے کہ ان کے نزدیک سفر میں قصر رخصت تھا عزیمت نہ تھا۔

عبیداللہ بن عمر کی طرف سے دیت کی ادائیگی

اس واقعہ کو جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں اس طرح دیکھنا چاہیئے کہ ایک مجوسی غلام (ابولولو) حضرت عمرؓ ایسے جلیل القدر اور عظیم الشان خلیفہ پر قاتلانہ حملہ کر کے نہ صرف یہ کہ ایک زندگی کو ختم کرتا ہے بلکہ پوری مملکتِ اسلامیہ پر ظلم عظیم کرتا ہے اور اس کا یہ فعل یقیناً شخصی اور ذاتی نہیں، بلکہ جیسا کہ طبری میں ہے کہ ایک سازش کا نتیجہ ہے؛ پورا عالم اسلام اس حادثۂ فاجعہ پر سوگوار ہے، ابولولو نے تو خودکشی ہی کر لی تھی، عبیداللہ کو پتہ چلا کہ ہرمزان اور جفینہ ابولولو کے ساتھ سازش میں شریک تھے، وہ فرطِ غیظ وغضب میں اٹھے اور ان کا کام تمام کر آئے۔ معاملہ حضرت عثمان کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا حضرت علی کی رائے تھی کہ قصاص لیا جائے۔ لیکن حضرت عمرو بن العاص نے کہا: اگر قصاص لیا گیا تو دنیا کیا کہے گی کہ کل عمر کو ایک غلام نے قتل کر دیا اور آج ان کے بیٹے کو خلیفہ کے حکم سے قتل کر دیا گیا، اسی بنا پر، حضرت عمرو بن العاص نے کہا میری رائے ہے کہ عبیداللہ بن عمر کو معاف کر دیا جائے، اور مجھے یقین ہے کہ قیامت کے روز خلیفہ سے اس پر باز پرس نہ ہو گی، حضرت عثمان نے یہ دونوں رائیں سننے کے بعد فیصلہ دیت کے ادا کرنے کا کیا اور وہ دیت بھی خود ادا کر دی، جو شخص شریعت کے اسرار وحکم اور مصالح شرعیہ وملیہ سے واقف ہے وہ جان سکتا ہے کہ اس معاملہ میں یہ اعتراضات فقہی نوعیت کے تھے، اور ان کی کچھ زیادہ اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ اس قسم کی اجتہادی انفرادیت (مگر بصیرت اور بصارت کے ساتھ) کی مثالیں خلیفۂ دوم حضرت عمر کے ہاں کثرت سے ملتی ہیں البتہ حضرت عثمان پر سب سے بڑے اور

بنیادی جو اعتراضات کیے جاتے ہیں اور جن کو ہمارے مورخین نے بھی نمایاں کرنے میں کوتاہی نہیں کی ؎ وہ یہ ہیں :

(۱) حضرت عثمان نے اکابر صحابہ کو معزول کر کے اپنے اعزا و اقربا کو بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کیا۔

(۲) عمال و منصب داران بنوامیہ کی فروگذاشتوں، بلکہ بے عنوانیوں سے چشم پوشی کی۔

(۳) حکم بن العاص جو حضرت عثمان کے چچا تھے، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے افشائے راز کے جرم میں طائف میں جلا وطن کر دیا تھا۔ لیکن حضرت عثمان نے ان کو مدینہ واپس بلا لیا اور انعام و اکرام کی بارش کر دی۔

(۴) عبداللہ بن سعد بن ابی سرح حضرت عثمان کا دودھ شریک بھائی تھا، فتح مکہ سے قبل اسلام لایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت وحی کی خدمت سپرد فرمائی، لیکن یہ قرآن میں تحریف کرنے لگا اور مرتد ہو گیا، فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مباح الدم قرار دیا تھا لیکن حضرت عثمان نے سفارش کر کے اس کی جاں بخشی کرا لی اور پھر جب خلیفہ ہوئے تو اسے مصر کا گورنر بنا دیا۔

(۵) بیت المال سے اپنے خاندان بنی امیہ کے افراد و اشخاص کو بڑی رقمیں بغیر استحقاق شرعی کے انعام و اکرام کے طور پر دیتے تھے۔

؎ چنانچہ ڈاکٹر علی حسن الخربوطلی، قاہرہ لکھتے ہیں : "اس پر سب مورخوں کا اتفاق ہے کہ عثمان کی دفتری سیاست ان کے خلاف بغاوت کا سب سے بڑا سبب ہے" الدولۃ العربیہ الاسلامیہ ص ۱۱۰۔ استاذ کرد علی لکھتے ہیں "حضرت عثمان نے دفتری نظم و نسق میں جو غلطیاں کی ہیں وہ ان کے قتل کا سب سے اہم سبب ہے" الادارۃ الاسلامیہ ص ۵۰۔ ولیم میور لکھتا ہے: "عثمان کے خلاف بغاوت کا سبب کثرت سے گورنروں کا ادل بدل ہے" The Caliphate, P: 228

(۶) اور ایک بڑا اعتراض یہ بھی ہے کہ مصری وفد حضرت علی کے سمجھانے بجھانے پر مدینہ سے واپس ہوگیا تھا، مگر وفد کو راستے میں خلافت کا ایک فرستادہ مصر جاتا ہوا ملا، وفد کو کچھ شبہ ہوا، اس نے اس شخص کی جامہ تلاشی لی تو اس شخص کے پاس ایک خط ملا جس پر مہر خلافت تھی، یہ خط مصر کے گورنر کے نام تھا . . . اور اس میں مصری وفد کے لوگوں کے سر قلم کر دینے کی ہدایت تھی۔ معترضین کہتے ہیں کہ خط مروان کی شرارت سہی، لیکن امور حکومت میں مروان کو غیر معمولی طور پر دخیل کر لینے کا الزام حضرت عثمان پر بھی عائد ہوتا ہے۔

اب ہم نمبروار ان اعتراضات پر مفصل کلام کرتے ہیں۔

عزل ونصب ولاۃ وعمال

سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عزل نصب ہر حکومت کے لوازم میں سے ہے اور اگر یہ ظلم و ناانصافی پر مبنی نہیں ہے تو اس کو حکومت کی بیدار مغزی کی دلیل سمجھنا چاہیئے خود خلافت فاروقی کا عہد اس سے خالی نہیں ہے۔

حضرت خالد بن الولید، سعد بن ابی وقاص، مغیرۃ بن شعبہ اور عمار بن یاسر جیسے اکابر و ناموران صحابہ کو اس عہد میں معزول اور دوسرے حضرات کو ان کی جگہ مقرر کیا گیا ہے، دوسری بات جو اس سلسلے میں ملحوظ رہنے کے قابل ہے یہ ہے کہ کسی عہدہ دار کو اس کے عہدہ سے معزول کر کے کسی دوسرے شخص کا تقرر ہمیشہ معزول عہدہ دار کی تنقیص و توہین پر مبنی نہیں ہوتا، بلکہ اس سے کوئی اعلیٰ سیاسی غرض یا جماعتی مصلحت وابستہ ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے سعد بن ابی وقاص کو اہل کوفہ کی شکایت پر جس کے غلط ہونے کا یقین خود حضرت عمر کو تھا گورنری سے معزول کیا تھا[۱] لیکن حضرت عمر

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۷۸

کی نگاہ میں ان کا مرتبہ و مقام کیا تھا؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اپنی جانشینی کے لیے حضرت عمر نے جن چھ بزرگوں کے نام منتخب کئے تھے ان میں ایک نام حضرت سعد بن ابی وقاص کا بھی تھا اور اس وقت آپ نے اس کی بھی تصریح کر دی تھی کہ میں نے سعد بن ابی وقاص کو ان پر کسی الزام کی وجہ سے معزول نہیں کیا تھا۔[1]

علاوہ ازیں اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شرف صحبت نبوی کے باعث صحابۂ کرام کا جو مرتبہ و مقام دینی و روحانی اعتبار سے ہے وہ دوسروں کا نہیں ہو سکتا۔ لیکن ملکی نظم و نسق، ایڈمنسٹریشن، جنگی مہارت، فوج کی قیادت، اور سیاسی سوجھ بوجھ، ان سب کا معاملہ بالکل دوسرا ہے، ضروری نہیں ہے کہ جو حضرات دینی اور روحانی حیثیت سے بلند مرتبہ و مقام پر فائز ہوں ان میں یہ کمالات اور صلاحیتیں بھی اعلیٰ درجہ کی ہوں اور ایک حکومت کی روشن دماغی اور بیدار مغزی کا تقاضا ہے کہ ہر کام کے لیے وہ ایسے شخص یا اشخاص کا انتخاب کرے جن میں امور متعلقہ کو انجام دینے کی فطری صلاحیت بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ ہو۔

امور مذکورہ بالا کو ذہن میں رکھ کر اب آیئے، اس کا جائزہ لیں کہ حضرت عثمان نے کب کسی صحابی کو کسی عہدہ سے معزول کیا تھا اور ان کی جگہ اپنے کسی عزیز قریب کا تقرر فرمایا اور کیوں؟

(الف) عمرو بن العاص اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح

طبری میں ہے کہ شروع شروع میں جن حضرات نے حضرت عمر کے گورنروں اور عمال کو ان کی اپنی جگہوں پر ہی رکھا اور ان میں کوئی فوری ردوبدل نہیں کیا، بلکہ بعد میں جیسے جیسے حالات پیدا ہوتے

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۲۹، اصلی الفاظ یہ ہیں: لم اعزلہ عن خیانۃ او ضعف

گئے حضرت عثمان ان کے مطابق تبدیلی پیدا کرتے گئے، حضرت عمرو بن العاص بلند پایہ صحابی تھے، دُھاۃ عرب (مدبرین عرب) میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اعلیٰ درجہ کے جنرل اور فوج کے کمانڈر تھے، کیونکہ مصر انھوں نے ہی فتح کیا تھا، لیکن حضرت عمر کو ان سے یہ شکایت رہی کہ مصر جیسے سرسبز و شاداب اور زرخیز ملک کا خراج جتنا آنا چاہیئے اتنا نہیں آرہا ہے، حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو یہ شکایت آپ کو بھی پیدا ہوئی اور آپ نے عمرو بن العاص کو تحریر کے ذریعہ اس طرف متوجہ بھی کیا، مگر اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

جیسا کہ گذر چکا ہے، حضرت عمر نے مصر کو بالائی و نشیبی دو حصّوں پر تقسیم کر رکھا تھا ایک حصّہ کے گورنر عمرو بن العاص تھے اور دوسرے کے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح حضرت عثمان نے اپنی نئی اصلاحی اسکیم کے ماتحت یہ کیا کہ پورے مصر کو ایک صوبہ بنا دیا اور چونکہ خراج کے معاملہ میں عمرو بن العاص کی طرف سے مطمئن نہ تھے اس لئے تجویز یہ کی کہ عمرو بن العاص فوج کے کمانڈر کی حیثیت سے رہیں اور خراج وغیرہ کے مالیاتی معاملات عبداللہ بن سعد کے سپرد رہیں، لیکن عمرو بن العاص نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا، آخر حضرت عثمان نے ان کو معزول کر کے عبداللہ بن سعد بن سرح کو پورے مصر کا گورنر مقرر کر دیا اور فوج و خراج وغیرہ کا سب معاملات ان کے سپرد کر دئے۔

دو اعتراض

جہاں تک عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی ذات کا تعلق ہے معترضین کو دو اعتراض ہیں۔

(الف) ایک یہ کہ عبداللہ مرتد تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر اس کو واجب القتل قرار دے دیا گیا لیکن چونکہ اموی اور حضرت عثمان کا دودھ شریک بھائی تھا اس لیے حضرت عثمان نے سفارش کر کے اس کی جاں بخشی کرائی اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ اس کا اعزاز یہ کیا کہ اسے مصر کا گورنر بنا دیا۔

(ب) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ سنت شیخین اور قرآن کے حکم دربارۂ تقسیم غنیمت کے خلاف

حضرت عثمان نے یہ کہ کہ افریقیہ (شمالی) کے مال غنیمت کے خمس کا خمس یعنی ۲۵/۱ حصہ عبداللہ بن سعد کو بطور انعام دے دیا۔

جوابات اب ان اعتراضات کے جوابات نمبر وار ملاحظہ کیجیے

(الف) عبداللہ بن سعد بن ابی سرح القرشی العامری المتوفی ۳۷ھ فتح مکہ سے قبل اسلام لایا اور کتابت وحی کی خدمت انجام دینے لگا۔ لیکن بعد میں مرتد ہو گیا، فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار شخصوں کو واجب القتل قرار دیا تھا ان میں ایک یہ بھی تھا۔ لیکن عبداللہ بن سعد کو حضرت عثمان ساتھ لے کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے، اب اس نے توبہ کی، اسلام کی تجدید کا اعلان کیا حضرت عثمان نے سفارش کی، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ تامل کے بعد عبداللہ بن سعد کا اسلام قبول فرمایا اور اس کی جاں بخشی ہو گئی ؎۱

اب کوئی بتائے کہ اس واقعہ میں کونسی بات ایسی ہے جس سے حضرت عثمان پر کسی قسم کا کوئی اعتراض وارد ہوتا ہو، کیا ایک مرتد کو تجدید اسلام پر آمادہ کر کے بارگاہ نبوی میں پیش کرنا عظیم کار ثواب نہیں ہے؟ پھر توبہ کرنے سے کیا پہلے گناہ معاف نہیں ہو جاتے؟ تاریخ اسلام ایسے افراد و اشخاص سے بھری ہوئی ہے جنھوں نے اسلام کی مخالفت اور دشمنی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا، لیکن جب وہ صدق دل سے مسلمان ہو گئے تو ان کے سب گناہ معاف ہو گئے۔ اشعث بن قیس ایک مدعی نبوت تھا جب ارتداد کی جنگ میں گرفتار ہو کر آیا اور جان بخشی کی درخواست کی تو حضرت ابو بکر نے اس کو نہ صرف معاف کیا بلکہ اپنی بہن ام فروہ کا نکاح بھی اس کے ساتھ کر دیا ؎۳

؎۱ اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۷۳

؎۲ سنن ابوداؤد باب قتل الاسیر

؎۳ یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۹

پھر اگر حضرت عثمان نے عبداللہ بن سعد کو مصر کا گورنر مقرر کیا، دراں حالیکہ حضرت عمر کے زمانہ سے ہی وہ مصر کے بالائی حصہ کا گورنر تھا، تو کیا قصور کیا، عبداللہ بن سعد کے اعلیٰ کارنامے آپ پڑھ آئے ہیں۔ یہ اس زمانہ میں امیر معاویہ کے بعد اسلام کا سب سے بڑا جنرل اور امیر البحر تھا، اس بنا پر اس عہدہ کے لیے اس کا انتخاب حضرت عثمان کے کمال جوہر شناسی کی دلیل ہے، رہی حضرت عثمان کے ساتھ رشتہ داری! تو کیا شریعت اخلاق اور امانت کسی کی یہ شرط ہے کہ اپنا کوئی عزیز قریب کسی قومی خدمت کی خواہ کیسی ہی کوئی اعلیٰ صلاحیت اور قابلیت رکھتا ہو، یہ خدمت اس کے سپرد نہ کی جائے؟

(ب) رہا دوسرا اعتراض! اس کی حقیقت یہ ہے کہ افریقہ کو فتح کرنا آسان نہ تھا اس لیے حوصلہ افزائی کی راہ سے حضرت عثمان نے عبداللہ بن سعد سے وعدہ کیا تھا کہ اگر افریقہ فتح ہو گیا تو میں مال غنیمت کے خمس کا خمس تم کو دوں گا، چنانچہ افریقہ کی فتح کے بعد غنیمت کے خمس کا خمس عبداللہ بن سعد نے خود رکھ لیا اور باقی مدینے بھیج دیا۔ لوگوں نے اس پر چہ می گوئیاں شروع کیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا: عبداللہ بن سعد نے جو کچھ کیا ہے میرے حکم سے کیا ہے، پھر بھی اگر آپ لوگ اس پر رضامند نہیں ہیں تو عبداللہ بن سعد نے جو کچھ لیا ہے میں واپس کرا دوں گا۔ چنانچہ آپ نے عبداللہ بن سعد کو لکھا اور اس نے جو لیا تھا اسے واپس کر دیا۔[1]

اب غور کیجئے، اس واقعہ میں کونسی بات ہے جو قابل اعتراض ہے، حضرت عثمان غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غنیمت میں سے ایک مجاہد کا پورا حصہ عطا فرمایا، غزوۂ طائف کے موقع پر مولفۃ القلوب کو غنیمت میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا بڑا حصہ عطا فرمایا کہ انصار کو

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۵۳ و ۲۵۴

بڑا حصہ عطا فرمایا کہ انصار کو شکایت پیدا ہو گئی [1] اس سے ثابت ہوا کہ ایک خلیفہ یا امیر المومنین کو کسی فوجی یا ملی فائدہ کے پیش نظر غنیمت کی تقسیم میں تصرف کرنے کا حق ہے ولاباس فیہ اس بنا پر حضرت عثمان کی اس انعام بخشی کو کیوں ناجائز یا نامناسب کہا جا سکتا ہے، اس کے باوجود خلیفۂ سوم کی رواداری اور جمہوریت پسندی کا عالم یہ تھا کہ عوام میں اس پر چہ میگوئی ہوئی تو وہ پوری رقم واپس لے لی،

عمرو بن العاص کو معزول کر کے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو گورنر بنانے کا واقعہ ۲۷ھ کا ہے:

(ب) سعد بن ابی وقاص اور ولید بن عقبہ

۲۴ھ میں حضرت عثمان نے مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ کی گورنری سے معزول کیا اور سعد بن ابی وقاص کو ان کی جگہ مقرر فرمایا لیکن دو برس کے اندر ہی اندر حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ حضرت عثمان نے سعد بن ابی وقاص کو بھی سبکدوش کر دیا اور ان کی جگہ ایک اموی نوجوان ولید بن عقبہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔

معترضین کو اس پر اعتراض دو حیثیت سے ہے۔

(۱) ایک یہ کہ جلدی جلدی گورنروں کا عزل ونصب اڈمنسٹریشن کی ناکامی کی دلیل ہے

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ طائف، انصار میں سے بعض نے کہا "رسول اللہ نے قریش (حدیث الاسلام اور مولفۃ القلوب) کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں" بعض بولے: "مشکلات میں ہم یاد آتے ہیں، مگر غنیمت میں حصہ دوسروں کا ہوتا ہے" حضور کو اس کا علم ہوا تو سب انصار کو جمع کر کے پوچھا: "میں نے اس طرح کی باتیں سنی ہیں، کیا یہ سچ ہیں" عرب کا کیرکٹر یہ تھا کہ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے (باقی صفحہ ۱۹۶ پر)

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ایک جلیل القدر صحابی کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے خاندان کے ایک نوجوان کا تقرر کیا۔

ان دونوں اعتراضوں کے جوابات علی الترتیب حسب ذیل ہیں۔

گورنروں کا جلد جلد عزل و نصب

پہلے اعتراض کا جواب معلوم کرنے سے قبل یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کوفہ اور ساتھ ہی بصرہ کے انتظامی (Law and order) حالات، ان دونوں شہروں کی خاص قسم کی آبادی کے باعث، حضرت عمر کے زمانہ سے ہی نہایت ابتر اور خراب چلے آرہے تھے جو شخص یہاں گورنر ہو کر آتا کچھ دن یہ لوگ اس کی اطاعت کرتے اور پھر کوئی بہانہ پیدا کر کے اس کے خلاف خلافت میں شکائتیں پہونچانی شروع کر دیتے تھے، ان لوگوں کا آئے دن کا مشغلہ یہی تھا، حضرت عمر ان سے تنگ آ گئے تھے چنانچہ ایک مرتبہ سخت برہم ہو کر فرمایا۔

من عذیری من اھل الکوفۃ، ان استعملت علیھم القوی فجرّوہ وان ولیت علیھم الضعیف حقروہ۔ [۱]

پناہ بخدا! کوفہ کے لوگ بھی عجیب و غریب ہیں اگر میں ان پر کوئی مضبوط آدمی حاکم بناتا ہوں تو یہ لوگ اس میں کیڑے نکالنے شروع کر دیتے ہیں، اور اگر کسی کمزور کو حاکم بناتا ہوں تو یہ اس کی تحقیر و تذلیل کرتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) انصار بولے: ہاں یا رسول اللہ! سچ ہے۔ اب آپ نے ایک نہایت بلیغ اور بہت پر جوش خطبہ ارشاد فرمایا جس سے مطلع بالکل صاف ہو گیا اور حاضرین چیخیں مار مار کر رونے لگے۔

[۱] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۷۸: چنانچہ حضرت عمر نے سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تو لوگوں نے مدینہ جا جا کے قطعاً غلط اور جھوٹ شکایات ان کے خلاف پہونچانی شروع کر دی، حضرت عمر نے ان کو معزول کر کے عمار بن یاسر کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تو (باقی صفحہ پر)

جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، بصرہ کا حال بھی ایسا ہی زبوں اور ابتر تھا۔ چنانچہ مغیرۃ بن شعبہ جس زمانے میں یہاں گورنر تھے۔ بصرہ کے لوگوں نے سازش کر کے ان پر زنا کا الزام لگایا اور حضرت عمر کے پاس مرافعہ کیا، حضرت عمر نے سازش پکڑلی تھی، تاہم انتظامی مصلحت کے پیش نظر مغیرہ بن شعبہ کو وہاں سے الگ کر دیا۔ حضرت عمر بصرہ کے لوگوں سے کس درجہ بیزار اور کبیدہ خاطر تھے؟ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب آپ نے مغیرۃ بن شعبہ کی جگہ ابوموسیٰ اشعری کو بصرہ کا گورنر مقرر کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے ان سے فرمایا۔

انی ارید ان ابعثک الی بلدٍ قد عشش فیہ الشیطان

ابوموسیٰ! میں تم کو ایک ایسے شہر میں (گورنر بنا کر) بھیجنا چاہتا ہوں جہاں شیطان نے گھونسلہ بنالیا ہے۔

یہ سن کر ابوموسیٰ چوکنے ہو گئے اور بولے، تو حضرت! میرے ساتھ کچھ مددگار (Assistant) بھی کر دیجئے۔ حضرت عمر نے اس کو منظور فرمایا اور چھ مددگار ہمراہ کردیئے۔[1]

اسی طرح حضرت عمر نے جب مغیرۃ بن شعبہ کو کوفہ کی گورنری پر بھیجنا چاہا تو ان سے فرمایا "تم کو یاد ہے کہ بصرہ میں تم پر کیسی تہمت لگائی گئی تھی! مطلب یہ تھا کہ بصرہ اور کوفہ کے لوگ بڑے سازشی اور شورہ پشت ہیں، بصرہ میں تم کو ان سے ایک سابقہ پیش آچکا ہے، اب تم کوفہ جا رہے ہو تو ذرا وہاں کے لوگوں سے ہوشیار ہو کر رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی کسی سازش میں پھنس جاؤ۔

(بقیہ حاشیہ) ان کے خلاف بھی شکایتوں کے انبار لگا دیئے، ایک برس نو ماہ کے بعد حضرت عمر نے عمار بن یاسر کو بھی الگ کر دیا اور ان کی جگہ مغیرہ بن شعبہ کو گورنر مقرر فرمایا، حضرت عثمان جب خلیفہ ہوئے ہیں تو کوفہ کے گورنر مغیرۃ بن شعبہ ہی تھے۔

[1] فتوح البلدان ص ۳۴۰

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت عثمان کا کیا ذکر؟ کوفہ اور بصرہ کے انتظامی حالات فاروق اعظم کے زمانہ سے زبوں وخراب چلے آرہے تھے، کوئی گورنران کے یہاں زیادہ دنوں تک رہ نہیں سکتا تھا۔ اسی بنا پر حضرت عمر بھی مجبور تھے کہ جلد جلد یہاں گورنروں کا عزل ونصب کریں پھر اگر حضرت عثمان کو بھی ایسا کرنا پڑا تو کونسی جائے حیرت واستعجاب یا مقام نکتہ چینی واعتراض ہے:

(۲) دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ کوفہ اور بصرہ کے جو حالات حضرت عمر کے زمانہ میں تھے، آپ کے بعد ان میں بہتری اور اصلاح کیا ہوئی ہوگی، بلکہ کچھ اور زیادہ ہی بگڑے ہوں گے اور جو صورت حال حضرت عمر کو پیش تھی وہی، بلکہ اس سے بھی زیادہ بری صورت میں حضرت عثمان کو پیش آئی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ کو معزول کرکے سعد بن ابی وقاص کو گورنر بنایا گیا، جو حضرت عمر کے زمانہ میں بھی گورنر تھے، مگر جب لوگوں کی غلط سلط شکایات پہونچیں تو معزول کردیئے گئے، قیاس کہتا ہے کہ اسی نوع کی کوئی صورت اب پھر پیش آئی ہوگی، آخر لوگ تو وہی تھے، فطرت کیسے بدلتی! اس لیے حضرت عثمان نے اب فیصلہ کرلیا کہ کوفہ کی صورت حال کے پیش نظر اب وہ کسی جواں سال وجواں عمر اور سخت گیر شخص کو کوفہ کا گورنر مقرر کریں گے، چنانچہ قرعۂ انتخاب ولید بن عقبہ کے نام نکلا۔

ولید بن عقبہ الاموی القرشی المتوفی ۶۱ھ، حضرت عثمان کے ماں شریک بھائی تھے، جس دن مکہ فتح ہوا ہے اس دن اسلام لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بنی المصطلق کے صدقات کا انچارج بنا کر بھیجا تھا، نہایت سوجھ بوجھ اور عزم وارادہ کے مالک تھے، انھیں اوصاف کی وجہ سے حضرت عمر نے بھی ان کو عرب الجزیرہ کا افسر اعلیٰ مقرر کیا تھا[1]، اب حضرت عثمان نے ولید بن عقبہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تو اقربا نوازی

[1] طبری ج ۳ ص ۲۷۳

(nepotism) کا الزام ان پر کیسے آسکتا ہے۔

ولید بن عقبہ نہایت سخت گیر اور متشدد تھے ۲۵ھ سے ۳۰ھ تک یعنی کم وبیش پانچ برس وہ یہاں رہے، آخر کار اہل بصرہ نے نہایت سخت بہتان طرازی کا جو حربہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے خلاف استعمال کیا تھا، اہل کوفہ نے وہی حربہ ولید بن عقبہ کے خلاف استعمال کیا، یعنی شراب نوشی کا الزام لگایا، چند گواہ پیدا کئے اور آخر دربار خلافت میں شکایت پہونچادی۔ ولید بن عقبہ کی شراب نوشی کا افسانہ جس طرح طبری، مروج الذہب، اور ابن اثیر میں بیان کیا گیا ہے اس کے دیکھنے اور پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ من گھڑت افسانہ ہے، اس کا تار و پود وہی ہے جس سے اہل بصرہ نے مغیرہ بن شعبہ کے خلاف سازش کا ایک جال بنایا تھا۔ تاریخ اسلام کا ہر ایک طالب علم جانتا ہے کہ یہ کوئی عجوبہ نہیں، بنی امیہ کے خلفا، عہدہ داران حکومت اور افراد و اشخاص خاندان کے خلاف فسق و فجور کی نہایت فحش اور مغلط داستانیں ...... عام طور پر تاریخ کے صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں، بہرحال اب مصلحت وقت کا تقاضا یہی تھا، حضرت عثمان نے ولید بن عقبہ کو معزول کر کے مدینہ بلالیا، اور حد بھی جاری کی[1]

سعید بن العاص | ولید بن عقبہ کے بعد (۳۰ھ میں) سعید بن العاص الاموی القرشی (از ۳۰ھ تا ۵۹ھ) کوفہ کے گورنر ہوئے، ان کی تعلیم و تربیت حضرت عمر کی آغوش میں ہوئی تھی۔[2]

زرکلی نے ان کو "من الامراء الولاۃ الفاتحین" لکھا ہے[3] نہایت بہادر اور

---

[1] بخاری: باب مناقب عثمان

[2] الاصابۃ وطبقات ابن سعد

[3] الاعلام ج ۳ ص ۱۴۹

اور اعلیٰ درجہ کے جنرل تھے، ۳۰ھ میں جب یہ خراسان کی مہم پر کوفہ سے روانہ ہوئے ہیں تو ایک فوج گراں ان کے کمانڈ میں تھی جس میں اکابر صحابہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اور دونوں جگر گوشہ ہائے رسول حسنؓ اور حسینؓ شامل تھے، اس فوج گراں کو دیکھ کر کعب بن جعیل شاعر نے سعید بن العاص کی مدح میں جو ایک قصیدہ لکھا تھا اُس میں کہتا ہے:

تسوس الذی ماساس قبالك واحدٌ ثمانين الفاً دارعين وحسّرا

ترجمہ: اے سعید! تم آج جتنے بڑے لشکر کی قیادت کر رہے ہو تم سے پہلے کسی نے نہیں کی، یہ لشکر اسّی ہزار مجاہدین پر مشتمل ہے جس میں زرہ بند بھی ہیں اور بغیر زرہ کے بھی۔

طبرستان جو ایران کا ایک بڑا صوبہ ہے وہ انھیں کے ہاتھ فتح ہوا تھا اور اسی وجہ سے سعید بن العاص کا تاریخ میں لقب ہی فاتح طبرستان ہو گیا[۱]

علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

وکان امیراً شریفاً جواداً ممدحاً حلیماً وقوراً، حزم وعقلٍ یصلح للخلافۃ	سعید بن العاص امیر، شریف سخی، قابل تعریف، بردبار بھاری بھرکم، دور اندیش اور عقلمند اس درجہ کے تھے کہ خلافت کے لیے سزاوار تھے۔

سیر الاعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۹۴

غرض کہ سعید بن العاص اس آن بان اور عظمت و شان کے ۴۰ سالہ نوجوان تھے جن کو اب حضرت عثمانؓ نے کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ اس عہدہ کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسرا انتخاب ہو نہیں سکتا تھا۔ زرکلی نے لکھا ہے: "سعید بن العاص گورنر ہو کر کوفہ آئے تو ایک دن خطبہ میں انھوں نے نفاق و شقاق پر اہل کوفہ کی سخت

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۲۶۹-۲۷۰

مذمت کی، اہل کوفہ نے اس کی شکایت خلیفہ سے کی اور انھوں نے سعید کو مدینہ واپس بلالیا۔ [1] لیکن یہ بیان غلط ہے، کیونکہ طبری کا بیان ہے کہ حضرت عثمان پر حملہ تک سعید بن العاص کوفہ کے گورنر رہے۔ [2] حضرت عثمان کی شہادت کے بعد مکہ چلے گئے،

(ج) **ابوموسیٰ اشعری** اب بصرہ کو لیجئے اس کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری .. خلافت فاروقی کے زمانہ سے ہی چلے آرہے تھے۔ خلافت عثمانی میں بھی چھ برس یعنی ۲۹ھ تک اس عہدہ پر رہے۔ آخر بصرہ کے لوگ چین سے کہاں بیٹھنے والے تھے، ان کے خلاف بھی خلافت کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ ایک روایت ہے کہ ایک دن غیلان بن فرشتہ الضبی حضرت عثمان سے ملا اور بولا کیا آپ کو کوئی جوان آدمی نہیں ملتا جو ابوموسیٰ اشعری جیسے بوڑھے کو بصرہ کا گورنر بنا رکھا ہے۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ ایذج کے لوگوں اور وہاں کے کردیوں نے بغاوت کردی تھی۔ ابوموسیٰ اشعری نے ان باغیوں کے خلاف پاپیادہ جہاد پر آمادہ کرنے کے لیے مجمع عام میں ایک نہایت پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی اس کا اثر یہ ہوا کہ جو جس حال میں تھا اسی حالت میں جہاد کے لیے چل پڑنے پر آمادہ ہو گیا، لیکن چند لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے مجمع سے کہا کہ آپ لوگ روانہ ہونے میں عجلت نہ کریں، ہم کو ذرا یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے گورنر کا کیا حال ہے؟ اب ابوموسیٰ اشعری جہاد میں شرکت کی غرض سے دارالامارت سے باہر آئے تو اس شان سے کہ چالیس خچروں پر ان کا سامان لدا ہوا تھا، یہ دیکھتے ہی مجمع مشتعل ہو گیا، آگے بڑھ کر جس خچر پر ابوموسیٰ اشعری سوار تھے، اس کی لگام پکڑ کر کھڑے ہو گئے، بڑی مشکل سے کچھ کہہ سن کے ابوموسیٰ اشعری

---

[1] الاعلام ج ۳ ص ۱۴۹

[2] طبری ج ۴ ص ۴۲۱، یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سعید بن العاص کے دادا (باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

نے پیچھا چھڑایا۔ اس وقت تو بات رفت گذشت ہو گئی۔ لیکن پھر اہل بصرہ نے اپنا ایک وفد حضرت عثمان کے پاس بھیجا، جس نے شکایات کر کے بصرہ کی گورنری سے ان کی سبکدوشی کا پر زور مطالبہ کیا۔[1]

بصرہ کے لوگوں کی دلجوئی کے لیے ابو موسیٰ اشعری گورنری سے سبکدوش تو کر دیے گئے لیکن حضرت عثمان نے ان کو لکھا کہ: "میں آپ کو کسی کمزوری یا بددیانتی کی وجہ سے الگ نہیں کر رہا ہوں۔ آپ مہاجرین اور السابقون الاولون میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں، اور مجھے اس کا اعتراف ہے، ساتھ ہی تحریر فرمایا" میں نے عبداللہ بن عامر کو حکم دیا ہے کہ وہ تمیں ۳ ہزار درہم آپ کی خدمت میں پیش کر دے۔[2]

بہر حال یہ حالات تھے جن کے پاس حضرت ابو موسیٰ اشعری معزول کئے گئے اور ان کی جگہ عبداللہ بن عامر بن کریز کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا گیا۔

عبداللہ بن عامر بن کریز الاموی القرشی تھے، ابو عبدالرحمن کنیت تھی ۴ھ میں پیدا ہوئے ۵۹ھ میں مکہ میں انتقال ہوا اور عرفات میں تدفین ہوئی۔ حضرت عثمان کے خالہ زاد بھائی تھے، بصرہ کے جب گورنر ہوئے ہیں، اس وقت ۲۵ برس کے نوجوان تھے۔ نہایت عالی ہمت، بہادر، سخی، سیر چشم اور لیڈر شپ کے اوصاف و کمالات سے بہمہ وجوہ متصف تھے۔ حضرت علی فرماتے تھے۔ "ابن عامر سید فتیان قریش" ابن عامر نوجوانان قریش کا سرخیل ہے۔" امیر معاویہ کو

(بقیہ حاشیہ) کا نام بھی سعید بن العاص ہے اس لیے دادا اور پوتے کے واقعات میں بسا اوقات التباس ہو جاتا ہے، اس کا خیال رکھنا ضروری ہے، دادا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد پایا تھا مگر اسلام سے محروم رہا۔

[1] طبری ج ۴ ص ۲۶۴ - ۲۶۵

[2] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۲

جب ابن عامر کے انتقال کی خبر پہونچی تو سخت افسوس ہوا اور فرمایا: اللہ ابو عبدالرحمٰن پر اپنی رحمت نازل فرمائے، اب ہم کس پر فخر و مباہات کریں گے۔

ابن عامر کے مجد و شرف کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ۷ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضا کے ارادہ سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو ابن عامر جن کی عمر اس وقت تین برس تھی کسی کے ساتھ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، کیا یہ سلمیہ کا بچہ ہے؟" لوگوں نے کہا، "جی ہاں! اس پر آپ نے فرمایا: "یہ ہمارا بیٹا ہے اور تم سب میں ہم سے زیادہ مشابہ ہے" اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور نے ابن عامر کا تالو دبایا اور اس کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا[۱] کارنامے آپ پڑھ ہی چکے ہیں، جس طرح مغرب میں مصر سے لے کر جبل الطارق تک کی بحر و بر میں فتوحات کا ہیرو عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ہے، اسی طرح مشرق میں فارس سے لے کر کابل تک کی شاندار فتوحات کا سہرا عبداللہ بن عامر بن کریز کے سر ہے، ساتھ ہی عبداللہ بن عامر میں آباد کاری اور خدمت خلق کا بڑا جذبہ تھا، چنانچہ اس نے ایک چوڑی سڑک (High way) نکالنے کی غرض سے بصرہ میں بہت سے مکانات ... خریدے اور ہدم کر دئے، مورخین لکھتے ہیں: ابن عامر پہلا شخص ہے جس نے عرفہ (حجاز) میں حوض بنا کر چشموں کا پانی ان تک پہونچایا اور اس طرح لوگوں کو سیراب کیا[۲]

شام کے گورنر امیر معاویہ تھے، اگرچہ وہ بھی اموی تھے، لیکن یہاں عزل و نصب کا سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ امیر معاویہ کا تقرر حضرت عمر نے کیا تھا اور خلافت عثمانی

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۱

[۲] تاریخ الاسلام ذہبی ج ۲ ص ۲۶۶ ۔ نیز ملاحظہ کیجئے البدء والتاریخ ج ۵ ص ۱۰۹

کی پوری مدت میں یہ اس عہدہ پر برقرار رہے۔

جن صحابہ کو معزول کر کے ان کی جگہ نوجوانان بنی امیہ کو مقرر کرنے کا اعتراض کیا جاتا ہے اس کا تعلق بس انھیں چند صحابہ سے ہے جن کو ہم نے بیان کیا ہے، ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ حقیقت بدرجۂ اتم ثابت ہو جاتی ہے کہ جن حالات سے مجبور ہو کر حضرت عمر عزل و نصب کرتے تھے اور اس کا مقصد کسی صحابی کی تنقیص ہرگز نہیں ہوتا تھا اسی قسم کے حالات کے ماتحت خلافت عثمانی میں چند صحابہ کا عزل ہوا، لیکن ان کے عزت و احترام پر کوئی حرف نہیں آیا۔ بہرحال بے شک ! ان صحابہ کی جگہ جوانان بنوامیہ کا تقرر ہوا جو حضرت عثمان کے رشتے دار بھی تھے لیکن یہ جوان کون اور کیسے تھے ؟ تاریخ اسلام آج تک ان کے کارناموں پر فخر کرتی ہے۔ فشتان مَا بَینھما!

(۲) عمال و منصب داران حکومت سے باز پرس

دوسرے اعتراض کی نسبت یہاں کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نظم و نسق کے باب میں ہم بتا آئے ہیں کہ حضرت عثمان اپنے عہدہ داران وافسران حکومت کے ایک ایک عمل پر نگاہ رکھتے تھے۔ لوگوں سے دریافت حال کرتے رہتے تھے اور جس کسی میں کوئی بات قابل اعتراض پاتے اس پر فوراً ٹوکتے اور اس کی اصلاح کرتے تھے۔

چنانچہ اس سلسلے میں متعدد واقعات ہم لکھ چکے ہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ مملکت اسلامی بہت وسیع ہو گئی تھی، فاصلے دور دراز کے تھے، رسل و رسائل میں وقت صرف ہوتا تھا اس بنا پر یہ ممکن ہے کہ کوئی واقعہ حضرت عثمان کے علم میں ہی نہ آیا ہو، یا آیا ہو مگر اس کی تلافی نہ کر سکے ہوں لیکن ایسا کوئی واقعہ نہیں دکھایا جا سکتا جو آپ کے علم میں آ گیا ہو اور آپ نے تحقیق کے بعد تادیبی کارروائی نہ کی ہو، چنانچہ "اسباب بغاوت" کے زیر عنوان آپ پڑھ چکے ہیں کہ متعدد اشخاص تو باغیوں کے زمرہ میں محض اسی وجہ سے

شریک ہو گئے تھے کہ حضرت عثمان نے ان کی بے عنوانیوں کے باعث ان کو سزا دی تھی

حکم بن العاص حکم بن العاص حضرت عثمان کے چچا تھے، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے اور مدینہ میں رہنے لگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ پیٹ کے کچے ہیں جو باتیں بھید کی ہوتی ہیں ان کو بھی افشا کر دیتے ہیں۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طائف میں جلا وطن کر دیا تھا۔ خلافت فاروقی تک وہیں رہے، حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو مدینہ بلا لیا آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے[1]

سوال یہ ہے کہ اس واقعہ میں کونسی بات قابل اعتراض ہے؟ حکم بن العاص کا جرم یہی تھا کہ وہ اسرار نبوی کا افشا کر دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس جرم کے ارتکاب کا امکان ہی باقی نہیں رہا تو اب جلا وطنی کی ضرورت بھی نہیں رہی، پھر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حکم بن العاص اپنے کیے پر شرمندہ اور نادم نہ ہوں گے اور انھوں نے توبہ نہ کی ہوگی۔ توبہ واستغفار سے تو بڑے بڑے گناہ یہاں تک کہ ارتداد بھی معاف ہو جاتے ہیں، پھر یہ گناہ کیوں معاف نہیں ہوتا، یہ جلا وطنی کی سزا تھی نہ کہ عمر بھر کے لیے، اگر ایسا ہوتا تو کیا حضرت عثمان پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے باوجود حکم نبوی کو منسوخ کر دینے کی جرأت کر سکتے تھے! فاین تذھبون،

(۴) چوتھا اعتراض عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بارہ میں ہے، اس کا جواب سوال اول کے جواب کے ضمن میں گذر چکا ہے۔

(۵) اقربا پروری پانچواں اعتراض یہ ہے کہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بڑی بڑی رقمیں اور جاگیریں بطور انعام دیں، اس سلسلے میں بیان

---

[1] الاصابۃ ج ۲ ص ۲۸، اصابۃ اور اسد الغابہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی حکم کو مدینہ آنے کی اجازت دے گئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن سعد کو طرابلس الغرب کی غنیمت کا خمس الخمس دلایا گیا (اس کا جواب گذر چکا ہے) مروان بن الحکم کو افریقیہ کی غنیمت کا خمس دیا گیا، عبداللہ بن خالد بن اسد کو چار لاکھ درہم، حرث بن الحکم کے ساتھ حضرت عثمان نے اپنی بیٹی عائشہ کی شادی کی اور حرث کو ایک لاکھ درہم دیے، اس کے علاوہ مدینے کے بازار کا ایک حصّہ بھی اس کے نام لکھا، حکم بن العاص کو ایک لاکھ اور ابو سفیان بن حرب کو دو لاکھ درہم عطا کیے گئے۔

جواب یہ ہے کہ مروان بن الحکم کے متعلق دو قول ہیں، ایک تو یہ کہ حضرت عثمان نے جو رقم اس کو دی تھی جب ان کو مشورہ دیا گیا تو وہ رقم انھوں نے واپس لے لی، یہی بات خالد بن اسد کی رقم کے بارے میں کہی گئی ہے[1] دوسرا قول یہ ہے کہ افریقہ کی غنیمت کا خمس مروان کو دیا نہیں گیا تھا بلکہ مروان نے اس کو خرید لیا تھا، چنانچہ ابن خلدون نے تصریح کی ہے۔

وارسل ابن الزبیر بالفتح والخمس، فاشتراہ مروان بن حکم بخمس مائۃ الف دینار، وبعض الناس یقول: اعطاہ ایاہ ولا یصح[2]

عبداللہ بن زبیر نے فتح (افریقیہ) کی اطلاع بھیجی اور ساتھ ہی غنیمت کا خمس بھیجا، اس کو مروان بن حکم نے پانچ لاکھ دینار میں خرید کر لیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے اس کو عطیہ دیا تھا لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔

حکم بن العاص حضرت عثمان کے چچا تھے، اس لیے اس وقت یقیناً بہت بوڑھے، ضعیف اور کمزور ہوں گے، پھر نابینا بھی ہو گئے تھے، ان حالات میں اگر حضرت عثمان

---

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۶ ص ۱۶۷

[2] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۱۲۹

نے بطور صلہ رحمی کے ان کو یہ رقم دی تو ان کا یہ فعل قابل مدح قرار پاتا ہے یا قابل مذمت!
حکم کا بیٹا حرث حضرت عثمان کا داماد تھا، داماد کی مدد کرنا اپنی بیٹی کی مدد کرنا ہے اس میں
اعتراض کی کیا بات ہے؟ اس سلسلے میں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں: (۱) ایک یہ کہ فیاضی
اور جود وعطا جو اسلام میں ایک اعلیٰ درجہ کی فضیلت اخلاقی ہے اور قرآن و حدیث میں
جس کی بڑی تعریف آئی ہے وہ حضرت عثمان کی فطرت اور جوہر طبیعت تھی، اعزا، اقربا
اور اہل خاندان کی تخصیص نہ تھی، ان کا ابر کرم اپنے اور پرائے سب پر برستا تھا ایک
مرتبہ حضرت طلحہ عثمان ذوالنورین کے پچاس ہزار کی رقم کے مقروض تھے، ایک دن جب
حضرت عثمان مسجد سے نکل رہے تھے، طلحہ نے ان سے کہا: میرے پاس روپیہ آگیا ہے
آپ اپنی رقم لے لیجئے، انھوں نے فرمایا:

ھو لک یا ابا محمد، معونۃ لک علی مروتک [1]	ابو محمد! یہ رقم میں نے تم کو دے دی، اپنی ضرورت پر خرچ کرو۔

حضرت عمر کی یہ عادت تھی کہ اگر کسی عامل کی مالی حالت میں غیر معمولی ترقی دیکھتے تھے
تو اس سے بازپرس کرتے تھے اور اگر اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوتے تو اس کے
مال میں بٹائی کر کے اس کا نصف بیت المال میں داخل کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ابو
سفیان اور ان کے بیٹے عتبہ دونوں اس کا نشانہ بنے۔ حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو
دونوں سے فرمایا، وہ رقم تم مجھ سے لے لو، لیکن دونوں کی غیرت نے اسے گوارا نہ کیا
انکار کر دیا [2] حضرت ابوذر غفاری کے متعلق آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ حضرت عثمان ان
کے انتقال کے بعد ان کی بیوی اور بیٹی کو اپنے گھر لے آئے اور ان کے تمام

---

[1] طبری ج ۵ ص ۴۰۵

[2] العقد الفرید ابن عبدربہ ج ۱ ص ۴۹

اخراجات کے متکفل رہے؛ پس جس دریا دل کی فیاضی کا عالم دوسروں کے ساتھ یہ ہو خود اس کے اپنے اعزا و اقربا کے ساتھ اس کا معاملہ کیا کچھ کرم و نوازش کا نہیں ہوگا، آخر قرآن مجید میں بھی ذوی القربیٰ کو تمام مصارف خیر پر مقدم رکھا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد بخاری میں ہے:

صِل اخاک ظالماً او مظلوماً	تم اپنے بھائی کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم

(۲) دوسری بات ذہن میں رکھنے کی یہ ہے کہ حضرت عثمان خود بے حد متمول اور دولت مند تھے اور دولت مند بھی آج کے نہیں عہد جاہلیت سے تھے اور پھر فیاض، سیر چشم اور سخی بھی اسی درجہ کے تھے اس بنا پر ان کی نسبت یہ بدگمانی ہرگز نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے ذاتی داد و دہش کے سلسلے میں خزانۂ حکومت میں تصرف کیا ہوگا؎ اسی سیر چشمی کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت عثمان خلافت کے بعد بیت المال سے اپنے لیے ایک حبہ بھی نہیں لیتے تھے، چنانچہ جب ملک میں شورش بڑھی تو آپ نے مجمع عام میں ایک نہایت پر زور تقریر کی اور اس میں جو اعتراضات کیے جاتے تھے ان میں سے ایک ایک کا جواب دیا، خاص امر زیر بحث کے متعلق فرمایا۔

وقالوا! انّی اُحبّ اھل بیتی واُعطیھم فاما حبی فانہ لم یمل معھم علی جور بل احمل الحقوق علیھم واما	اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے اہل خانہ سے محبت کرتا ہوں اور ان کو دیتا دلاتا ہوں، تو ہاں میں محبت کرتا ہوں. لیکن ان کی محبت

؎ ورنہ زبان کس کی پکڑی جاسکتی ہے، ایک موقع پر ایک اعرابی نے حضرت عمر جیسی شخصیت پر اعتراض کردیا کہ غنیمت میں جتنا کپڑا آپ کے حصہ میں آیا ہے اس میں تو آپ کا یہ کرتہ تیار نہیں ہوسکتا، پھر یہ کپڑا کہاں سے آیا۔

اعطاءهم! فانی ما اعطیهم من مالی، ولا استحل اموال المسلمین لنفسی ولا لاحد من الناس ولقد کنت اعطی العطیة الکبیرة الرغیبة من صلب مالی ازمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما وانا یومئذ شحیح حریص، افحین اتیت علی اسنان اہل بیتی وفنی عمری وودعت الذی لی فی اہلی قال الملحدون ما قالوا! وانی واللہ ماحملت علی مصر من الامصار فضلا مافیجوز ذالک لمن قالہ ولقد رددتہ علیہم، وما قدم علی الا الاخماس، ولا یحل لی منہا شیء، فولی المسلمون وضعہا فی اہلہا دونی، تلفت من مال اللہ بفلس فما فوقہ وما اتبلغ منہ ما آکل الا مالی [1]

مجھ کو ناانصافی پر آمادہ نہیں کرسکتی. بلکہ میرے اہل بیت پر جو کسی کے حقوق ہیں وہ ان سے دلواتا ہوں، رہا ان کو دنیا دلانا! تو جو کچھ میں ان کو دیتا ہوں وہ اپنے مال میں سے دیتا ہوں، اور مسلمانوں کا مال تو نہ میں اپنے لیے حلال سمجھتا ہوں اور نہ کسی اور شخص کے لیے میں عہد نبوی اور اس کے بعد عہد شیخین میں بڑے بڑے عطیات اپنی کمائی میں سے دیا کرتا تھا حالانکہ مستقبل کے خیال سے میں اس زمانے میں کفایت شعار تھا تو پھر اب جبکہ میں اپنے خاندان کی اوسط عمر کو پہونچ چکا ہوں اور زندگی پوری ہو گئی ہے اور میرے پاس جو کچھ تھا وہ میں اپنے گھر کے لوگوں کے سپرد کرچکا ہوں یہ ملحد اور خدا ناشناس جو جی میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہیں اور بخدا میں نے کسی شہر پر خراج کا کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالا ہے جس کی وجہ سے ان لوگوں کا ایسا ویسا کہنا درست ہو اور جو کچھ وصول ہوا وہ سب خراج دینے والوں اور مسلمانوں پر ہی میں نے خرچ کیا ہے، پھر میرے پاس جو کچھ آیا ہے وہ خمس آیا ہے، اس میں سے کوئی چیز میرے لیے حلال نہیں تھی، مسلمانوں کو اختیار تھا میرے مشورہ کے بغیر جہاں چاہیں خرچ کریں اللہ کے مال میں سے ایک پیسہ کے برابر بھی کوئی چیز تلف نہیں ہوئی اور میں نے اس میں سے کوئی چیز ہڑپ نہیں کی، میں جو کچھ کھاتا ہوں اپنے مال میں سے کھاتا ہوں

[1] طبری ج ۴ ص ۳۴۷، ۳۴۸

حضرت عثمان نے یہ تقریر مجمع عام میں کی تھی، اگر اس میں کوئی بات خلاف واقعہ ہوتی تو لوگ ٹوکتے لیکن یہاں سب نے آمنا و صدقنا کہا اور ایک آواز بھی مخالفت میں نہیں اٹھی اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عثمان نے جو کچھ فرمایا پبلک نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

چراگاہوں کی تخصیص

معترضین کو ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ حضرت عثمان نے مدینہ کی چراگاہوں کو اپنے جانوروں کے لیے مخصوص کر لیا ہے اور دوسرے لوگوں کے مویشی ان میں نہیں جا سکتے، حضرت عثمان نے اس خطبہ میں اس اعتراض کا بھی جواب دیا ہے، فرماتے ہیں: "میں نے وہی چراگاہیں مخصوص کی ہیں جن کو میرے پیش روؤں نے مخصوص کیا تھا، ان چراگاہوں کو صدقات کے جانوروں کے لیے محدود کر دیا گیا ہے تاکہ صدقات کے انچارج میں اور دوسرے کسی شخص میں نزاع نہ ہو، اس تخصیص کے باوجود اگر کوئی آ گیا تو اس کو نہ منع کیا اور نہ ہٹایا، بجز اس شخص کے جو رشوت کا لین دین کرے بہرحال یہ انتظامات جو کچھ بھی ہیں سرکاری مویشیوں کے لیے ہیں، میرا حال تو یہ ہے کہ جب میں خلیفہ ہوا تھا اس وقت اونٹ اور بکریاں سب سے زیادہ میرے ہی پاس تھے، لیکن آج یہ عالم ہے کہ لے دے کے اب میرے پاس صرف ایک بکری اور دو اونٹ ہیں جو میرے حج کے لیئے ہیں۔"

یہ فرمانے کے بعد حضرت عثمان نے مجمع سے پوچھا: کیا ایسا ہی نہیں ہے جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ مجمع ایک آواز ہو کر بولا: "بیشک!" [1]

نوجوانوں کو ذمہ داری کے عہدے دینا

ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ نوجوانوں کو بڑے بڑے عہدے دیے جا رہے ہیں، حضرت عثمان نے جواب دیا: اس میں کیا برائی ہے بشرطیکہ اس عہدے کے فرائض و

---

[1] طبری ج ۳ ص ۳۴۷

واجبات کو ادا کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم ہو۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکابر صحابہ پر اسامہ بن زید کو نوعمری کے باوجود امیر لشکر نہیں بنایا تھا؟ حضرت عثمان نے پھر پوچھا: کیا ایسا ہی نہیں ہے؟ سب نے کہا: ہاں بیشک۔ [1]

تقسیم اراضی ایک اعتراض یہ تھا کہ عرب سے باہر اپنے لوگوں کو قطعات زمین دے دیئے ہیں، اس کے جواب میں فرمایا: جو زمینیں فتح ہوتی گئیں وہ مہاجرین و انصار میں مشترکہ رہیں، پھر ان میں سے جو حضرات مفتوحہ زمینوں میں آباد ہو گئے ہیں وہ وہیں رہ پڑے، لیکن ان میں سے جو حضرات بلاد عرب میں واپس آ گئے ہیں نے مفتوحہ ممالک میں ان کی خالی پڑی ہوئی زمینوں سے ان لوگوں کی بلاد عرب کی زمینوں سے تبادلہ کرا دیا جو وہاں جا کر آباد ہونا چاہتے ہیں۔ [2] شہروں کی توسیع اور بڑھتی ہوئی آبادی کے انتظام کے لیے یہ اقدام ضروری تھا۔ اسی لیے اس میں قابل اعتراض بات کیا ہو سکتی تھی۔

(۶) مصری وفد کی واپسی ایک اعتراض جو بڑے طمطراق سے کیا جاتا ہے مصری وفد کی واپسی کا ہے، اس کا واقعہ یہ ہے کہ جب مصر کا ایک وفد جس میں کوفہ اور بصرہ کے لوگ بھی شامل تھے اپنے مطالبات کا محضر نامہ لے کر اچانک مدینہ کے قرب و جوار میں پہونچ گیا اور حضرت علی کے سمجھانے بجھانے سے واپس ہو گیا تو راستے میں اس شخص کو ایک وفد ملا جو خلیفہ کا ایک خط لے کر والئ مصر کے پاس

---

[1] طبری ج ۴ ص ۳۴۷

[2] علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد جب مدینہ کی واپسی کا ارادہ فرمایا تو عتاب بن اَسید کو جو چوبیس برس کے نوجوان تھے، مکہ کا گورنر مقرر کیا جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو آپ نے بھی ان کو اس عہدہ پر رکھا، دیکھئے ابن ہشام، اصابہ و اسد الغابہ ذکر عتاب بن اَسید

جارہا تھا وفد کو شبہ ہوا اور اس نے قاصد کی جامہ تلاشی لی تو وہ خط مل گیا جس میں تحریر تھا کہ وفد کی گردن اڑا دی جائے۔ اس پر وفد کو خلافت کی بدعہدی پر سخت غصہ آیا اور وہ پھر مدینہ لوٹ آیا۔ حضرت عثمان کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو انھوں نے والی مصر کے نام خط سے قطعاً لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس پر لوگوں نے قیاس کیا کہ خط مروان نے حضرت عثمان کی طرف سے لکھ دیا ہوگا۔ مگر ساتھ ہی خیال گیا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کا الزام بھی خلیفہ پر آتا ہے۔

یہ خط کس نے لکھا؟

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خط کا یہ معاملہ نہایت اہم ہے کیونکہ یہ خط مروان نے لکھا ہے یا کسی اور شخص کی یہ کارروائی ہے۔ اگر مروان نے لکھا ہے تو پھر معترضین کی اس بات کا کیا جواب ہوگا کہ جس خلیفہ کا میر منشی (مروان حضرت عثمان کا کاتب یعنی میر منشی تھا) اس درجہ خود سر ہو کہ وہ خلیفہ کے نام سے اس کے علم اور اطلاع کے بغیر اس قسم کے خطوط لکھنے کی جرأت کر سکے وہ ہرگز خلافت کا مستحق نہیں ہے، اور بصورت دیگر اگر مروان نے نہیں لکھا تو اس کی خاطر خواہ تحقیق ہونی چاہیئے کہ یہ کارروائی کس شخص کی تھی۔ افسوس ہے ہمارے مورخین کی عادت ہے کہ بڑے سے بڑا اہم اور نازک معاملہ ہوتا ہے اور وہ روایتوں کے سہارے اس پر سرسری گذر جاتے ہیں، اور اس طرح لوگوں کو موقع دیتے ہیں کہ اپنے ذوق کے مطابق اس سے نتیجہ اخذ کرتے رہیں۔

ہم نے اس سلسلے میں جو غور کیا ہے اس سے یہ امر قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی خط درحقیقت عبداللہ بن سبا یا اس کی جماعت کے کسی شخص کا لکھا ہوا تھا اور مروان سے ہرگز اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ مصری وفد کو جس طرح یہ خط، حضرت عثمان کا لکھا ہوا ملا تھا اسی طرح ان کو ایک خط، حضرت علی کا لکھا ہوا۔ موصول ہوا تھا جس میں ان لوگوں

کو مدینہ لوٹ آنے اور حضرت عثمان کے سامنے اپنے مطالبات کو پیش کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا، چنانچہ جب یہ لوگ مدینہ واپس آکر حضرت علی سے ملے اور ان سے درخواست کی کہ آپ بھی ہمارے ساتھ خلیفہ سوئم کے پاس چلیئے تو حضرت علی نے فرمایا: قسم خدا کی! میں تمہارے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔ حضرت علی کا یہ جواب سن کر یہ لوگ بگڑ گئے اور سخت طنز کے انداز میں بولے: "اگر ہمارے ساتھ چلنے کو آمادہ نہیں ہو تو پھر آپ نے ہم کو خط کیوں لکھا تھا؟" حضرت علی نے یہ سنا تو بھونچکے رہ گئے اور فرمایا: نہیں! خدا کی قسم! میں نے تم کو ہرگز کوئی خط نہیں لکھا۔"

اس واقعہ کا یہ جز نہایت اہم ہے، مگر افسوس ہے کہ عام مورخین اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اس جز کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اب اصل عربی عبارت ملاحظہ کیجئے۔

ثم رجع المصریون فبینما ھم فی الطریق اذا ھم براکب یتعرض لھم ثم یفارقھم ثم یرجع الیھم ثم یفارقھم ویتبینھم قالوا: مالک؟ ان لک الامان، ماشانک؟ قال: انا رسول امیر المومنین الی عاملہ بمصر! ففتشوہ، فاذا ھم بالکتاب علی لسان عثمان، علیہ خاتمہ الی عاملہ بمصر ان تصلبھم او تقطع ایدیھم وارجلھم، فاقبلوا حتی رجعوا المدینۃ، فاتوا علیاً رضی اللہ عنہ وقالوا: الم تر عدو اللہ کتب فینا بکذ

پھر مصری لوگ مدینہ سے واپس ہوگئے لیکن ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ ان کا سامنا ایک سوار سے ہوا یہ سوار کبھی ان لوگوں کے قریب آتا اور کبھی ان سے الگ ہو جاتا تھا۔ دو تین مرتبہ اس نے یہی حرکت کی تو اب ان لوگوں نے اس سے کہا۔ تجھے ہوا کیا ہے؟ ہم تجھکو امان دیتے ہیں، بتا تیرا حال کیا ہے؟ یہ شخص بولا: میں امیر المومنین کا قاصد ہوں، ان کا خط گورنر مصر کے نام لے کر جا رہا ہوں۔ اب مصریوں نے اس شخص کی تلاشی لی تو انہیں ایک خط ملا جس میں گورنر مصر کو حکم دیا گیا تھا کہ ان مصریوں کو دار پر لٹکا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں۔ یہ خط خلیفہ کی طرف سے

اوکذا، وان اللہ قد احل دمہ، ثم معنا الیہ" قال: واللہ لا اقوم معکم قالوا: فلم کتبت الینا۔ قال: واللہ ما کتبت الیکم کتابا قط۔ فنظر بعضھم الی بعض ثم قال بعضھم لبعض: الھذا تقاتلون اولھذا تغضبون[1]

تھا اور اس پر مہر خلافت لگی تھی، اب مصری لوگ پھر واپس مدینہ پلٹے، حضرت علی کے پاس آئے اور کہا دیکھیے دشمن خدا نے ہمارے متعلق کیا کچھ لکھا ہے، اب ہمارے لیے اس کا خون حلال ہے، حضرت علی سے مزید کہا: آپ کھڑے ہوجائیے اور ہمارے ساتھ چلیے حضرت علی نے کہا، خدا کی قسم! میں تمہارا ساتھ نہ دوں گا، یہ بولے، تو پھر آپ نے ہم کو خط کیوں لکھا تھا، حضرت علی نے جواب دیا: خدا کی قسم! میں نے ہرگز تم لوگوں کو کوئی خط نہیں لکھا، اس پر یہ لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور بعضوں نے بعضوں سے کہا: کیا تم انھیں کے لیے لڑنے یا غصہ کرنے چلے ہو۔

یہ روایت تقریباً انھیں الفاظ کے ساتھ طبری میں بھی ہے[2]

اب سوال یہ ہے کہ اگر بالفرض حضرت عثمان کا خط ان کی طرف سے مروان نے لکھا تھا تو حضرت علی کا خط ان کی طرف سے کس نے لکھا تھا؟ واقعہ کا دروبست صاف بتا رہا ہے کہ ایک ہی شخص یا ایک ہی جماعت ہے جس نے ایک خط اہل مصر کے نام حضرت علی کی طرف سے لکھا اور دوسرا خط حضرت عثمان کی طرف سے گورنر مصر کے نام تحریر کیا اور یہ جماعت عبداللہ بن سبا کے علاوہ اور کس کی ہوسکتی ہے؟ حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس جماعت نے حضرت طلحہ، اور حضرت زبیر اور دوسرے اکابر صحابہ کی طرف سے بھی اسی قسم کے جعلی خطوط لکھ لکھ کر مختلف شہروں میں بھیجے تھے[3] یہی

---

[1] موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان: حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی ص ۵۳۲

[2] طبری ج ۴ ص ۳۵۵

[3] البدایۃ والنھایۃ ج ۷ ص ۱۷۵

جماعت تھی جس نے یہی حربہ استعمال کر کے جنگ جمل کے موقع پر حضرت علی اور حضرت عائشہ میں جنگ کرادی تھی، مذکورہ بالا عبارت کا آخری فقرہ دیکھئے صاف بتا رہا ہے کہ یہ جماعت سبائیوں کی ہے جو حضرت علی کو برسر اقتدار لانا چاہتی ہے، چنانچہ جب حضرت علی نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو انھوں نے آپس میں کہا: بس! کیا تم انھیں کی خاطر یہ جنگ مول لے رہے ہو" علاوہ ازیں روایت میں قاصد کا جس طرح مصری وفد سے آمنا سامنا ہوتا ہے، وہ ان لوگوں کی طرف بڑھتا ہے، پھر ان سے الگ ہوتا ہے، اور یہی حرکت دو تین مرتبہ کرتا ہے، یہ خود اس کی دلیل ہے کہ یہ سب من گھڑت افسانہ ہے، ورنہ کیا خلیفہ کے قاصد کو اس کی خبر نہیں تھی کہ مصری وفد جو ابھی کچھ دیر پہلے مدینہ سے مصر کے لیے واپس لوٹا ہے اس کی نگاہوں سے بچ کر وہ کس طرح مصر پہونچ سکتا ہے۔

پھر جہاں تک مروان بن الحکم کی ذات کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ نہایت سمجھ بوجھ کا اور دور اندیش سیاست داں تھا۔ یہاں تک کہ امیر معاویہ اس سے اس درجہ متاثر تھے کہ ایک مرتبہ قبیصۃ بن جابر نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے بعد خلیفہ کس کو بنایا جائے تو انھوں نے چند آدمیوں کے نام لیے، ان میں ایک نام مروان بن الحکم کا بھی تھا اور اس کے متعلق فرمایا۔

واما القاری الفقیه الشدید فی حدود اللّٰه مروان [1] یعنی مگر بہرحال قاری، فقیہہ اور حدود اللہ کے بارہ میں سخت تو مروان ہے،

محدثین نے مروان کو ثقہ اور معتبر مانا ہے، چنانچہ امام بخاری نے التاریخ الکبیر (جلد ۴ ص ۳۶۸) میں حضرت زبیر بن عوام کی ایک روایت مروان بن حکم سے نقل کی ہے

---

[1] سیر اعلام النبلا حافظ ذہبی ج ۳ ص ۳۱۵

اور اس کے شروع میں کہا ہے: میں نہیں خیال کرتا کہ مروان ہم پر کوئی تہمت طرازی کرتا ہے، حضرت عثمان کی شہادت کے بعد کچھ لوگ تھے جو علی اور طلحہ کی طرح زبیر پر باغیوں کی پشت پناہی کرنے کی تہمت لگاتے تھے، اس قول میں حضرت زبیر نے مروان کی طرف سے یہ صفائی پیش کی ہے کہ اس نے ہم پر یہ تہمت نہیں لگائی، حافظ ابن حجر نے الاصابہ (ذکر مروان) اور مقدمۂ فتح الباری میں حضرت عروۃ بن الزبیر کا یہ قول نقل کیا ہے کان مروان لا یتھم فی الحدیث:

اس بنا پر یہ بالکل ناممکن ہے کہ مروان اس طرح کی خفیف الحرکتی کرے اور ناعاقبت اندیشی سے کام لے، کیا اس کو اس کا علم نہیں تھا کہ ملک اس وقت کس نازک دور سے گذر رہا ہے، اگر گورنر نے مصری وفد کے لوگوں کی گردنیں اڑادیں تو پوری مملکت اسلامیہ میں آگ لگ جائے گی اور معاملہ قابو سے باہر ہوجائے گا؟ کہتے ہیں کہ مروان حضرت عثمان پر حاوی اور مسلط تھا، یہ بھی سرتاسر غلط ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مروان حضرت عثمان کا ابن عم (داماد) اور آپ کا میر منشی بھی تھا اور اس بنا پر آپ کے مزاج میں دخیل اور بے تکلف تھا، اور کبھی کبھی حضرت عثمان کے اہل خانہ، خصوصاً ان کی بیوی نائلہ بنت الفرافصہ کو شکایت بھی پیدا ہوئی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ وہ حضرت عثمان پر اس درجہ حاوی اور مسلط تھا کہ آپ پر دباؤ ڈال کر امور حکمرانی میں جو چاہتا کرالیتا تھا، چنانچہ ایک مرتبہ اسی شورش کے زمانہ میں جب حضرت عثمان منبر پر اپنی تقریر ختم کر چکے جس میں آپ نے مخالفین سے دردمندانہ درخواست کی تھی کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں تو مروان فوراً کھڑا ہوگیا۔ اور بولا: اگر آپ حضرات نے خلیفہ کے مشورہ پر عمل نہیں کیا تو پھر ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی، حضرت عثمان نے یہ سنا تو سخت برہم ہوکر مروان کو ڈانٹا اور فرمایا۔ تو خاموش رہ، یہ میرا اور میرے ساتھیوں کا معاملہ ہے تجھ کو اس میں بولنے کا کیا حق ہے؟ کیا میں نے تجھے پہلے سے نہیں کہہ رکھا ہے کہ تو مت

بولا کر۔ مروان یہ سن کر خاموش ہو گیا اور حضرت عثمان منبر سے اتر آئے۔[1]

علاوہ ازیں یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ جن دنوں کا یہ واقعہ ہے ان دنوں میں گورنر مصر میں موجود تھا بھی یا نہیں؟ کیونکہ یہی وہ وقت ہے کہ جب شورش بڑھی اور اطراف واکناف ملک سے فتنہ انگیزی کی خبریں آنے لگیں تو حضرت عثمان نے مشورہ کے لیے فساد زدہ صوبوں کے گورنروں کو مدینہ طلب فرمایا، ان حضرات میں سعید بن العاص گورنر کوفہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح گورنر مصر بھی تھے، لیکن مجلس مشاورت کے اختتام کے بعد اور صوبوں کے گورنر تو اپنے اپنے مقام پر پہونچ گئے، لیکن مذکورہ بالا دو گورنر اپنے مقام پر واپس نہیں جا سکے، سعید بن العاص مدینہ سے واپس ہوئے تو فسادیوں نے ان کو کوفہ میں داخل نہیں ہونے دیا اور مصر کا معاملہ یہ ہوا کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے مصر سے مدینہ کے لیے روانہ ہوتے ہی فسادیوں کے سرغنہ محمد بن ابی حذیفہ نے مصر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور سائب بن ہشام بن عمرو العامری کو جسے عبداللہ بن سعد نے اپنا قائم مقام بنایا تھا وہاں سے نکال دیا۔[2]

پس اگر یہ صحیح ہے اور اس کے صحیح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تو ظاہر ہے پھر گورنر مصر کو خط لکھنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں!!

مہر خلافت کا معاملہ

آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت عثمان کی مہر خلافت ان کے ہاتھ سے بیر اریس میں گر گئی تھی اس کی تلاش میں تمام کنواں کھنگال ڈالا گیا، حضرت عثمان نے اس پر انعام کا بھی اعلان کیا مگر مہر نہیں ملی، سوال یہ ہے کہ مہر کیوں نہیں ملی۔ مہر سلیمانی کی طرح اسے شیاطین یا جنات تو لے نہیں گئے تھے

---

[1] طبری ج ۴ ص ۳۳۹

[2] طبری ج ۴ ص ۴۲۱

پھر آخر کہاں گئی؟ ہمارا خیال ہے یہ واقعہ خلافت عثمانی کے ساتویں برس کا ہے جب کہ فتنہ نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے عجب نہیں کہ اس کو چرا لیا گیا ہو اور اس طرح وہ عبداللہ بن سبا کے پاس پہونچ گئی ہو۔

ایک دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ اس جماعت باغیہ نے مہر خلافت جیسی ہی ایک مہر بنوا رکھی ہو، چنانچہ حضرت عثمان سے دریافت کیا گیا کہ اس مکتوب پر آپ کی مہر کیسے لگی؟ تو اس کا جواب انھوں نے یہی دیا تھا کہ "نقش علیہ" یعنی اس جیسی بنالی گئی[1] اور اس میں ذرا استبعاد نہیں، حضرت عمر کس جاہ و جلال اور رعب داب کے خلیفہ تھے! مگر ان کے زمانے میں بھی کوفہ کے ایک شخص معن بن زائدہ نے مہر خلافت جیسی ایک مہر بنوالی اور اس کے ذریعہ خراج کی بڑی بڑی رقمیں وصول کرلیں، آخر جب حضرت عمر کو اس فریب کاری کا علم ہوا تو آپ نے کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ کو حکم بھیجا کہ اس شخص کو فوراً گرفتار کر کے سزا دی جائے[2]

بہر حال صفحات گزشتہ میں ہم نے جو بحث کی ہے اس سے قانون کی موجودہ اصطلاح circumstantial evidence (واقعاتی ثبوت) کے طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ خط نہ مروان نے لکھا ہے اور نہ خلافت کے عملہ میں سے کسی نے لکھا، بلکہ یہ سب کچھ عبداللہ بن سبا کی شرارت اور اس کی سازش کا شاخسانہ تھا۔

عبداللہ بن مسعود اور عمار بن یاسر کے ساتھ تشدد کا معاملہ — حضرت عثمان پر ایک اعتراض

یہ بھی تھا کہ آپ نے مشہور اور بلند پایہ صحابی عبداللہ بن مسعود اور عمار بن یاسر کو زدو

---

[1] طبری ج ۴ ص ۳۶۸

[2] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۵۰

کوب کیا۔ شرح نہج البلاغہ کے مصنف نے تو اس واقعہ کو بڑی رنگ آمیزی اور مبالغہ سے بیان کیا ہے لیکن اصل حقیقت اس قدر ہے کہ حضرت عثمان جس زمانے میں زید بن ثابت کی قرأت کے مطابق مصحف عثمانی تیار کرا رہے تھے اس زمانے میں عبداللہ بن مسعود نے کہنا شروع کیا کہ میں زید بن ثابت سے زیادہ قدیم الاسلام ہوں اور اس بنا پر میرا مرتب کیا ہوا مصحف زیادہ مستند اور قابل اعتماد ہے، پھر حضرت عثمان نے ان سے ان کا مصحف طلب کیا تو وہ اسے دینے پر بھی رضامند نہیں ہوئے، چوں کہ تمام امت کو ایک قرآن پر جمع کر دینے کا معاملہ نہایت اہم تھا، جس کا ذکر آگے آئے گا، اس لیے حضرت عثمان کو تشدد سے کام لینا پڑا۔ انھوں نے عبداللہ بن مسعود کا وظیفہ بند کر دیا جو دو برس تک بند رہا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ عبداللہ بن مسعود ناظم خزانہ (Treasurer) تھے، ولید بن عقبہ سے ان کا کچھ روپے کے لین پر جھگڑا ہو گیا تو خلیفہ سوئم نے ان کو ان کے عہدہ سے الگ کر دیا یہ روایت اگر صحیح بھی ہے تو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کو ان کے عہدہ سے الگ نہیں کیا گیا تھا، بلکہ وہ خود اس سے مستعفی ہو گئے تھے، تاہم یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ حکومت کے معاملات اور نظم و نسق کے مقتضیات جو کچھ بھی ہوں، حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن مسعود دونوں ایک دوسرے کے مرتبہ و مقام کا بڑا لحاظ رکھتے اور باہم بڑا تعلق خاطر رکھتے تھے، چنانچہ ایک معتبر روایت ہے کہ:

• حضرت عثمان نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا مصحف ان سے زبردستی لے لیا اور اسے نذر آتش کر دیا تو موخر الذکر کو سخت ناگواری ہوئی، انھوں نے کہا: میں تو زید بن ثابت سے بھی زیادہ قدیم الاسلام ہوں، ساتھ ہی انھوں نے اپنے ساتھیوں کو ورغلایا کہ وہ خلیفہ کو اپنے مصاحف نہ دیں، لیکن جب حضرت عثمان نے ان کو لکھا کہ مصاحف کے بارے میں میرا جو طرز عمل ہے سب صحابہ اس پر متفق ہیں، آپ اختلاف

کر کے کیوں امت میں افتراق پیدا کرتے ہیں تو اس پر عبد اللہ بن مسعود نے اپنا اختلاف واپس لے لیا روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

فاناب واجاب الی المتابعة وترک المخالفة [1] عبد اللہ بن مسعود نے توبہ کی اور اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ خلیفہ کی پیروی کریں گے اور انکی مخالفت ترک کر دینگے

ایک عام روایت ہے کہ "عبد اللہ بن مسعود مرتے دم تک اس درجہ کبیدہ خاطر اور ناراض رہے کہ انھوں نے وصیت کر دی تھی کہ حضرت عثمان ان کے جنازہ کی نماز نہ پڑھائیں [2] لیکن یہ روایت غلط ہے کیوں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی صلح جوئی اور احترام اطاعت خلیفہ کا عالم تو یہ تھا کہ جیسا کہ گذر چکا ہے، حضرت عثمان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کے معمول کے خلاف منیٰ میں قصر کے بجائے چار رکعات پڑھیں تو عبد اللہ بن مسعود نے بھی چار پڑھیں، بعض لوگوں نے کہا: آپ تو اس پر اعتراض کرتے تھے! فرمایا ہاں! مگر میں خلیفہ کی مخالفت سے بچتا ہوں [3]

ابن سعد کا بیان ہے: "ہمارے نزدیک اثبت یہی ہے کہ عبد اللہ بن مسعود (المتوفی ۳۲ھ) کی نماز جنازہ حضرت عثمان نے پڑھائی تھی انتقال سے پہلے دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی اور دونوں نے ایک دوسرے کے لیے استغفار کیا تھا [4] انتقال کے بعد حضرت عثمان نے ان کی اولاد کے لیئے وظائف مقرر کئے اور زبیر بن عوام کو ان کا سرپرست تسلیم کیا: اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔

---

[1] ابن کثیر البدایة والنہایة ج ۷، ص ۲۱۸

[2] شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۲۳۸

[3] طبری ج ۴ ص ۲۶۸ والبدایہ والنہایة ج ۷ ص ۲۱۸

[4] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۱۴

اب عمار بن یاسر کا معاملہ دیکھئے، اس سلسلہ میں بھی حضرت عثمان کے متعلق بعض لوگوں نے غلط سلط سخت مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ شرح نہج البلاغۃ میں ہے کہ ایک مرتبہ عمار بن یاسر حضرت عثمان کی مزعومہ بدعنوانیوں کی ایک فہرست مرتب کر کے اس پر گفتگو کی غرض سے خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خلیفہ نے تحریر کا کچھ حصہ پڑھا اور پھر غضبناک ہو کر اسے پھینک دیا۔ اس کے بعد دونوں میں سخت کلامی ہوئی، حضرت عثمان نے نوکروں کو آواز دی اور عمار بن یاسر کو زدوکوب کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی، خلیفہ نے بھی اس میں حصہ لیا نتیجہ یہ ہوا کہ عمار بن یاسر بے ہوش ہو گئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ عمار بن یاسر انھیں معاملات پر گفتگو کرنے کی غرض سے آئے تھے، انھوں نے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی، حضرت عثمان نے کہلا بھیجا کہ میں اس وقت بہت مصروف ہوں، آپ فلاں وقت تشریف لائیے، وہ اڑ گئے اور بولے، نہیں! میں ابھی مل کر جاؤں گا، اس پر ان میں اور دربان میں سخت کلامی ہوئی اور انھوں نے خلیفہ کی شان میں گستاخانہ الفاظ زبان سے نکالے تو دربان نے ان پر ہاتھ اٹھایا اور مارا، لیکن حضرت عثمان کو اس کی اطلاع ہوئی تو دربان پر سخت برہم ہوئے۔"[1]

لیکن یہ دونوں روایتیں غلط ہیں اور اصل حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ عمار بن یاسر نے حضرت عثمان سے بیعت کی تھی لیکن ان کی ہمدردی شروع سے بنو ہاشم کے ساتھ تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت عثمان کے خلاف چہ می گوئیاں شروع ہوئیں تو عمار بن یاسر کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور وہ مدینے میں کھلم کھلا خلیفہ کے خلاف زبان طعن و اعتراض دراز کرنے لگے[2] تاہم حضرت عثمان نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی

[1] شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۲۳۰

[2] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۵۷

بلکہ ان کو اپنا ہی حامی اور مددگار سمجھ کر ان پر اعتماد کرتے رہے، چنانچہ جب اطراف و اکناف ملک سے شورش کی خبریں پہونچنی شروع ہوئیں اور حضرت عثمان نے تحقیق حال کے لیے چند افراد کا کمیشن مختلف سمتوں میں روانہ کیا تو اس کمیشن کے ایک ممبر عمار بن یاسر بھی تھے اور انھیں مصر بھیجا گیا تھا۔[۱]

لیکن عمار بن یاسر نے کمال یہ کیا کہ مصر گئے تھے خلافت کے ایلچی اور گماشتہ بن کر، اور وہاں محمد بن ابی بکر، محمد بن ابی حذیفہ اور عبداللہ بن سبا نے حضرت عثمان کے خلاف ایک سخت مہم چلا رکھی تھی، عمار بن یاسر بھی اس مہم میں ان لوگوں کے شریک کار ہو گئے، چنانچہ کمیشن کے سب افراد نے اپنے اپنے مقامات سے واپس ہو کر رپورٹ پیش کی، لیکن عمار واپس نہیں آئے اور مصر میں ٹھہر گئے، ایک روایت یہ ہے کہ مصر کے گورنر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح جب ان لوگوں کی سرگرمیوں اور خلافت دشمن حرکتوں سے تنگ آ گئے تو خلیفہ سے درخواست کی کہ ان لوگوں کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کی اجازت دی جائے، لیکن عثمان ذوالنورین نے اجازت دینے سے انکار کر دیا اور عمار بن یاسر کے بارے میں لکھا "تم عمار کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کا برتاؤ کرو اور ان کو عزت و احترام کے ساتھ مدینہ واپس بھیجدو"[۲]

چنانچہ جب مصری وفد حضرت عثمان سے کٹ حجتی کرنے کی غرض سے مدینہ آیا ہے تو اس وقت عمار بن یاسر مدینہ میں موجود تھے اور حضرت عثمان کو اب بھی ان پر اتنا اعتماد تھا کہ آپ نے سعد بن ابی وقاص کے ذریعہ ان کو پیغام بھیجا کہ وہ علی کے ساتھ مصری وفد سے ملیں لیکن عمار بن یاسر کی عثمان ذوالنورین سے ناراضگی اور بیزاری کا عالم یہ

---

۱ طبری ج ۴ ص ۳۴۱

۲ بحوالہ الفتنۃ الکبری: عثمان از ڈاکٹر طہ حسین ص ۱۲۸

تھا کہ انھوں نے سعد بن ابی وقاص سے کافی بحث و گفتگو کے بعد صاف کہہ دیا۔ واللہ لا اردھم عنہ ابداً: خدا کی قسم! میں ان لوگوں کو خلیفہ سے ہرگز واپس نہیں کروں گا"[۱] بہرحال مذکورۂ بالا روایات میں جو تذکرہ ہے وہ عمار بن یاسر کے غیر مصالحانہ اور خلیفہ کے خلاف مخالفانہ رویہ اور برتاؤ کا ہے اور اس کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ حضرت عثمان نے ان کے ساتھ کوئی تشدد کا یا ناگوار معاملہ اس سلسلے میں کیا ہو۔

عام طور پر یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت عثمان نے عمار بن یاسر (م ۳۷ھ) کو کوفہ کی گورنری سے معزول کیا تھا یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بالکل غلط ہے، بلکہ اصل یہ ہے کہ عمر فاروق نے ان کو ۲۱ھ میں کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا، لیکن اہل کوفہ کو ان سے شکایات پیدا ہوئیں اور انھوں نے ان کی برطرفی کا مطالبہ کیا تو چند مہینوں بعد ہی انھیں معزول کر دیا گیا۔ کسی شخص نے ان کے نصب و عزل کے متعلق ان سے سوال کیا تو بولے: مجھ کو جب گورنر بنایا گیا تھا تو مجھے اس کی خوشی نہیں ہوئی تھی، مگر ہاں اب مجھے سبک دوش کیا گیا ہے تو اس سے مجھ کو ناگواری ہوئی ہے۔ حضرت عمر نے عمار بن یاسر کو مخاطب کر کے فرمایا: "میں جانتا تھا کہ تم کسی کام کے نہیں ہو، لیکن اس کے باوجود تم کو گورنر اس لیے بنا دیا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین (القصص)[۲]	جو لوگ زمین میں کمزور ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان پر احسان کریں اور ان کو امام اور صاحب اقتدار بنائیں۔

---

۱ طبری ج ۴ ص ۳۵۹

۲ طبری ج ۴ ص ۱۶۳-۱۶۴۔ عمار بن یاسر اسلام قبول کرنے کے وقت چونکہ غلام تھے اور اسلام کی وجہ سے ان کا آقا ان پر سخت مظالم کرتا تھا اس بنا پر ان کا شمار مستضعفین میں ہوتا تھا حضرت عمر نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے

غور کیجئے حضرت عمر کے اس ارشاد کی روشنی میں عمار بن یاسر نے حضرت عثمان کی جو مخالفت کی اس کی کیا حقیقت اور اہمیت رہ جاتی ہے۔

روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ محض ایک شخصی اور ذاتی رنجش کے باعث عمار بن یاسر حضرت عثمان کو جو برا بھلا کہتے پھرتے تھے اکابر صحابہ ان کو اس پر ملامت کرتے تھے[1]

اکابر قریش کو مدینہ سے باہر جانے اور آباد ہونے کی اجازت

اب دو اور چیزوں پر گفتگو کرنا ضروری ہے جن کا تعلق براہ راست خلافت عثمانی کی پالیسی اور سیاست سے ہے اور جن کو مورخین نے خلافت کے اسباب مخالفت میں شمار کیا ہے (۱) اکابر قریش کو مدینے سے باہر جاکر آباد ہونے کی ضرورت اور (۲) دوسری مشتبہ لوگوں کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کرنا جس کو عربی میں تسییر کہتے ہیں۔ اب پہلی چیز کو لیجئے۔

جیسا کہ ہم نظم ونسق کے باب کے تحت لکھ چکے ہیں، اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر نے اکابر مہاجرین قریش کو مدینے سے باہر جانے کی ممانعت کر رکھی تھی اور اس پر بڑی سختی سے عامل تھے، لیکن حضرت عثمان نے یہ پابندی ختم کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکابر قریش مختلف شہروں میں آباد ہوگئے، وہاں ان کے پاس عالیشان محلات، جاگیریں، جائدادیں، خدم وحشم، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ایک طرف دولت وثروت کا یہ عالم اور دوسری جانب اکابر صحابہ ہونے کے باعث ان کا تقدس اور دینی عظمت واحترام! ان دونوں چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ حلقہائے ارادت و عقیدت قائم ہوگئے، عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کے باعث دینی ضعف واضمحلال

---

[1] البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر ج ۷، ص ۱۷۱

پیدا ہوا۔ جس کا خطرہ بجا طور پر حضرت عمر کو تھا اور مسلمانوں میں پارٹی بازی کا بھی آغاز ہو گیا، جس سے خلافت عثمانی کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

سخت حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ معترضین قدیم و جدید نے اس واقعہ کو بھی بڑے طمطراق سے بیان کیا ہے اور حضرت عثمان پر یہ الزام لگایا ہے کہ انھوں نے سیرت و طریق عمر سے انحراف کیا جس پر کاربند رہنے کا وعدہ انھوں نے خلیفہ بنتے وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے کیا تھا۔

ہم کہتے ہیں اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ حضرت عمر نے اکابر مہاجرین قریش کو مدینہ میں سختی کے ساتھ جو محصور کر رکھا تھا تو کیا اس کا کوئی قانونی اور شرعی جواز موجود تھا؟ اگر نہیں تھا تو کیا حضرت عمر کا یہ فعل حقوق شہریت میں دخل اندازی کے مرادف نہیں تھا؟ اگر تھا تو پھر وہ جمہوریت کہاں رہی جس کو خلافت فاروقی کا طرۂ امتیاز بیان کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر کا یہ فعل بعض خاص قسم کے حالات کے بپیش نظر محض ایک ہنگامی اور وقتی ہی ہو سکتا تھا اور وقتی ہی تھا بھی! اگر حضرت عمر چند اور برس خلیفہ رہتے تو انھیں خود اس قدغن اور روک ٹوک کو منسوخ کرنا پڑتا ورنہ طبری کی روایت کے مطابق قریش اس ممانعت سے سخت بیزار تو ہو ہی گئے تھے، اگر اس میں امتداد ہوتا تو اس کا انجام خلیفہ کے خلاف سازش اور بغاوت کی شکل میں ظاہر ہو سکتا تھا۔

اس بنا پر حضرت عثمان نے قریش کو جو آزادی دی شرعاً و قانوناً وہ قریش کا حق تھا، رہا وہ خطرہ جو حضرت عمر کو تھا! تو اول تو یہ خطرہ عام نہیں تھا، کیونکہ عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام، سعد بن ابی وقاص اور طلحۃ بن عبیداللہ ایسے اکابر صحابہ بجید دولت مند ہونے کے باوجود اخلاق و شمائل اور ورع و تقویٰ کے اعتبار سے اب بھی ایسے تھے جیسے کہ وہ مدینے سے باہر جا کر آباد ہونے سے قبل تھے، چنانچہ

ان کی دولت کا بڑا حصہ امورِ خیر و صلاح پر خرچ ہوتا تھا اور پھر جو خطرہ تھا بھی تو اس کا تدارک وعظ و تذکیر کے ذریعہ ہی ہو سکتا تھا اور حضرت عثمان کے خطبات اور عمال و عہدہ داران حکومت کے نام خطوط و فرامین سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عثمان نے اس میں ذرا کوتاہی نہیں کی، وہ برابر اس کا اہتمام کرتے تھے۔

بہر حال یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس خطرہ کے انسداد کے لیے حضرت عثمان نے صرف وعظ و تذکیر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ڈاکٹر طہٰ حسین، مصر کے بقول اس سلسلے میں ایک نہایت اہم عملی اقدام بھی کیا جس کو تاریخ نے نظر انداز کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب سعید بن العاص گورنر کوفہ نے حضرت عثمان کو لکھا کہ کوفہ کے حالات روز بروز تشویش انگیز ہوتے جا رہے ہیں. کیونکہ آبادی جو اچھے برے، شریف اور رذیل ہر قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے، بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سی سماجی اور اقتصادی (Socio-Economic) مشکلات پیدا ہو گئی ہیں، تو حضرت عثمان نے سعید بن عاص کو لکھا کہ "اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے ہاتھوں ان شہروں کو فتح کرایا ہے، ان کو سب پر مقدم رکھو، اور جو لوگ ان حضرات کی وجہ سے وہاں آباد ہوئے ہیں ان کو نمبر ۲ پر رکھو، مگر ہاں! اگر یہ نمبر ۲ کے لوگ خود ہی وہاں کی اقامت چھوڑ دیں تو یہ امر آخر ہے، ہر شخص کا جو مرتبہ و مقام ہے اس کو پہچانو اور اس کی حفاظت کرو، اور جس کا جو حق ہے وہ عدل و انصاف سے اس کو پہونچاؤ"[2]

دوسری جانب حضرت عثمان نے اہل مدینہ کو جمع کر کے ایک تقریر کی جس میں سعید بن العاص کے خط کی روشنی میں کوفہ کا ذکر کر کے فرمایا۔ "کوفہ اور دوسرے شہروں میں

---

[1] الفتنۃ الکبریٰ: عثمان باشا ص ۱۸۶

[2] طبری ج ۴ ص ۲۷۹

آبادی کے غیر متوازن طریقہ پر بہت زیادہ ہو جانے کے باعث جو معاملات و مسائل پیدا ہو گئے ہیں یہ فتنہ کا آغاز ہیں. میں نے اس کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ جن لوگوں کی جائدادیں کوفہ وغیرہ میں ہیں وہ اپنی جائدادوں کا تبادلہ مدینے کی جائدادوں سے کریں اور یہاں منتقل ہو جائیں، وہ یہاں جب منتقل ہوں گے تو ان کے ساتھ ان کے اعوان و انصار، اور ان کے متعلقین بھی یہاں آئیں گے اور اس طرح شہروں کی آبادی پر دباؤ کم ہو جائے گا" اہل مدینہ حضرت عثمان کی یہ تجویز سن کر بے حد مسرور مطمئن ہوئے اور آپ کی فراست و دور اندیشی کی بڑی داد دی۔[1]

یہ واقعہ ۳۰ھ کا ہے، یعنی اس وقت کا جب کہ فتنہ و فساد کی چنگاریاں سلگنی شروع ہو گئی تھیں، حضرت عثمان کی اس اہم تجویز پر عمل شروع ہوا. بہت سے لوگ ادہر سے اُدہر ہو گئے. جاگیروں، جائدادوں اور مکانات کا تبادلہ ہوا. لیکن فتوحات کا سلسلہ بڑے پیمانہ پر جاری تھا. اور ان کی وجہ سے دولت و ثروت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا. آبادی میں بحران کی کیفیت قائم تھی، اس بنا پر حضرت عثمان کے منصوبہ کے ماتحت معاملات و مشکلات کی اگر ایک گرہ کھلتی تھی تو چند اور نئی گرہیں لگ جاتی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عثمان کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا اس منصوبہ کو کامیاب بنانے کی ایک ہی صورت ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ فتوحات کا سلسلہ یک قلم موقوف کر دیا جاتا. لیکن اس وقت ایسا کرنا نہ ممکن تھا اور نہ قرین مصلحت!! ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اسی قسم کے حالات کے بارہ میں بالکل صحیح لکھا ہے " زندگی کے احوال و ظروف کا اس وقت رخ ہی ایسا تھا اور وہ اس درجہ پیچیدہ ہو گئے تھے کہ حضرت عثمان کیا، اگر حضرت عمر بھی اس وقت موجود ہوتے تو وہ بھی ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تھے"[2]

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۸۰

[2] الفتنۃ الکبریٰ، عثمان باب ۲۵ ص ۱۹۷

جلاوطن کرنے کی سزا

اب رہا جلاوطنی کی سزا کا مسئلہ! تو اول تو اس میں کوئی عجوبہ پن نہیں ہے، اسی سزا کا رواج عہد نبوی اور عہد شیخین دونوں میں تھا، پھر کوفہ اور بصرہ کے لوگوں کا حال آپ پڑھ ہی چکے ہیں حضرت عمر بھی ان سے تنگ آ گئے تھے اور آپ کو جلد جلد گورنر بدلنے پڑتے تھے، حضرت عثمان کے عہد میں حالات اور زیادہ ناگفتہ بہ ہو گئے۔ کوفہ میں عرب کے تین قبیلے بہت نمایاں تھے، ایک قریش، دوسرے بنو اسد، اور تیسرے یمانی، اور تینوں گویا ایک دوسرے کے رقیب تھے، گورنر چونکہ جوانان قریش میں سے تھا اس لیے یمانی خاص طور سے گورنر سے پرخاش رکھتے اور آئے دن بہانہ بہانہ سے پریشان کرتے رہتے تھے، اس بنا پر سعید بن العاص نے ان حالات کی اطلاع حضرت عثمان کو دی تو آپ نے ان کو لکھا کہ ان لوگوں کو شام بھیج دو، شام بھجوانے کا مقصد یہ تھا کہ وہاں امیر معاویہ موجود ہیں، وہ نہایت تجربہ کار پرانے، مردم شناس اور معاملہ فہم آدمی ہیں، وہ ان لوگوں کی خاطر خواہ اصلاح کر سکتے ہیں، ان جلاوطن کئے جانے والوں میں اشتر نخعی بھی تھا جو کوفہ کی باغی پارٹی کا سردار تھا، حضرت معاویہ نے نرم گرم ان کو ہر طرح سمجھایا مگر ان کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی، آخر امیر معاویہ نے ان لوگوں کو کوفہ واپس کر دیا، یہاں انھوں نے پھر اپنی مخالفانہ سرگرمیاں شروع کر دیں تو اب ان کو جزیرہ کی طرف جلاوطن کر دیا گیا، یہ حقیقت ہے حضرت عثمان پر جلاوطن کرنے کے الزام کی، اب سوچنا چاہیئے کہ اس میں قابل اعتراض کیا بات ہے، کیا حکومت کے مخالفین و معاندین کو اس سے بھی زیادہ نرم کوئی اور سزا دی جا سکتی ہے۔

اعتراضات کا جائزہ ختم ہوا۔ اس سلسلے میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوا ہو گا کہ یہ اعتراضات برائے بیت ہی تھے، یعنی باغیوں کو اپنے مقاصد مشومہ کی خاطر حضرت عثمان کو بدنام کرنا تھا۔ اس لیے انھوں نے صحیح، غلط ہر اس چیز کا سہارا لیا جس سے

ان کی مقصد برآری ہو سکے، جس طرح ابو لولو اور اس کی جماعت کا منصوبہ حضرت عمر کو قتل کرنے کا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ کی اجرت کی شکایت کو بہانہ بنایا اسی طرح حضرت عثمان کو خلافت سے الگ کرنا۔ اور اگر الگ نہ ہوں تو قتل کر دینا ان کا اصل مقصد تھا۔ یہ اعتراضات صرف ایک بہانہ تھے۔

اسلام کے لیئے ایک نازک ترین لمحہ اور باغیوں کی شرارت

باغیوں کی تنگدلی خود غرضی اور ادل درجہ کی مطلب پرستی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ۳۱ھ میں جب قیصر روم نے پانچسو جنگی جہازوں کے عظیم بیڑہ کے ساتھ سواحل روم وشام پر جن پر خلافت عثمانی کا پرچم لہرا رہا تھا حملہ کیا ہے، جس کا ذکر فتوحات کے باب میں گزر چکا ہے، تو اس وقت مسلمانوں پر سخت خوف وہراس اور اضطراب کا عالم طاری تھا۔ لیکن باغی اس وقت بھی اپنی اسلام دشمن حرکات سے باز نہ آئے۔ چنانچہ محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ جو باغیوں کے سردار تھے، ٹھیک اس وقت جب کہ افواج اسلام امیر البحر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی قیادت میں رومی بیڑہ کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑھ رہی تھیں، اسلامی فوج میں عدول حکمی اور سرکشی کے جذبات پیدا کرنے کے لیے کبھی امیر البحر کی برائیاں بیان کرتے اور کبھی مجاہدین سے برملا کہتے کہ تم رومیوں سے جہاد کرنے جاتے ہو، حالاں کہ اسلام کو خود مدینہ میں مجاہدین کی ضرورت ہے" وہ تعجب سے پوچھتے یہ بھلا کیونکر؟ محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ، حضرت عثمان کا نام لے کر جواب دیتے، "اس ظالم کو معزول کرنا اس وقت اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے، اس نے سنت شیخین کو پس پشت ڈال دیا ہے، اکابر صحابہ کو معزول کر کے اپنے اعزا واقربا کو بڑے بڑے مناصب اور عہدے دیئے ہیں" ان لوگوں نے زبانی پروپیگنڈہ پر بس نہیں کی، بلکہ جب اسلامی بیڑہ دشمن کے مقابلہ روانہ ہوتا تو محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ دونوں ایک کشتی میں

اسلامی بیڑہ کے پیچھے پیچھے جاتے اور جہاں اسلامی بیڑہ کے جہاز لنگر انداز ہوتے یہ وہاں پہونچ کر فوج میں بغاوت پیدا کرنے کی کوشش کرتے "۔[1] غور کرنا چاہیئے کہ حضرت عثمان کی بعض پالیسیوں سے کیسا ہی اختلاف سہی! کیا کوئی مسلمان اس نازک موقع پر اس قسم کی حرکات کرنے کا تصور بھی کر سکتا تھا؟ چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیر فرماتے ہیں، حضرت عثمان پر اعتراض کرنے والوں کی ایک جماعت مجھ سے ملی اور ان پر نکتہ چینی کرنے لگی۔ میں نے ان سے حضرات شیخین کی سیرت پر گفتگو کی اور ان کے ایسے اعمال کا ذکر کیا جن پر کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ لیکن انھیں اعمال کے لیے حضرت عثمان کو ملزم قرار دیا جاتا ہے، یہ معترضین میری دلیلوں سے ایسے لاجواب ہوئے جیسے انگوٹھا چوسنے والے بچے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: "حضرت عثمان کے ایسے کاموں پر اعتراضات کیے گئے کہ اگر عمر فاروق انھیں کرتے تو کوئی لب کشائی نہ کرتا" اور خود حضرت عثمان نے بھی متعدد مواقع پر مخالفین کو خطاب کر کے یہی بات کہی ہے، ایک مرتبہ آپ نے اعتراضات کے جوابات میں نہایت پر زور اور مفصل تقریر کی اور اس میں فرمایا۔

سنو! خدا کی قسم، تم مجھ پر ایسی باتوں کی وجہ سے عیب جوئی کرتے ہو جن کو تم نے حضرت عمر سے بخوشی قبول کر لیا تھا، مگر ہاں بات یہ ہے کہ انھوں نے تم کو پیروں سے روندھا۔ ہاتھ سے مارا اور زبان سے تمہاری خبر لی، اس لیے تم چاروناچار ان کے فرماں بردار

---

[1] طبری ج ۳ ص ۲۹۱ و ۲۹۲۔ حضرت عثمان نرم خو اور مسامحت کے عادی تھے تو دوست دشمن ہر ایک کے ساتھ تھے چنانچہ اسی واقعہ میں مذکور ہے کہ جب عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو ان دونوں کی باغیانہ سرگرمیوں اور حرکتوں کا علم ہوا تو سخت غصہ ہوا اور کہا: اگر مجھ کو امیر المومنین کا ڈر نہ ہوتا تو تم کو اس مفسدہ پردازی کا خوب مزہ چکھا دیتا۔ اس پر بھی مخالفین کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے اپنے عمال اور گورنروں کو چھوٹ دے رکھی تھی کہ سیاہ و سفید جو چاہیں کریں کسی سے باز پرس ہی نہیں ہوتی تھی (باقی صفحہ پر)

بنتے رہے، اور میں نے تمہارے ساتھ نرمی برتی، مروت سے کام لیا، اپنا ہاتھ اور اپنی زبان دونوں کو تم سے روکے رکھا تو اب تم کو مجھ پر یہ جرأت ہو گئی

ایک اور موقع پر جب حضرت عثمان نے ۲۶ھ میں مسجد حرام میں توسیع کا ارادہ کیا تو اس وقت بھی آپ نے فرمایا:

اتدرون ما جرأكم علي! جرأكم عليّ الحلمي، قد فعل هذا بكم عمر، فلم تصيحوا به ؎

کیا تم جانتے ہو کہ کس چیز نے تم کو مجھ پر دلیر کیا ہے؟ یہ صرف میری بردباری ہے جس کی وجہ سے تم یہ جرأت کرتے ہو ورنہ یہی فعل تمہارے ساتھ عمرؓ نے کیا تھا تو تم نے کوئی شور و غل نہیں مچایا۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ باغیوں میں سبائیوں وغیرہم کے علاوہ خوارج کا بھی ایک بڑا طبقہ تھا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جب دو روز تک فیصلہ نہ ہو سکا کہ خلیفہ کون ہو؟ تو ان باغیوں نے اہل مدینہ سے کہا کہ:

"لوگو! دیکھو! ہم نے تم کو دو دن کی مہلت دی تھی، اب اگر تم نے اب بھی خلیفہ کا انتخاب نہیں کیا تو ہم کل علی، طلحہ، زبیر ان تینوں کو اور ان کے ساتھ اور بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیں گے ؎ غور کیجئے! یہ لب و لہجہ اور یہ تیور کیا خارجیوں کے علاوہ کسی اور کا بھی ہو سکتا ہے؟

بقیہ حاشیہ) ؎ انساب الاشراف بلاذری ج ۵ ص ۹

؎ استیعاب ابن عبدالبر ج ۱ ص ۴۷۶

؎ طبری ج ۴ ص ۳۳۸

؎ ایضاً ص ۲۵۱

؎ طبری ج ۴ ص ۴۳۴

پس خلافت عثمانی کے آخری پانچ برسوں میں جو فتنہ پیدا ہوا اس کے اصلی اسباب وہی تھے جن کو ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) فتوحات کے رک جانے کے باعث مسلمانوں کا ایک غیر متحرک (Settled) سوسائٹی بن جانا، ساز و سامان عیش و عشرت کی فراوانی، حسین و جمیل غلاموں اور جواری کی گھر گھر میں کثرت

(۳) چند در چند مذاہب و ادیان کے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کا خلا ملا اور اس کا اثر اسلامی عقائد و افکار پر

(۴) ایک طرف عرب و عجم میں رقابت اور کش مکش جس نے شعوبیہ تحریک کو جنم دیا اور دوسری جانب خود عربوں میں قبائلی عصبیت کا احیاء

(۵) ہر ترقی پذیر معاشرہ کی طرح اس زمانے میں بھی مسلمانوں کے دو طبقے تھے ایک قدامت پسندوں (Conservatives) کا جو پرانے ڈگر سے ایک انچ ہٹنے کے لیے تیار نہ تھے، چنانچہ یہی لوگ تھے جنھوں نے حضرت عثمان نے مسجد حرام اور مسجد نبوی میں توسیع اور اس کی تزئین و تجمیل کا ارادہ کیا تو اس کی سخت مخالفت کی اور دوسرا روشن خیال (Liberals) لوگوں کا طبقہ جو جدید حالات و ظروف اور ان کے تقاضوں کے مطابق اصلاحات کا قائل تھا اور ان دونوں میں کش مکش جاری تھی۔

(۶) حضرت عثمان فطرتاً بڑے نرم خو، حلیم و بردبار اور صلح جو تھے، اس بنا پر کوفہ سے سعید بن العاص اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح مصر سے مفسدوں کی فتنہ پروری کی اطلاع حضرت عثمان کو برابر بھیجتے رہے، لیکن حضرت عثمان ان کو یہ ہدایت تو برابر بھیجتے رہے کہ وہ مفسدوں کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کر دیں، لیکن ان کو قرار واقعی سزا دینے کی آپ نے کبھی اجازت نہیں دی اور مختلف ذرائع سے ان کی تفہیم کرتے رہے۔

(۷) اکثر و بیشتر اکابر صحابہ جو اس وقت موجود تھے وہ اول تو ایک جگہ یعنی مدینہ میں رہے

نہیں تھے، بلکہ مختلف شہروں میں جا بسے تھے، پھر سن رسیدہ بھی ہو گئے تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حالات سے بددل ہو کر انھوں نے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔

باغیوں کا حملہ اور حضرت عثمان کی شہادت

باغیوں کا گروہ مختلف جماعتوں پر مشتمل تھا۔ مصر کے لوگ حضرت علی کے عقیدتمند تھے، اہل بصرہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ کو اور کوفہ والے حضرت زبیر بن عوام کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے، ایک جماعت سرے سے عرب حکومت کے ہی خلاف تھی۔ پھر عربوں میں بھی پھوٹ تھی، لیکن اس اختلاف کے باوجود یہ سب جماعتیں اس پر متفق تھیں کہ خلیفۂ ثالث کو معزول کیا جائے۔ اس متفقہ مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے باقاعدہ اپنی ایک تنظیم قائم کی جس کے ماتحت وہ پروپیگنڈہ کے ذریعہ حضرت عثمان، ان کے گورنروں اور ان کے قریبی رشتہ داروں کے خلاف پبلک میں بددلی اور بے زاری پیدا کرنے اور طرح طرح کی سبک حرکات سے ضبط و نظم میں رخنہ اندازی کرتے رہتے تھے چنانچہ عبداللہ بن سبا جو اس سازش کا معمار خصوصی (chief architect)، تھا اس نے اپنی جماعت کے کارکنوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ جہاں بھی ہوں ان تین چیزوں پر سختی سے عمل کریں

(۱) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ لوگوں کو اپنا معتقد اور گرویدہ بنانا

(۲) عہدہ داران خلافت عثمان کو ہر ممکن طریقہ سے بدنام اور رسوا کرنا

(۳) خلیفۂ ثالث کی کنبہ پروری اور اقربا نوازی کی داستان کو عام

کرنا۔[1]

ان ہدایات پر سختی سے عمل کیا گیا بصرہ، کوفہ اور مصر فتنہ و فساد کے مرکز تھے۔ اس پروپیگنڈہ نے تینوں جگہ آگ لگادی، قاعدہ ہے کہ کوئی تحریک خواہ کیسی ہی بدتر موم مقاصد پر مبنی ہو، اور اس کو دل کش اور عوام پسند عنوانات سے مزین کر کے منظم طریقہ پر اور مسلسل پوری قوت سے پیش کیا جائے تو طبعی طور پر اس کے دو نتیجے ہوتے ہیں، ایک یہ کہ بعض اوقات وہ لوگ بھی اس تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں جن کے ذاتی رجحانات و عواطف تحریک کے اصل مقاصد کے خلاف ہوتے ہیں، اور دوسرا یہ کہ جن حضرات کو اس تحریک سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی وہ وقت کو ناساز گار پاکر گوشہ گیر ہو جاتے ہیں اسی بنا پر تحریک کو میدان صاف ملتا ہے اور کم از کم پہلے مرحلہ میں وہ کامیاب ہو جاتی ہے ہمارے زمانے میں کمیونزم اور تقسیم ہند کی تحریکیں اس کی مثالیں ہیں۔

یہی صورت حال یہاں پیش آئی، چنانچہ جب حضرت عثمان کا محاصرہ ہوا تو عمرو بن العاص مدینہ چھوڑ کر اپنے دونوں بیٹوں عبداللہ اور محمد کے ساتھ فلسطین چلے گئے اور جاتے وقت اہل مدینہ سے بولے، لوگو! اگر عثمان قتل کر دئے گئے تو تم میں سے جو لوگ بھی عثمان کی مدد نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ ان کو ذلیل کرے گا۔ اس لیے (میری طرح) جو لوگ مدد نہیں کر سکتے، انھیں مدینے سے باہر چلا جانا چاہیئے۔[2] اس کے علاوہ حضرت زبیر بھی ترک مدینہ کر گئے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

تحقیقاتی وفد شہروں میں جب شورش زیادہ بڑھی اور اس کی خبریں مدینہ پہونچنے لگیں تو بعض اہل مدینہ کے مشورہ پر عثمان ذوالنورین نے تحقیق و

---

[1] الکامل لابن اثیر ج ۳ ص ۴۵ و طبری ج ۴ ص ۳۴۱

[2] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۴۷

تفتیش حال کے لیے محمد بن مسلمۃ کو کوفہ. اسامہ بن زید کو بصرہ، عمار بن یاسر کو مصر، اور عبداللہ بن عمر کو شام روانہ کیا اور ساتھ ہی تمام شہروں میں اپنا ایک گشتی مراسلہ بھیجا جس میں تحریر تھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ بعض عمال ان کے ساتھ سب و شتم کا معاملہ کرتے ہیں، اگر ایسا ہے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ حج کے موقع پر میری تاکید اور ہدایت کے مطابق سب عمال مکہ میں حسب معمول جمع ہونگے ہی. جن لوگوں کو اس قسم کی شکایات ہوں وہ حج کے موقع پر مجھ سے آکر ملیں اور میں خود یا میرے عمال، جو کوئی بھی اس کا ذمہ دار ہو اس سے اپنا حق وصول کریں، یا اگر چاہیں تو معاف کردیں، کیوں کہ اللہ معاف کردینے والوں کو جزا دیتا ہے" راوی کا بیان ہے کہ جب امیرالمومنین حضرت عثمان کا یہ گشتی مراسلہ شہروں میں پڑھ کر سنایا گیا تو اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں پر گریہ طاری ہوگیا اور امیرالمومنین کے لیے دعائیں کرنے لگے" ؎

عمال کو حاضر ہونے کا حکم

حضرت عثمان نے ایک طرف ۳۵ھ میں شہروں کے عوام کے نام یہ گشتی مراسلہ بھیجا تو دوسری طرف عمال کو لکھا کہ ایوان خلافت میں حاضر ہوں، چنانچہ عبداللہ بن عامر بن کریز، امیر معاویہ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، یہ تینوں آئے اور ان کے علاوہ عمرو بن العاص اور سعید بن العاص کو مشورہ میں شریک کیا گیا" اب امیرالمومنین نے فرمایا: بڑے افسوس کا مقام ہے، یہ میں کس قسم کی شکائتیں سن رہا ہوں اور یہ کیسی کیسی باتیں مشہور ہو رہی ہیں، بخدا مجھے اندیشہ ہے کہ جو باتیں تم لوگوں کی نسبت کہی جا رہی ہیں وہ کہیں سچ ہی نہ ہوں اگر ایسا ہوا تو ان سب باتوں کو مجھ سے منسوب کیا جائے گا، ان حضرات نے جواب

؎ ایضاً ص ۱۵۵

میں کہا: آپ نے تحقیق حال کے لیے شہروں میں وفود بھیجے تو تھے، انھوں نے کیا واپس آکر یہ رپورٹ نہیں دی کہ ہر جگہ خیریت ہے؟ رہے یہ افواہ اڑانے والے لوگ! تو یہ سچ نہیں بولتے، آپ کے لیے مناسب نہیں ہے کہ ایسی بے بنیاد باتوں پر کان دیں اور ان کو کچھ اہمیت دیں" [1] ملک میں جو انتشار تھا حضرت عثمان کو اس کا احساس تھا اس لیے ان حضرات کی باتوں سے وہ کیوں کر مطمئن ہو سکتے تھے، فرمایا: تو اب یہ بتاؤ کہ کرنا کیا چاہیے؟ - سعید بن العاص نے کہا: چند آدمی ہیں جو پوشیدہ طور پر غلط باتیں مشہور کرکے بے خبر اور سیدھے سادے عوام کو ورغلا رہے اور بہکا رہے ہیں، ان کا علاج یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو بلائیے اور جو ان کے سرغنہ ہوں ان کا سر قلم کر دیجئے، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے کہا: آپ نے ان لوگوں پر داد و دہش کی بارش کر رکھی ہے، اب ان سے اپنے اس حق کا مطالبہ بھی تو کیجئے جو ان کے ذمہ ہے امیر معاویہ بولے: آپ نے مجھ کو جن لوگوں پر گورنر بنایا ہے ان سے آپ خیر کے سوا کسی اور چیز کی توقع نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد عمرو بن العاص اور حضرت عثمان میں جو گفتگو ہوئی ہے وہ نہایت اہم ہے اس سے حضرت عثمان کی سوچی سمجھی پالیسی پر روشنی پڑتی ہے اور بہت سے شبہات کا خود بخود ازالہ ہو جاتا ہے سنیئے، اب عثمان ذوالنورین حضرت عمرو بن العاص کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا عمرو! تمہاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے جواب دیا: میری رائے یہ ہے کہ آپ ان فتنہ پردازوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر رہے ہیں، اور آپ نے ان کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے، عمر جو کچھ کرتے تھے آپ نے ان لوگوں کے معاملہ میں اس پر زیادتی کی ہے، اس بنا پر میری رائے ہے کہ آپ ابوبکر و عمر یعنی شیخین کے طریقہ پر عمل پیرا ہوں، اور سختی کی جگہ سختی اور نرمی کی جگہ نرمی کو اپنا

---

[1] طبری ج ۳ ص ۳۴۲

معمول بنالیں۔

اب حضرت عثمان کھڑے ہوئے اور حمد وثنا کے بعد فرمایا: آپ حضرات نے جو کچھ مشورے دیے ہیں وہ میں نے سنے، اصل یہ ہے کہ ہر معاملہ کا ایک دروازہ ہوتا ہے جس سے وہ اندر داخل ہوتا ہے، یہ فتنہ امت کو جس کے پیش آنے کا اندیشہ ہے وہ پیش آنے والا ہے، اس کا دروازہ نرمی ملاطفت اور پیروی اور موافقت سے ہی بند کیا جاسکتا ہے، ہاں! البتہ حدود اس سے مستثنیٰ ہیں یہ دروازہ تو خدا کی قسم ضرور کھلے گا. مگر میرے اوپر کوئی شخص الزام نہیں لگا سکتا، اللہ علیم وخبیر ہے کہ میں نے لوگوں کے ساتھ اور اپنے ساتھ بھی بھلائی کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہے، فتنہ کی چکی تو گھومے گی ہی، البتہ عثمان بڑا خوش نصیب ہوگا اگر وہ اس حالت میں مرجائے کہ اس نے اس چکی کو حرکت نہیں دی، پس آپ حضرات لوگوں کو فتنہ پردازی سے روکیں، اور ان کے جو حقوق ہیں ان کے ادا کرنے میں تساہل سے کام نہ لیں، اور ان کے لیے خدا سے مغفرت کی دعا مانگیں [1]

کوفہ میں فساد

امیرالمومنین نے شہروں میں جو گشتی مراسلہ بھیجا تھا اور ادھر عمال سے بات چیت کی اور ان کو ہدایات دیں ان سب کا ملک میں

---

[1] ایضاً ص ۳۴۲، ۳۴۳ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس موقع پر ابن اثیر (ج ۳ ص ۱۵۵) نے غلطی سے یہ لکھ دیا ہے کہ "حضرت عثمان کی طلب پر عمال ان سے حج میں ملے (موا الیہ فی الموسم) اور اسی بنا پر ہمارے بعض مورخین نے بھی یہی لکھا ہے، (دیکھئے تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۲۶۷۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے، جیسا کہ ابن اثیر نے خود لکھا ہے، یہ واقعہ ۳۵ھ کا ہے اور اس سال حضرت عثمان حج کے لیے نہیں جاسکے تھے اور عبداللہ بن عباس کو اپنی قائم مقامی میں امیر الحج (باقی صفحہ ۔ پر)

بڑا اچھا اثر ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر طہٰ حسین کے بقول لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ سال رواں (۳۵ھ) امن و امان اور سکون سے گذرے گا۔ کہ اچانک کوفہ میں سخت فساد ہوگیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ سعید بن العاص جو یہاں کے گورنر تھے، نہایت لائق و فاضل اور متدین و مجاہد نوجوان تھے، لیکن چونکہ قرشی تھے اس لیے ابتدًا تو لوگ ان سے خوش اور ان کے ثناخواں تھے، لیکن ایک مرتبہ ایک مجلس میں ان کی زبان سے یہ نکل گیا کہ "کوفہ قریش کا چمن ہے" اس مجلس میں دوسرے قبیلوں اور خصوصًا یمنی قبیلہ کے لوگ بھی تھے، موخر الذکر قبیلہ جس کا سردار اشتر نخعی تھا۲، قریش سے سخت بغض و عناد رکھتا تھا، اسی لیے سعید بن العاص پر برس پڑا اور بولا: قریش میں ایسی کونسی خصوصیت ہے کہ کوفہ ان کا ہی چمن ہو، وہ تو سب مسلمانوں کا ہے" پولیس کا افسر جو وہاں موجود تھا اس نے غضبناک ہوکر ان لوگوں کو تنبیہ کی کہ وہ گورنر سے اس بد تہذیبی سے بات کر رہے ہیں" ان لوگوں نے پولیس افسر کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہوگیا، اور اس پر ہی بس نہیں کیا۔ بلکہ کھلم کھلا قریش کی، حضرت عثمانؓ کی اور سعید بن العاص کی برائیاں بیان کرنے لگے۔

مزید برآں، ان لوگوں نے فیصلہ کرلیا کہ اب سعید بن العاص کو کوفہ کا گورنر نہ رہنے دیں گے، چنانچہ حضرت عثمانؓ کی طلب پر جب سعید بن العاص مدینہ گئے (جس کا ذکر ابھی آیا ہے) اور وہاں سے واپس ہوئے تو جرعہ نامی ایک مقام پر ان لوگوں نے سعید بن العاص کی مزاحمت کی اور انھیں کوفہ کے لیے آگے نہیں بڑھنے دیا اور ساتھ ہی مطالبہ کیا کہ

(بقیہ حاشیہ) بنا کر بھیجا تھا اس بنا پر عمال کے ساتھ مجلس مشاورت مدینہ میں ہوئی تھی جیسا کہ طبری نے لکھا ہے نہ کہ حج میں

۱ الفتنہ الکبریٰ: عثمان ص ۲۰۸

۲ اس کا اصل نام مالک بن حارث تھا، ایک چشم ہونے کے باعث اشتر اور نخعہ یمن میں ایک قبیلہ کا نام ہے اس کی طرف منسوب ہونے کے باعث نخعی کہلاتا ہے کوفہ کی باغی پارٹی کا سردار یہی تھا۔

ابوموسیٰ اشعری کو گورنر مقرر کیا جائے۔ اس انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ ابوموسیٰ قریشی نہیں تھے اور ان کی رشتہ داریاں یمن میں تھیں، حضرت عثمان نے دفع شر کے خیال سے ان لوگوں کی تجویز مان لی اور ابوموسیٰ اشعری گورنر ہو گئے۔[1]

حضرت ابوموسیٰ اشعری نے ان لوگوں میں امیر المومنین کے خلاف بغاوت کے جذبات دیکھے تو ان کو فہمائش کی، صبر و سکون اور جماعت سے الگ نہ ہونے کی پرزور تلقین کی اور یہاں تک فرمایا کہ میں اگر نماز میں تمہاری امامت کروں گا تو یاد رکھو، حضرت عثمان کے مطیع اور فرماں بردار کی حیثیت سے کروں گا۔ لیکن ان لوگوں کا اصل مقصد تو فتنہ و فساد کا پیدا کرنا اور خروج علی الامام کے لیے راہ ہموار کرنا تھا، اسی بنا پر حضرت عثمان کی طرف سے ان کی رضاجوئی کی کوشش اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کی تنبیہ و تلقین کا ان پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ بلکہ اس کا ایک الٹا اثر یہ ہوا کہ اب ان کے حوصلے اور بڑھ گئے اور ساتھ ہی ان کے دیکھا دیکھی بصرہ اور مصر کے لوگوں کو بھی خلافت کے خلاف عملی اقدام کی جرأت و ہمت ہوئی۔

باغیوں کا ایک وفد

ان لوگوں نے اپنا ایک جلسہ کر کے طے کیا کہ عامر بن عبداللہ التیمی ثم العنبری کو اپنا نمائندہ بنا کر دربار خلافت میں بھیجا جائے، چنانچہ یہ شخص آیا اور اس نے لوگوں کی طرف سے حضرت عثمان سے عزل خلافت کا مطالبہ کیا، اور سخت کلامی کی۔

امیر معاویہ کا ذاتی مشورہ

ان حالات میں امیر معاویہ جو حضرت عثمان کی طلب پر مدینہ آئے ہوئے تھے جب واپس ہونے کے لیے وداعی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو حضرت عثمان سے درخواست کی کہ آپ میرے

---

[1] طبری ج ۴ ص ۳۳۲

ساتھ شام چلیے، وہاں کے حالات ٹھیک ہیں، لیکن عثمان ذوالنورین نے ان کی درخواست یہ کہہ کر مسترد کردی کہ چاہے میری گردن اڑ جائے، میں بہر حال کسی قیمت پر بھی رسول اللہ علیہ وسلم کا شرف قرب و ہمسائیگی نہیں چھوڑ سکتا ہوں۔ اب امیر معاویہ نے کہا: اگر یہ نہیں تو مجھے اجازت دیجیے کہ میں شام کا ایک لشکر بھیج دوں، وہ مدینہ کے عقب میں فروکش رہے گا تاکہ اگر کوئی حادثہ نازل ہو تو وہ اہل مدینہ کی اور آپ کی مدد کرسکے۔ لیکن حضرت عثمان نے یہ تجویز بھی رد کردی اور فرمایا: کیا میں فوج کے قیام کی وجہ سے اہل مدینہ کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسی اور دار الہجرت والنصرت کے رہنے والے ہیں ضیق اور پریشانی میں مبتلا کردوں؟ نہیں! مجھ سے ہرگز ایسا نہیں ہوگا؛ امیر معاویہ بولے: تو پھر اے امیر المومنین! آپ کے ساتھ غدر اور خیانت کا معاملہ کیا جائے گا، امیر المومنین نے جواب دیا: حسبی اللہ ونعم الوکیل، اس گفتگو کے بعد امیر معاویہ نے اجازت لی اور روانہ ہوگئے۔

حملہ کی تیاری جھوٹا پروپیگنڈہ، خفیہ مراسلت اور اکاذیب و اباطیل کی اندر ہی اندر نشر و اشاعت کے باعث سازش کی بارود کی سرنگ متاثرہ شہروں میں بچھ چکی تھی۔ اب صرف کسی وقت معین پر اسے دیا سلائی دکھانے کی ضرورت تھی، اس کے لیے ایام حج سے بہتر اور کونسا وقت ہوسکتا تھا کیونکہ اول تو یہ لوگ حج کے بہانہ سے گروہ در گروہ نکلتے تو کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا، اور پھر حج کے دنوں میں مدینہ کی آبادی کا ایک بڑا حصہ مکہ مکرمہ چلا جاتا ہے، اس بنا پر ان لوگوں کو مدینہ میں بڑے پیمانہ پر مزاحمت کا خطرہ نہیں ہوسکتا تھا۔

باغیوں کی قافلہ در قافلہ روانگی چنانچہ ایک خفیہ قرارداد کے مطابق شوال کے مہینہ میں مصر، کوفہ اور بصرہ تینوں شہروں کی باغی جماعتیں اس طرح مدینہ کے لیے روانہ ہوئیں کہ مصر کے لوگوں کی تعداد

چھ سو اور ایک ہزار کے درمیان تھی، یہ پوری تعداد چار ٹولیوں پر تقسیم تھی، یہ ٹولیاں الگ الگ عبدالرحمٰن بن عدیس البلوی، کنانہ بن بشر التجیبی، عروۃ بن شیم اللیثی، ابو عمرو بن بدیل بن ورقاء الخزاعی، سواد بن رومان الزبحی زرع بن یشکر الیافعی سودان بن حمران السکونی اور قتیرہ بن فلاں السکونی کے زیر اہتمام و انتظام تھیں اور ان سب کا عمومی قائد اور سردار الغافقی بن حرب العکی تھا۔ یہ جماعت اس خاموشی سے مصر سے روانہ ہوئی کہ کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ پردہ یہ تھا کہ حجاج کا قافلہ جا رہا ہے، ابن السوداء یعنی عبداللہ بن سبا بھی ہمراہ تھا۔

کوفہ کے لوگ بھی تعداد میں اہل مصر کے لگ بھگ تھے اور انھیں کی طرح چار ٹولیوں پر تقسیم تھے، یہ ٹولیاں جن لوگوں کے اہتمام و انتظام میں تھیں ان کے نام یہ ہیں، زید بن صوحان العبدی الاشتر النخعی، زیاد بن النضر الحارثی اور عبداللہ بن الاصم جو عامر بن صعصعہ کی اولاد میں سے تھا۔ عمرو بن الاصم ان سب کا جنرل کمانڈر تھا۔ [1]

بصرہ کے باغی گروہ کی تعداد بھی کم و بیش اتنی ہی تھی اور یہ بھی چار ٹولیوں پر تقسیم تھا، ٹولیوں کی قیادت ان لوگوں کے سپرد تھی، حکیم بن حبلہ العبدی، ذریح بن عباد العبدی بشر بن شریح، الحطم بن ضبیعۃ القیسی، ابن المحرش بن عبد بن عمرو الحنفی، ان سب کا جنرل کمانڈر حرقوص بن زہیر السعدی تھا۔ جب یہ قافلہ روانہ ہوا تو راستہ میں جو ہم خیال ملتے رہے اس میں شریک ہوتے رہے۔ مدینہ سے تین کوس کے فاصلہ پر پہونچ کر یہ لوگ تین حصوں میں بٹ گئے، اہل بصرہ نے ذو خشب میں قیام کیا، کوفہ اور مصر کے کچھ لوگوں نے اعوص میں پڑاؤ ڈالا اور باقی لوگ ذوالمروۃ میں ٹھہرے۔

باغی جماعتوں پر صحابہ کرام کا غصہ

یہاں پہونچ کر رائے یہ ہوئی کہ آگے بڑھنے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ اس معاملہ میں اہل مدینہ

---

[1] باغیوں کے ان سرغنہ لوگوں کے حالات ضمیمہ میں ملاحظہ کیجئے۔

کے خیالات اور احساسات معلوم کرلیے جائیں چنانچہ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے دو نمائندے زیاد بن النضر اور عبداللہ بن الاصم مدینہ پہونچے۔ ان دونوں نے مدینہ میں ازواج مطہرات، اور حضرت طلحہ، زبیر و علی سے ملاقات کی اور جماعتوں کے آنے کا مقصد بیان کیا کہ وہ امیرالمومنین سے مل کر ان سے استعفا لینا چاہتے ہیں، کیونکہ ان کے بعض عمّال نے بڑا اندھیر مچا رکھا ہے، اس پر ان سب حضرات نے بالاتفاق ان لوگوں کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم تم کو مدینہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، دونوں شخصوں نے واپس جا کر اہل مدینہ کا جواب باغیوں کو پہونچا دیا۔ اب ان لوگوں نے یہ کیا کہ الگ الگ مصر کے لوگ حضرت علی اور اہل بصرہ اور اہل کوفہ علی الترتیب حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہر ایک سے جدا جدا یہ کہا کہ ہم عثمان کو معزول کر کے آپ کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں، لیکن ان بزرگوں پر ان لوگوں کی خوشامدانہ باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا! ان تینوں حضرات نے اپنے اپنے صاحبزادوں کو صورت حال سے باخبر کرنے کی غرض سے پہلے ہی عثمان ذوالنورین کی خدمت میں بھیج رکھا تھا حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر متعلقہ وفود پر سخت ناراض ہوئے، ان کو برا بھلا کہا اور فرمایا: "صلحائے امت کو معلوم ہے کہ ذی المروۃ اعوص اور ذی خشب کے لشکروں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔ اس لیے تم فوراً واپس جاؤ"[۱] اکابر صحابہ اور ازواج مطہرات کے اس زجر و توبیخ کے باعث انھوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ اس وقت لوٹ جائیں، لیکن صرف تین کوس کے فاصلہ پر جہاں ان کے لشکر پڑے ہوئے تھے واپس گئے اور اس کا انتظار کرنے لگے کہ اہل مدینہ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر کچھ حج کے لیے روانہ ہوں اور کچھ ادھر ادھر ہو جائیں تو پھر یہ دوبارہ

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۳۴۹-۳۵۰

مدینہ پر حملہ کریں۔[1]

خطبۂ عثمانی

باغیوں کے چلے جانے کے بعد حضرت علی حضرت عثمان کے پاس آئے اور کہا: آپ کے خلاف پبلک میں چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ایک تقریر کے ذریعہ انھیں دور کر دیجئے۔ ورنہ اگر حالات روبہ اصلاح نہ ہوئے تو مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ واپس نہ آجائیں۔ اس مشورہ کے مطابق حضرت عثمان باہر تشریف لائے اور ایک خطبہ دیا جس میں آپ نے توبہ واستغفار کیا۔ اور آئندہ کے لیے وعدہ کیا کہ وہ شکایت کا موقع نہیں دیں گے، آپ نے فرمایا: میرا دروازہ ہر وقت ہر شخص کے لیے کھلا ہوا ہے، جس کسی کو کوئی شکایت ہو وہ بے تکلف میرے پاس آئے اور اپنی شکایت بیان کرے، اور یہی نہیں بلکہ جب میں منبر سے اتروں تو آپ لوگوں میں جو سربرآوردہ اور بلند مرتبہ حضرات ہیں وہ میرے پاس آئیں اور زیر بحث معاملات میں مجھے اپنے مشورہ اور رائے سے مطلع فرمائیں۔" امیر المؤمنین نے یہ بلیغ خطبہ اس سوز وگداز اور خشوع وخضوع قلب سے دیا کہ بولتے وقت رقت طاری ہوگئی اور رو پڑے، حاضرین پر بھی یہ اثر ہوا کہ ہچکی بندھ گئی۔[2]

مدینہ پر دوسرا حملہ

خطبہ سے اہل مدینہ مطمئن ہوگئے اور انھیں خوشی ہوئی کہ اب شورش ختم ہو جائے گی، لیکن مفسدین پر اس کا کیا اثر ہو سکت

---

[1] ایضاً۔ ایک عام روایت یہ ہے کہ حضرت عثمان کی درخواست پر حضرت علی نے سمجھایا بجھایا تو مفسدین واپس ہوئے اور عام مورخین نے اسی روایت کو نقل کیا ہے لیکن زیادہ صحیح اور قرین قیاس یہی روایت ہے جسے ہم نے نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنا ماخذ نہیں بتایا ورنہ جو روایت انھوں نے نقل کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ:

(۱) باغیوں کا شوال میں خروج خروج ثانی تھا، اور خروج اول رجب کے ر باقی صفحہ پر)

تھا۔ انھیں بہرحال فساد برپا کرنا تھا۔ چنانچہ ابھی حضرت عثمان کے خطبہ کے خوش گوار اثرات مدہم بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک دن مدینہ میں اچانک شور اٹھا کہ باغی اندر گھس آئے اور حضرت عثمان کا گھیراو کر لیا۔ حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کو اطلاع ہوئی تو یہ تینوں حضرات مدینہ کے اور بہت سے لوگوں کی معیت میں مصر، بصرہ اور کوفہ کے وفود سے علی الترتیب الگ الگ ملے اور ہر ایک نے پوچھا "جب تم لوگ واپس چلے گئے تھے تو پھر دوبارہ کیوں آ گئے"، ہر وفد کا جواب بس ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ۔ واپس جاتے ہوئے ہم کو ایک نامہ بر ملا جو امیر المومنین کا مصر کے گورنر کے نام ایک خط لے کر جا رہا تھا ہم نے نامہ بر کو پکڑ کر اس سے خط چھین لیا اور اب اسے پڑھا تو اس میں گورنر کو حکم دیا گیا تھا کہ مصری وفد میں جو سرغنہ ہیں انھیں تہ تیغ کر دیا جائے"۔ بصرہ اور کوفہ کے لوگوں نے کہا کہ یہ حکم مصری وفد کے لیے ہے، لیکن ہم اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے ان کے ساتھ آ گئے ہیں"۔ وفود کا یہ بیان سر تا سر فریب جھوٹ اور پہلے سے آپس کے ایک سمجھوتہ پر مبنی تھا، چنانچہ حضرت علی نے جرح کرتے ہوئے ان سے کہا: "اے بصرہ اور کوفہ کے

(بقیہ حاشیہ) مدینہ میں تھا، اور (۲) نیز یہ کہ باغیوں کا یہ گروہ صرف مصری وفد پر مشتمل تھا (الفتنۃ الکبریٰ ص ۲۰۸) ہم نے جو روایت نقل کی ہے وہ سیف بن عمر کی ہے، اس لیے زیادہ مستند ہے اس سے دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے، اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس پر تقریباً سب متفق ہیں کہ خروج اول اور خروج ثانی میں زیادہ طویل فاصلہ نہیں ہے، نیز یہ گروہ صرف مصریوں پر مشتمل نہیں تھا۔

ے طبری ج ۴ ص ۳۶۱ (ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ (کتاب المعارف ص ۶۴) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اول خروج کے موقع پر باغیوں اور حضرت عثمان میں گفتگو ہوئی تھی اور باغی اس گفتگو سے مطمئن ہو کر واپس ہوئے تھے، لیکن یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اس مضمون کی بعض روایات موجود ہیں کہ اصحاب ثلاثہ (علی، طلحہ و زبیر) اور بہت سے مہاجرین مدینہ میں (باقی صفحہ ۔۔ پر)

لوگو! تم واپسی میں اہل مصر سے کوسوں دور آگے چلے گئے تھے، پھر تم اچانک ہماری طرف مڑ گئے، تو اہل مصر کو جو واقعہ پیش آیا تم کو اس کا علم کیونکر ہوا؟ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ سارا منصوبہ تم نے اسی وقت بنالیا تھا جب تم مدینہ آئے تھے۔

حضرت علی کی یہ جرح اس درجہ معقول تھی کہ مفسدین سے اس کا جواب نہ بن پڑا تو کھسیانے ہوکر بولے: "اچھا! جیسا آپ سمجھیں!" اور آپس میں حضرت علی کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے: "اگر یہ حضرت اس وقت ہم سے علیحدہ ہوتے ہیں تو ہو جائیں ہمیں ان کی پرواہ نہیں ہے۔"[1]

مفسدین کی حضرت عثمان سے گفتگو

بہرحال یہ لوگ حضرت عثمان کے مکان کا گھیراؤ ڈال کر پڑ گئے۔ یہ گھیرا شروع میں نرم تھا حضرت عثمان مسجد میں آتے جاتے اور امامت کرتے تھے اور یہ گروہ بھی آپ کی اقتدا میں نماز ادا کرتا تھا، اسی اثنا میں اس گروہ نے حضرت علی اور محمد بن مسلمہ سے درخواست کی کہ وہ ان کی موجودگی میں خلیفہ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں وہ اس کا انتظام کردیں، دونوں نے ایک دن ظہر کے بعد کا وقت دربار خلافت سے منظور کرالیا اور ٹھیک وقت پر پہونچ گئے، اس موقع پر مفسدین نے حضرت عثمان کو اس طرح سلام نہیں کیا جیسا کہ ایک خلیفہ کو کرنا چاہیئے، بہرحال گفتگو شروع ہوئی، عبدالرحمٰن بن عدیس نے مصری وفد کے نمائندہ کی حیثیت سے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح گورنر مصر کی شکایت کرکے اس کے اور ساتھ ہی دوسرے عمال حکومت کے عزل اور ان کی جگہ خود ان کے پسندیدہ لوگوں کے تقرر کا مطالبہ کیا، حضرت عثمان نے ان کا یہ مطالبہ یہ کہہ کر رد کردیا کہ اگر میں تم لوگوں کی خواہش اور پسند کے مطابق ہی عمال کا عزل ونصب کرنے لگوں تو پھر حکومت کا اقتدار تمہارے ہاتھ میں ہوگا

(بقیہ حاشیہ) اڑ کر کھڑے ہوگئے تھے کہ ہرچہ باداباد مفسدوں کو مدینہ کے اندر داخل نہیں ہونے دیں گے۔

[1] طبری ج ۴ ص ۳۵۱

نہ کہ میرے ہاتھ میں، نہیں! میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا"۔

عبدالرحمٰن بن عدیس نے مزید کہا: "ہم پہلے بھی آئے تھے، مگر صحابہ کی ایک جماعت نے ہم کو آپ کی طرف سے یقین دلایا کہ ہماری شکایات جلد رفع ہوں گی، ہم مطمئن ہو کر (ذی خشب وغیرہ سے ہی) مصر جانے کے لیے واپس ہو گئے، لیکن راستہ میں دربارِ خلافت کا ایک فرستادہ ملا جو گورنر مصر کے نام سربمہر خط لے جا رہا تھا، ہم نے اس شخص سے وہ خط چھین کر پڑھا تو اس میں ہم لوگوں کے قتل کا حکم تھا۔ حضرت عثمان نے قسم کھا کر اس خط سے مکمل لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ مگر اس گروہ کو اس پر اصرار تھا کہ خلیفہ کا یہ انکار صحیح ہو یا غلط دونوں صورتوں میں خلیفہ عزل کا مستحق ہے، اس کے جواب میں امیرالمومنین نے فرمایا: "میں (خلافت کی) وہ قمیص ہرگز نہیں اتاروں گا جس کو اللہ نے مجھے پہنایا ہے"۔ مصری وفد نے کہا: "ہم اس وقت تک (مدینہ سے) نہیں لوٹیں گے جب تک ہم آپ کو خلافت سے برطرف یا قتل یا آپ ہم کو واصل باللہ نہیں کر دیں گے، اگر آپ کے ساتھیوں نے مزاحمت کی تو ہم ان سے جنگ کریں گے، یہاں تک کہ ہم آپ تک پہونچیں"۔ امیرالمومنین نے جواب دیا: "مجھے قتل ہو جانا منظور ہے، لیکن خلافت سے دست بردار ہونا منظور نہیں ہے، رہا تمہارا یہ کہنا کہ تم میرے ساتھیوں سے جنگ کرو گے تو میں کسی شخص سے جنگ کرنے کا حکم نہیں دوں گا"۔ اب گفتگو ختم ہو گئی، مصری وفد اور حضرت علی دونوں رخصت ہو گئے۔[1]

حضرت عثمان اور حضرت علی کی گفتگو

اب امیرالمومنین نے حضرت علی کو بلایا اور ان سے درخواست کی کہ مصریوں کو میری جانب سے مطمئن کر دو کہ ان کی جائز شکایات و مطالبات پر غور ہو گا اور انھیں

[1] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۹ و ۱۷۰

دور کیا جائے گا، لیکن حضرت علی نے تعمیل ارشاد سے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ میں نے پہلی مرتبہ ان لوگوں سے جو وعدے آپ کی طرف سے کئے تھے وہ اب تک پورے نہیں ہوئے ہیں اس لیے اب میں ان کے پاس کس منہ سے جاؤں لہ یہاں سے رخصت ہوکر حضرت علی کہاں گئے؟ اس میں اختلاف ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ مدینہ کے مضافات میں ینبع نامی ایک گاؤں تھا جہاں ان کی جائداد تھی وہاں چلے گئے تھے لیکن ہمارے نزدیک صحیح اور اقرب الی القیاس یہی ہے کہ وہ مدینہ میں آخر وقت تک مقیم رہے۔

مسجد نبوی میں سخت ناگوار واقعہ

اسی اثناء میں ایک سخت ناگوار واقعہ یہ پیش آگیا کہ حضرت عثمان ایک دن جمعہ کی نماز کے لیے مسجد نبوی میں تشریف لے گئے، یہاں مصری وفد بھی موجود تھا نماز کی امامت حسب معمول حضرت عثمان نے کی، اس سے فراغت کے بعد آپ منبر پر تشریف لائے اور مصری وفد کی طرف روئے سخن کر کے فرمایا: دشمنو! خدا کے قہر وغضب سے ڈرو! اہل مدینہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں ملعون ہوئے پس تم لوگوں نے جو خطائیں کی ہیں ان کی تلافی عمل خیر کر کے کرو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہی یہ ہے کہ وہ حسنات کے ذریعہ سئیات کو محو کرتا ہے" امیر المومنین نے یہ فرمایا ہی تھا کہ مسجد کے ایک گوشہ سے محمد بن مسلمہ بولے: بالکل سچ فرمایا آپ نے! میں اس کا گواہ ہوں" محمد بن مسلمہ کا یہ کہنا تھا کہ مصری وفد کے ارکان اور اہل مدینہ میں جھڑپ شروع ہوگئی، مصریوں نے کنکر پتھر اٹھا اٹھا کے پھینکنے شروع کردیے، اس پتھراؤ میں حضرت عثمان بھی زخمی ہوکر بے ہوش ہوگئے، اسی حالت میں آپ کو گھر پہونچایا گیا، صحابۂ کرام میں سے حضرت زید بن ثابت، سعد بن مالک، ابوہریرہ، اور حسن بن علی

لہ الفیا ص ۱۷۰

اور دوسرے حضرات جو موجود تھے انھوں نے مصریوں کو ان کے کیفر کردار کی سزا دینے کا ارادہ کیا۔ مصری اس وقت مسجد سے نکل کر جا چکے تھے۔ اس لیے حضرت عثمان کو خبر ہوئی تو صحابہ کو تاکیداً کہلا بھیجا کہ مصریوں کا تعاقب نہ کیا جائے۔ حضرت علی، طلحہ اور زبیر کو اس واقعہ کا علم ہوا تو حضرت عثمان کی عیادت اور اس واقعہ پر اظہار افسوس کے لیے آئے۔[۱]

گورنروں اور امرائے عساکر سے امداد طلبی

یہ واقعہ اس امر کا واضح ثبوت تھا کہ مصری لوگ فتنہ و فساد پیدا کرنے کی قسم کھا چکے ہیں، وہ ہر حالت میں اسے برپا کر کے رہیں گے، اسی لیے اب ان کے لیے کسی اور تدبیر کو اختیار کرنے کی ضرورت تھی، اس بنا پر اب امیرالمومنین نے گورنروں اور امرائے افواج کو خطوط لکھ کر ان کو صورت حال سے مطلع کیا اور امداد طلب کی لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اس امداد کا مقصد جنگ اور قتل و قتال ہرگز نہیں تھا، کیونکہ امیرالمومنین ایک لمحہ کے لیے اس کے روادار نہیں ہو سکتے تھے کہ ان کی وجہ سے کسی ایک مسلمان کی بھی خون ریزی ہو، بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ یہ سب لوگ آئیں گے تو باغی جان بچانے کی غرض سے خوف زدہ ہو کر خود بخود بھاگ جائیں گے، بہرحال حضرت عثمان کی طلب پر امیر معاویہ بعض معاملات کی وجہ سے فوراً روانہ نہ ہو سکے۔ البتہ شام سے حبیب بن مسلمۃ الفہری اور بصرہ سے مجاشع بن مسعود السلمی لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ روانہ ہوئے لیکن یہ حضرات مقام ربذہ (مدینہ سے تین میل دور) پہونچے کہ حضرت عثمان کی شہادت کی خبر ملی۔[۲]

شہروں کے مسلمانوں کے نام ایک گشتی مراسلہ

مذکورہ بالا خط کے علاوہ مختلف شہروں کے لوگوں کے نام بھی

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۳۵۳

[۲] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۷۰

گشتی مراسلہ بھیجا گیا۔ جس کا مقصد باغیوں کو یہ دکھانا اور باور کرانا تھا کہ صرف تم چند لوگ ہو، جو شورش بپا کیے ہوئے ہو، ورنہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت جس میں اکابر صحابہ اور ناموران اسلام شامل ہیں دل سے حضرت عثمان کی وفادار اور مطیع و فرماں بردار ہے۔ اس مراسلہ کا مضمون یہ تھا۔

"اللہ عزوجل نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا۔ آپ نے خدا کے احکام لوگوں تک پہونچائے، جب اپنا فرض ادا کر چکے تو آپ دنیا سے رخصت ہو گئے، اور اپنے پیچھے ایک کتاب چھوڑ گئے جس میں حلال اور حرام اور جو امور مقدر ہیں ان سب کا بیان تھا۔ آپ نے ان چیزوں کو لوگوں کی پسند اور ناپسند سے بے نیاز ہو کر نافذ کیا، آپ کے بعد ابوبکر اور عمر خلیفہ ہوئے، پھر مجھ کو اہل شوریٰ میں داخل کیا گیا، حالانکہ میں نے اس کو نہ طلب کیا تھا اور نہ مجھے اس کا علم ہی تھا، پھر اہل شوریٰ نے سب مسلمانوں کی موجودگی میں مجھ کو خلافت کے لیے منتخب کیا۔ حالانکہ مجھ کو نہ اس کی رغبت تھی اور نہ میں نے اس کی خواہش کی تھی، خلیفہ بننے کے بعد میں نے معروف پر عمل کیا، منکر پر عمل نہیں کیا، میں اپنے کاموں میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کا) پیرو کار رہا ہوں اور خود متبوع نہیں بنا، میں مقتدی رہا ہوں، مبتدع نہیں ہوا، لیکن جب معاملات انتہا کو پہونچ گئے اور شر نے شر پسندوں پر غلبہ پالیا تو بغیر کسی سبب کے لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کینہ اور دشمنی رکھنے لگے، ان مفسدین نے خواہ مخواہ میری عیب جوئی شروع کر دی اور جو ان کے جی میں آیا اس کا مجھ پر الزام لگانے لگے میں نے اس پر صبر کیا، حالانکہ میں سب کچھ دیکھتا اور سنتا تھا، لیکن برسوں تک میں ان کی حرکات کو نظر انداز کرتا رہا، لیکن اب ان کی جرأت اور جسارت حد سے زیادہ ہو گئی ہے، یہاں تک کہ ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس، حرم مدینہ، اور دار الہجرت میں مجھ پر حملہ کیا ہے اور بہت سے اعراب ان کے ساتھ ہو گئے ہیں، یہ درحقیقت ان قبیلوں کی طرح ہیں جن سے غزوہ احد میں ہم کو سابقہ پیش آیا تھا، اس لیے اب میں کہتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے جس جس کے لیے

ممکن ہو وہ میرے پاس پہونچ جائے [1]

شہروں میں عثمان ذوالنورین کا یہ خط پڑھ کر سنایا گیا تو لوگوں میں بڑا جوش پیدا ہوگیا۔ شام سے امیر معاویہ نے حبیب بن مسلمۃ الفہری کو، اور مصر سے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے معاویہ بن حدیج السکونی کو روانہ کیا، اہل کوفہ کی طرف سے قعقاع بن عمرو نکلے، ان کے علاوہ کرنہ، بصرہ اور مصر میں جو صحابہ اور تابعین حضرت عثمان کے وفادار اور حامی تھے، طبری نے ان کے نام دئے ہیں، یہ سب امیر المومنین کی طلب پر مدینہ جانا چاہتے تھے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان تینوں شہروں سے امرائے فوج اپنے اپنے دستوں کے ساتھ جا رہے ہیں تو ان حضرات . . . . نے مدینہ کا ارادہ فسخ کردیا [2]

محاصرہ میں شدت کم وبیش ایک ماہ تک باغی گروہ پڑا وڈالے پڑا رہا۔ اس اثنا میں حضرت عثمان مسجد میں آتے جاتے اور نماز پڑھاتے تھے۔ لیکن اب باغیوں نے آپ کو مسجد میں آنے جانے سے بھی روک دیا اور ان کا اپنا امیر غافقی امامت کرنے لگا [3]

وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان نے مذکورہ بالا دو خطوط جو لکھے تھے۔ باغیوں کو ان کا علم ہوگیا ہوگا۔ علاوہ ازیں حج کے ایام بھی ختم ہونے کے قریب آرہے تھے، اس لیے ان لوگوں نے سوچا کہ امداد اور حاجیوں کی آمد سے پہلے پہلے انھیں اپنے منصوبہ کی تکمیل کرلینی چاہیے

---

[1] طبری ج ۴ ص ۳۵۱ و ۳۵۲

[2] ایضاً۔ معلوم ہوتا ہے کہ امرائے عساکر اور عام مسلمانوں کے نام مذکورہ بالا دونوں خط ایک ساتھ ہی لکھے گئے ہیں۔ اسی لیے پہلے خط جن کی روانگی کا ذکر ہے دوسرے خط میں بھی ان کا ذکر ہے۔

[3] طبری ج ۴ ص ۳۵۴

ورنہ ان کو اپنی کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی، اسی بناء پر باغیوں نے اب محاصرہ شدید کر دیا اور حضرت عثمان گھر میں مقید ہو کر رہ گئے، اسی حالت میں باغیوں نے گھر میں گھسنے کی کوشش کی، لیکن کاشانۂ خلافت میں چھ سو کے لگ بھگ جاں نثار پہرہ دے رہے تھے جن میں اکابر صحابہ و تابعین کے ساتھ حضرات حسنین، عبداللہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن عمر بھی شامل تھے انھوں نے باغیوں کو اندر نہیں آنے دیا۔[1]

امارت حج کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس کی نامزدگی

حضرت عثمان کا یہ معمول تھا کہ جب سے خلیفہ ہوئے تھے بحیثیت امیرالمومنین کے ہر سال حج کو تشریف لے جاتے اور جیسا کہ گذر چکا ہے، اس موقع پر تمام عمال کو بھی بلاتے، ہر ایک سے اس کے صوبہ کے حالات دریافت کرتے عوام سے ان کے دکھ درد معلوم کرتے اور اس طرح مملکت اسلامیہ کے تمام احوال و ظروف سے باخبر رہتے تھے، حضرت عثمان کی فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ اس مرتبہ حج کو نہیں جا سکتے تھے تو عبداللہ بن عباس کو بلا کر ان سے فرمایا: اس مرتبہ تم میری طرف سے حج کو چلے جاؤ" انھوں نے جواب دیا۔ ان باغیوں سے جہاد کرنا میرے نزدیک حج کرنے سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب ہے۔ لیکن حضرت عثمان نے اصرار کیا اور قسم دی تو آخر راضی ہوئے اور حج کو گئے[2]

امیرالمومنین کا مفسدین سے خطاب

باغیوں نے حضرت عثمان کو گھر میں مقید کر دیا تو ایک دن اتمام حجت کے خیال سے آپ نے بالائے بام سے باغیوں کو خطاب کیا اور فرمایا " میں تم لوگوں کو قسم دے کر پوچھتا ہوں سچ کہو کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر بیر رومہ خرید کر اس کا پانی تمام مسلمانوں کے لیے وقف نہیں کر دیا تھا؟ سب نے کہا: ہاں! پھر فرمایا، مسجد نبوی تنگ تھی۔ اس میں سب

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۷۴

[2] ایضاً

نمازی نہیں سما سکتے تھے، تو کیا میں نے اس کی ملحقہ زمین خرید کر اس کی توسیع نہیں کی؟ سب نے کہا ہاں! پھر فرمایا: جب جیشِ عسرہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امداد کی اپیل کی تو کیا اس وقت میں نے جیشِ عسرہ کی مکمل تیاری کا بندوبست نہیں کیا تھا، اور کیا اس پر مسرور فرما کر حضور نے مجھ کو جنت کی بشارت نہیں دی تھی؟ سب ایک آواز ہو کر بولے، ہاں! حضور عثمان نے تین مرتبہ فرمایا: اے اللہ تو گواہ رہ۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے یہ بھی فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ ایک مرتبہ جب حراء پہاڑ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر اور میں، ہم تینوں کھڑے تھے اور پہاڑ لرزنے لگا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: اے حراء ٹھہر! اس وقت تیری پشت پر ایک نبی ہے، ایک صدیق ہے اور ایک شہید ہے۔ حضرت عثمان نے زور دے کر پوچھا: لوگو! بتاؤ، کیا رسول اللہ نے یہ نہیں فرمایا تھا۔ سب نے بیک آواز کہا: ہاں بیشک! [1]

حضرت عثمان کا مقصد اس تقریر سے باغیوں کے ضمیر کو بیدار کر کے انھیں یہ سوچنے پر آمادہ کرنا تھا کہ وہ کس کے ساتھ یہ معاملہ کر رہے ہیں لیکن ان کا ضمیر مردہ ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ حضرت کے ہر سوال کا جواب اثبات میں دینے کے باوجود اپنے موقف پر قائم رہے، یعنی کہ یہ امیر المومنین خلافت سے دست بردار ہوں، ورنہ قتل کر دیے جائیں، حضرت عثمان کو والی مصر کے نام خط کے افسانہ کا علم ہوا تو آپ نے قسم کھا کر اس کی تردید کر دی۔ ہم اس کا پہلے مفصل ذکر کر چکے ہیں یہ بھی فرمایا، اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو اس کے جواز کی دلیل کیا ہے؟ میں نے تو اسلام سے پہلے بھی نہ کبھی شراب پی، نہ کبھی زنا کیا اور نہ کسی کو قتل کیا، اور اگر تم نے مجھ کو قتل کر دیا تو پھر اس کے بعد کبھی تم میں باہم محبت نہ ہو گی۔ اور ہمیشہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہو گے اور تمہاری

---

[1] موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الهیثمی از صفحہ ۵۳۶ تا ۵۴۳۔

اجتماعیت ختم ہو جائے گی لہ لیکن ان لوگوں پر ذرا اثر نہیں ہوا۔

اس وقت صورت حال بڑی عجیب وغریب اور ساتھ ہی نہایت ہی خطرناک اور تشویش انگیز تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف حضرت عثمان باغیوں سے فرما چکے تھے کہ وہ کسی حالت میں بھی کسی شخص کو ان کی طرف سے باغیوں سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ کاشانۂ خلافت میں جو جانثار بتعداد کثیر موجود تھے ان کی بار بار کی درخواست کے باوجود ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ باغیوں کو اس طرف سے تو اطمینان تھا ہی، دوسری طرف حج ختم ہونے والا تھا۔ اور اہل مدینہ اور دوسرے اصحاب کی آمد متوقع تھی، اس بناء پر باغیوں نے چاہا کہ وہ محاصرہ کو شدید سے شدید تر کر کے امیرالمومنین پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالیں اور اس طرح آپ سے خلافت سے دست برداری کا اعلان جلد از جلد کرادیں، چنانچہ اب محاصرہ اتنا شدید ہو گیا کہ مکان کے اندر سے کوئی شخص باہر اور باہر کا کوئی آدمی اندر نہیں جا سکتا تھا، یہاں تک کہ کاشانۂ خلافت میں پانی بھی بند کر دیا گیا، ام المومنین ام حبیبہ کو علم ہوا تو حضرت عثمان کی مدد کے لیے روانہ ہوئیں۔ لیکن باغیوں نے نہیں جانے دیا۔ ام المومنین کے ساتھ بڑی گستاخی سے پیش آئے، اور آپ کی سواری کے خچر کو زخمی کر کے گرا دیا۔ چند آدمی جو موقع پر موجود تھے انھوں نے آپ کو وہاں سے نکالا لہ۔ مدینہ میں عجیب خوف وہراس اور دہشت کا عالم تھا۔ جیسا کہ عام طور پر اس قسم کے فساد کے موقع پر ہوتا ہے، بہت سے مرنج ومرنجان قسم کے اصحاب خانہ نشین ہو گئے، اور کچھ مدینہ چھوڑ کر ادھر ادھر اپنی جاگیر وجائدادوں میں چلے گئے، بالکل آخری مرتبہ حضرت علی حضرت عثمان کی طلب پر کاشانۂ خلافت میں جانے لگے تو باغیوں نے راستہ روک لیا

لہ طبری ج ۴ ص ۳۷۲

لہ ایضاً ص ۳۸۶

اور نہیں جانے دیا، آپ نے اپنا عمامہ اتار کر قاصد کو دیا اور فرمایا: جو حالت تم دیکھ رہے ہو امیر المومنین سے جاکر بیان کر دینا۔[1]

مقابلہ کے لیے جاں نثاروں کی اجازت طلبی

اسی اثنا میں خبر پہونچی کہ عراق کی کمک مدینہ کے قریب اور شام کی کمک وادی القریٰ کے نزدیک پہونچ گئی ہے۔ اس وقت ابن سعد کے بیان کے مطابق محاصرہ کرنے والوں کی تعداد نو سو کے لگ بھگ تھی، جن میں سے چھ سو مصری تھے دو سو کوفہ اور سو بصرہ کے لوگ تھے۔ مصریوں کے قائد عبد الرحمٰن بن عدیس، کنانہ بن بشر الکندی اور عمرو بن الحمق الخزاعی تھے، کوفیوں کا سردار اشتر نخعی تھا اور بصری گروہ حکیم بن جبلۃ العبدی کی زیر امارت تھا۔ کاشانۂ خلافت میں جو حضرات مجتمع تھے ان کی تعداد سات سو تھی، اب عراق اور شام کی امدادوں کے مدینہ کے قریب پہونچ جانے کی خبر اڑی تو دونوں طرف سخت ہیجان اور جوش کی کیفیت پیدا ہو گئی، زید بن ثابت حضرت عثمان کے پاس آئے اور بولے: انصار دروازہ پر حاضر ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ ہم دوبارہ انصار بننے کے لیے حاضر ہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا: اگر مقصد جنگ کرنا ہے تو میں اجازت نہیں دوں گا۔ ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں۔ میرا سب سے بڑا معاون اور مددگار وہ شخص ہوگا جو اپنا ہاتھ اور ہتھیار روکے رہے۔ ابوہریرہ آئے انھوں نے کہا: حضرت! جنگ کی اجازت ہے؟ امیر المومنین نے فرمایا: ابوہریرہ! کیا تم اس کو پسند کروگے کہ تم مجھ کو اور سب لوگوں کو تہ تیغ کر دو" انھوں نے جواب دیا "نہیں"۔ آپ نے پھر فرمایا: اگر تم نے ایک آدمی بھی قتل کیا تو گویا سب کو ہی قتل کر دیا۔ اسی سلسلے میں عبد اللہ بن زبیر حاضر ہوئے اور زور ڈال کر حضرت عثمان سے کہا: آپ باغیوں سے جنگ کیجیے، خدا کی قسم! اللہ نے آپ کے لیے ان لوگوں سے جنگ کرنا حلال

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۷

کر دیا ہے" لیکن حضرت عثمان نے ان کو بھی وہی جواب دیا اور جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی[1]

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا مشورہ

حضرت مغیرہ بن شعبہ بھی آئے اور بولے آپ اُمّت کے امام اور خلیفہ برحق ہیں، جو صورتِ حال اس وقت درپیش ہے اس کے پیش نظر صرف تین صورتیں ہیں، ان میں سے کوئی ایک اختیار فرمائیے، ایک یہ کہ آپ کے پاس طاقت کافی ہے، اس کو لے کر نکلیے اور دشمنوں کا مقابلہ کیجئے، آپ حق پر ہیں اور وہ باطل پر، دوسری صورت یہ ہے کہ کاشانۂ خلافت کے صدر دروازہ پر باغیوں کا ہجوم ہے، اس کو چھوڑ کر ہم عقب میں ایک دروازہ بنائے دیتے ہیں، آپ اس سے نکل کر سواری پر بیٹھ کر مکہ مکرمہ چلیے، وہاں حرم میں لوگ جنگ نہ کریں گے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ عقب دروازہ سے نکل کر شام چلیے، وہاں معاویہ موجود ہیں اور شام کے لوگ وفادار بھی ہیں، لیکن حضرت عثمان ان تینوں صورتوں میں سے کسی پر راضی نہیں ہوئے اور فرمایا: "میں مقابلہ نہیں کروں گا، کیونکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پہلا خلیفہ بننا گوارا نہیں کر سکتا جس کے ہاتھوں امت میں خوں ریزی کا آغاز ہوا ہو، میں مکہ بھی نہیں جاؤں گا کیوں کہ یہ خیرہ سر وہاں بھی خونریزی سے باز نہ آئیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی ہے کہ قریش کا ایک شخص مکہ کی حرمت اٹھائے گا، میں وہ شخص بننا برداشت نہیں کر سکتا، رہا شام جانا! تو وہاں کے لوگ ضرور وفادار ہیں اور معاویہ بھی وہاں ہیں لیکن جوارِ رسول اور دار الہجرت سے جدائی اور دوری کس طرح منظور کر سکتا ہوں[2]

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۸ و ۴۹

[2] مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۶۷

شہادت کی تیاری

اب جتنا وقت گزرتا جاتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد پیش گوئیوں کے باعث حضرت عثمان کو اپنی شہادت کا یقین ہوتا جاتا تھا اور آپ نے اس کی تیاری شروع کردی تھی چنانچہ جس دن واقعۂ شہادت پیش آیا ہے وہ جمعہ کا دن تھا. اس روز آپ نے روزہ رکھا تھا اسی حالت میں غشی کی سی کیفیت ہوگئی، اس سے افاقہ ہوا تو فرمایا کہ میں نے نیم خوابی کے عالم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر وعمر کو دیکھا ہے، فرماتے ہیں کہ عثمان! آج کا روزہ تم ہمارے ساتھ افطار کرنا، روزہ کے علاوہ آپ نے بیس غلام آزاد کئے، اور ایک پائجامہ جو آپ نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا اسے زیب تن فرمایا.

شہادت

حضرت عثمان اپنے جان نثاروں کو تاکیداً ہتھیار اٹھانے سے منع کرہی چکے تھے، لیکن باغیوں نے کمک کے قریب آنے کی خبر سنی تو غصہ سے بدحواس ہوگئے، کاشانۂ خلافت کے دروازہ کی طرف بڑھے اور آگ لگادی. اندر جو حضرات موجود تھے وہ باہر نکل آئے اور طرفین میں سخت نبرد آزمائی ہوئی، جس میں عبداللہ بن زبیر اور مروان الحکم کو شدید ضربات پہونچیں اور کچھ لوگ کھیت بھی رہے[۱] کاشانۂ خلافت کے پڑوس میں عمرو بن حزم کا مکان تھا. اس مکان کی ایک کھڑکی حضرت عثمان کے مکان میں کھلتی تھی۔ طرفین میں یہ نبرد آزمائی ہو ہی رہی تھی کہ محمد بن ابی بکر اور چند ساتھی اس کھڑکی میں سے چھلانگ لگاکر کاشانۂ خلافت میں گھس آئے، جیسا کہ ابھی ہم نے کہا ہے، حضرت عثمان اس وقت روزہ سے تھے، عصر کے بعد کا وقت تھا. آپ کی بیوی نائلہ بنت القرفصا آپ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں، حضرت عثمان کے سامنے قرآن مجید کھلا ہوا تھا اور آپ اس کی تلاوت کررہے تھے اسی عالم میں محمد بن ابی بکر نے لپک کر امیرالمومنین کی داڑھی پکڑلی اور حد درجہ

---

[۱] طبری ج ۳ ص ۳۸۲

بدکلامی کی، حضرت عثمان نے فرمایا: بھتیجے! داڑھی چھوڑ دے، اگر آج تیرا باپ زندہ ہوتا تو وہ ہرگز اس کو پسند نہ کرتا۔ محمد ابن ابی بکر بولا: میں تو آپ کے ساتھ اس سے بھی زیادہ سخت معاملہ کرنے والا ہوں۔ اس نے یہ کہا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر امیرالمومنین کی پیشانی میں پیوست کردیا۔ پیشانی سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا جس سے ریش مبارک تر بتر ہوگئی۔ امیرالمومنین کی زبان سے بے ساختہ نکلا، بسم اللہ توکلت علی اللہ اور آپ بائیں کروٹ ہو گئے۔ قرآن مجید آپ کے سامنے کھلا تھا اور سورہ بقر کی تلاوت کر رہے تھے، پیشانی سے نکل کر خون داڑھی پر آیا اور ٹپکنے لگا تو قرآن مجید پر بھی بہنے لگا، یہاں تک کہ آیت فسیکفیکہم اللہ وھو السمیع العلیم ٥ پر پہونچ کر خون رک گیا اور قرآن بند ہو گیا، اسی اثنا میں کنانہ بن بشر بن عتاب نے لوہے کی ایک لاٹ اس زور سے ماری کہ عثمان ذوالنورین تیورا کے پہلو کے بل گر پڑے۔ اب سودان بن حمران نے تلوار کا وار کیا اور عمرو بن الحمق نے سینہ پر بیٹھ کر نیزہ سے مسلسل کئی بار حملے کئے تو عالم اچانک تیرہ و تار ہو گیا اور حلم و حیا و صدق و صفا کے چمنستان میں خاک اڑنے لگی یعنی ثالث خلیفہ راشد امیرالمومنین عثمان ذوالنورین کی روح پرفتوح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ آپ کی بیوی حضرت نائلہ نے آپ پر جھک کر سودان بن حمران کی تلوار کا وار ہتھیلی پر لیا تو انگلیاں اڑ گئیں، اس کے بعد گھر میں غارت گری شروع کر دی جس کے ہاتھ جو چیز آئی اسے لے کر چل دیا۔[1]

تجہیز و تکفین یہ عظیم حادثہ عصر و مغرب کے درمیان جمعہ کے دن ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو پیش آیا تھا۔ باغیوں نے مدینہ میں خوف و ہراس کا ایسا عالم پیدا کر دیا

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۵۱ و ۵۲۔ قرآن مجید کا یہ نسخہ جس پر خون کے نشانات ہیں اس کو ابن بطوطہ نے بصرہ کی ایک عظیم الشان مسجد میں دیکھا تھا جو حضرت علی کی طرف منسوب ہے رحلتہ ابن بطوطہ طبع دار بیروت ص ۱۸۹ ربانی صفحہ پر)

تھا کہ گویا شہر پر ان کا قبضہ تھا۔ لوگ گھروں میں بند تھے، کسی کو باہر نکلنے کا حوصلہ نہ تھا شہادت کے بعد بھی ان کا بخار دل سے نکلا نہیں تھا اس لیے اب سوال یہ تھا کہ تدفین کا انتظام کیسے اور کہاں کیا جائے، اللہ اکبر! کیا وقت تھا کہ وہ امام عالی مقام جس کی حکومت واقتدار کا سکہ کل تک مراکش سے کابل تک چلتا تھا آج کے اس کے جسد بے روح کے لیے دو گز زمین کا حاصل کرنا بھی سخت مشکل مرحلہ بنا ہوا تھا بعض روایت کے مطابق دو دن اور بعض کے نزدیک تین روز تک لاش بے گور وکفن پڑی رہی [۱] یہ روایات طبری کی ہیں۔ لیکن ابن سعد نے نیار بن مکرم الاسلمی جو خود نماز جنازہ میں شریک تھے ان کی زبانی روایت نقل کی ہے کہ امیر معاویہ کے دریافت کرنے پر انھوں نے بیان کیا کہ حضرت عثمان کی تدفین لیلۃ السبت یعنی ہفتہ کی شب میں ہوئی ہے [۲] اگر یہ روایت صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے دن عصر کے بعد شہادت ہوئی تھی اور اس کے بعد شب میں ہی تدفین عمل میں آگئی اور یہی قرین قیاس بھی ہے۔

لیکن باغی چونکہ اب بھی کاشانۂ خلافت کے صدر دروازہ پر موجود تھے اور اندیشہ تھا کہ مزاحمت کریں گے، اس لیے تدفین کی کارروائی (شہادت کی طہارت کے بعد غسل اور کفن کی تو اب ضرورت ہی نہیں تھی)، بڑی خاموشی اور رازداری کے ساتھ عمل میں آئی چنانچہ جب حضرت نائلہ گریبان چاک اور وریدہ دامن دہاڑیں مارتی اور چیختی چلاتی ایک چراغ ہاتھ میں لیے عثمان ذوالنورین کے کمرہ سے باہر آئیں تو جبیر بن مطعم نے ان سے کہا کہ چراغ

بقیہ حاشیہ: [۱] طبری ج ۴ ص ۳۹۱

[۲] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۵۲

[۳] طبری ج ۴ ص ۴۱۲

[۴] طبقات

بجھا دیجئے، باغی دروازہ پر موجود ہیں، تو انھوں نے چراغ گل کر دیا، اب حضرت عثمان کا جنازہ اس گھبراہٹ اور عجلت میں روانہ ہوا کہ امام شہید کا سر دروازہ سے ٹکرا گیا۔

ایک روایت کے مطابق اس وقت جنازہ کے ساتھ سترہ آدمی تھے۔ جن میں حضرت عثمان کی دو بیویاں حضرت نائلہ اور حضرت ام البنین بنت عنیبہ بھی شامل تھیں، ابن سعد نے اس روایت کو نقل کیا ہے، لیکن ساتھ ہی کہا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ جنازہ کے ساتھ صرف چار آدمی تھے جن کے نام یہ ہیں، جبیر بن مطعم، حکیم بن حزام، ابوجہم بن حذیفہ اور نیار بن مکرم الاسلمی، یہ حضرات جنازہ، بقیع کی طرف لائے، جبیر بن مطعم نے نماز پڑھائی اور اس کے بعد بقیع کے پہلو میں حش کوکب نام کا ایک نخلستان تھا جو خود حضرت عثمان کی ملکیت تھا۔ اس میں جامۂ شہادت کے ساتھ جسد اطہر کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ امیر معاویہ جب مدینہ آئے تو بقیع اور حش کوکب کے درمیان جو دیوار حائل تھی آپ نے وہ دیوار گرا کے حش کوکب کو بقیع کا ایک جز بنا دیا [1]

ایک سوال یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاشانۂ خلافت میں سات سو افراد موجود تھے، تو پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ جنازہ میں صرف چار یا زیادہ سے زیادہ سترہ اشخاص تھے۔ اس سوال کا جواب مخالفین حضرت عثمان طبری کی ایک روایت کی روشنی میں جو ہمارے نزدیک ہرگز صحیح نہیں ہے یہ دیں گے کہ جب کاشانۂ خلافت کے صدر دروازے کے سامنے باغیوں اور جان نثاران خلافت میں نبرد آزما ہوئی تھی (جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں) تو موخر الذکر گروہ کے حضرات شکست کھا کر بھاگ گئے اور جس کو جو راستہ ملا اس طرف نکل گیا۔ اس بنا پر اب کاشانۂ خلافت میں صرف اہل خانہ اور چند لوگ اور رہ گئے تھے [2]

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۵۴ و ۵۵

[2] طبری ج ۴ ص ۳۸۳

جواب ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ حضرات شکست خوردہ ہوکر فرار نہیں ہوئے تھے، بلکہ حضرت عثمان نماز میں مشغول تھے کہ اسی عالم میں باغیوں نے کاشانۂ خلافت کے دروازہ کو آگ لگاکر اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ جان نثاروں نے دروازہ کھول کر مقاومت کی اور حرب وضرب کی نوبت آئی۔ لیکن جوں ہی حضرت عثمان نماز سے فارغ ہوئے آپ نے جان نثاروں کو لڑنے سے منع کیا اور ان کو حکم دیا کہ اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ نیز یہ کہ جو اور حضرات دروازہ پر ہیں ان سے بھی کہیں کہ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں [1]

علاوہ ازیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ فساد کا فلسفہ اور اس کی نفسیات عجیب وغریب ہیں۔ ایک عام مشاہدہ ہے کہ فساد برپا کرنے والے لوگ ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں لیکن جب کہیں یہ فساد پیدا کرتے ہیں تو حکومت کی مشینری کو ناکام بنا دیتے ہیں، پولیس عاجز ہوجاتی ہے، دکانیں اور بازار بند، لوگوں کی آمد ورفت موقوف، اور اہل خانہ گھروں میں گھس کر بیٹھ جاتے ہیں، کافی نقصانات کے بعد جب حکومت کی طلب پر فوج آتی ہے تو وہ امن اور قانون کو بحال کرتی ہے، بعینہٖ یہی صورت حال اس وقت پیش آئی۔ باغیوں نے کاشانۂ خلافت پر اچانک جو حملہ کیا اس سے مدینہ میں خوف وہراس پھیل گیا۔ لوگ دہشت کے مارے گھروں کے دروازے بند کرکے اندر بیٹھ گئے اور جب امیرالمومنین نے تلوار اٹھانے کی سخت ممانعت کردی تھی تو اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا، اسی ہڑبونگ اور ہنگامۂ دار وگیر میں امیرالمومنین دن کا چھوٹا وقت تھا کہ شہید ہوگئے، جو لوگ خانہ نشین تھے، ان کو فوری طور پر اس حادثہ فاجعہ کا علم نہ ہوسکا اور غالباً ان کو خیال بھی نہ ہوگا کہ معاملہ یہاں تک پہونچ سکتا ہے، ادھر کاشانۂ خلافت

---

[1] طبری ج ۴ ص ۳۸۹

میں جو حضرات جمع تھے ان کو اب جلدی اس بات کی تھی کہ خلیفۂ شہید کی تدفین کا انتظام کریں اس وقت مناسب اور قرین مصلحت یہی سمجھا گیا کہ رات کی تاریکی میں جنازہ خاموشی اور رازداری سے جائے، اس کے ساتھ آدمی بھی کم ہوں اور بجائے بقیع کے اس سے متصل خود حضرت عثمان کی ذاتی جائداد میں تدفین عمل میں لائی جائے، بس یہی وجہ ہے کہ جنازہ میں صرف چار آدمی تھے۔ شہادت کے وقت حضرت عثمان کی عمر ۸۲ سال تھی اور مدت خلافت بارہ دن کم بارہ برس [1]

حضرت عثمان کا ماتم

خلیفۂ ثالث کی مظلومانہ شہادت عالم اسلام کا ایک عظیم حادثہ تھی۔ صحابۂ کرام میں صف ماتم بچھ گئی جس کسی نے سنا بیساختہ بیقرار اور اشک بار ہو گیا، زندگی میں جو حضرات نکتہ چینی کرتے تھے، شہادت نے ان کو بھی فغاں سنج بنا دیا۔ حضرت علی کو جب اس حادثہ کا علم ہوا آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولے! خدایا! تو گواہ رہ کہ میں عثمان کے خون سے بری ہوں۔ ایک موقع پر کہا: اکلت یوم اکل الثور الابیض یہ ایک عربی کا محاورہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس دن حضرت عثمان کی شہادت ہوئی میری کمر ٹوٹ گئی [2] حضرت عائشہ حج کر کے مدینہ واپس آرہی تھیں، راستہ میں ان کو حادثہ کی اطلاع ہوئی، فرمایا: اللہ کی قسم عثمان مظلوم قتل کئے گئے ہیں، میں ان کے قاتلوں سے قصاص کا مطالبہ ضرور کروں گی [3] پھر جب حضرت عائشہ قاتلین حضرت عثمان سے قصاص لینے کے ارادہ سے ایک جم غفیر کے ساتھ مکہ سے روانہ ہو کر ذات عرق پر پہونچی ہیں تو سب لوگوں پر ایک ایسا عالم گریہ وزاری طاری تھا کہ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۵۴

[2] المستقصی فی امثال العرب زمخشری ج ۱ ص ۴۱، ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت علی کو جب حضرت عثمان کی شہادت کی اطلاع ہوئی تو تلوار لے کر باہر آگئے اور باغیوں کو بھگا دیا (باقی صفحہ پر)

فلم یر یوم کان اکثر باکیا علی الاسلام وکان یسمی یوم النحیب [1]

جس طرح لوگ اسلام کی حالت زار پر آج اس وقت پھوٹ پھوٹ کر روئے اس طرح کبھی نہیں روئے تھے، اور اس لیے اس دن کا نام ہی روز گریہ رکھ دیا گیا۔

حضرت عائشہ کی ایک تقریر

اس سلسلے میں حضرت عائشہ بہت سے اکابر صحابہ کے ساتھ جب بصرہ پہونچیں اور بعض لوگوں نے ان کے وہاں آنے کی غرض وغایت دریافت کی تو فرمایا: بعض شہروں کے مفسد اور بعض قبیلوں کے فتنہ پرور لوگوں نے حرم نبوی میں پہونچ کر جنگ کی وہاں فساد پیدا کیا، انھوں نے امام المسلمین اور امیر المومنین کو ناکردہ گناہ قتل کیا ہے، ان کے گھر میں لوٹ مار مچائی ہے۔ اور اسی لیے یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی لعنت کے مستحق ہیں۔ میں مسلمانوں کو لے کر نکلی ہوں تاکہ ان ظالموں کو ان کے کیفر کردار کو پہونچاؤں۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی:

لاخیر فی کثیر من نجواھم الا من امر بصدقۃ او معروف او اصلاح بین الناس

وہ لوگ جو آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں ان میں صاحب خیر بس وہی ہیں جو خیر خیرات، امور خیر اور لوگوں میں صلح صفائی کا حکم کرتے ہیں۔

پھر فرمایا: بس یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے جس کے لیے ہم آئے ہیں اور تم لوگوں سے بھی میں کہتی ہوں کہ تم ہمارا ساتھ دو۔ [2]

(بقیہ حاشیہ) اتنے میں امام حسن، حسین، عبداللہ بن زبیر اور محمد بن طلحہ جو ایوان خلافت کا پہرہ دے رہے تھے سامنے آگئے تو حضرت علی نے امام حسن کے طمانچہ مارا، امام حسین کے سینہ پر دوہتڑ مارا اور عبداللہ بن زبیر اور محمد بن طلحہ کو برا بھلا کہا (تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۲۸۳)

[3] طبری ج ۴ ص ۴۵۹

[1] ایضا ص ۴۶۰

[2] طبری ج ۴ ص ۴۶۲

عام صحابہ کے تاثرات

ام المومنین کے ساتھ اکابر صحابہ میں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بھی تھے، اس لیے ان کے جذبات اور احساسات من وعن وہی تھے جو ام المومنین اور دوسری ازواج مطہرات کے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے اور صحابہ نے اپنے جو تاثرات ظاہر کئے وہ مختصراً یہ ہیں:

عبداللہ بن عباس: اگر ساری دنیا بھی حضرت عثمان کے قتل پر متفق ہو جاتی تب بھی قوم لوط کی طرح ان پر عذاب الٰہی پتھراؤ کی صورت میں نازل ہوتا۔ ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: "اگر لوگ حضرت عثمان کے خون کا بدلہ نہیں لیں گے تو ان پر آسمان سے پتھر برسیں گے" حذیفہ بن الیمانی نے کہا: "اب اسلام میں اتنا بڑا شگاف پیدا ہو گیا ہے کہ پہاڑ بھی اسے بند نہیں کر سکتا۔ ثمامہ بن عدی جو صنعاء (یمن کا دارالسلطنت) کے گورنر اور حضرت عثمان کے صحبت یافتہ تھے، انھیں شہادت کی خبر پہونچی تو بے ساختہ رو پڑے، دیر تک روتے رہے۔ اور پھر بولے: "امت محمدیہ سے خلافت نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب ملوکیت اور زبردستی کی حکومت کا دور دورہ ہو گا، جو شخص جس چیز پر غالب آئے گا وہ اسے ہڑپ کرے گا۔

ابو حمید الساعدی: جو بدری تھے، انھوں نے شہادت کی خبر سنی تو خدا سے عہد کیا کہ اب وہ حضرت عثمان کے ماتم میں عمر بھر فلاں فلاں کام نہیں کریں گے، اور کبھی ہنسیں گے بھی نہیں، حضرت ابو ہریرہ کا حال یہ تھا کہ جب یہ حادثہ یاد آتا تھا ہائے ہائے کر کے رونے لگتے تھے حضرت عثمان کے محاصرہ کے دن لوگوں نے زید بن ثابت کو دیکھا کہ زار وقطار رو رہے تھے۔ عبداللہ بن سلام مشہور صحابی ہیں۔ ان کو شہادت کی اطلاع ہوئی تو بے ساختہ زبان سے نکلا: الیوم هلکت العرب "آج عرب تباہ ہو گئے۔"

بعض لوگ جو حضرت عثمان کی حیات میں آپ پر تنقیدیں کرتے تھے، اب شہادت کے بعد وہ بھی نادم اور پشیمان تھے، عبداللہ بن عکیم اسی طبقہ سے تعلق رکھتا تھا، شہادت کے بعد بولا: اب میں آئندہ خدا کی قسم! کسی خلیفہ کے قتل میں مدد نہیں کروں گا، کسی نے پوچھا: کیا حضرت

عثمان کے قتل میں تیرا بھی ہاتھ تھا؟" بولا: "میں حضرت عثمان کی برائی کرتا تھا اور میں اس کو اعانت علی القتل سمجھتا ہوں۔ عمار بن یاسر آخر میں مصریوں کے بہکانے میں آکر حضرت عثمان کے مخالف ہو گئے تھے، لیکن شہادت کے بعد مخالفین سے کہتے تھے کہ جب حضرت عمر کی شہادت کے بعد حضرت عثمان کا انتخاب خلافت کے لیے ہوا، ہم سب نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ہم ان سے راضی تھے تو پھر تم نے ان کو قتل کیوں کیا۔[۱] زید بن صوحانؓ نے کہا: اب مسلمانوں کے دل قیامت تک ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔" ام سلیم ایک صحابیہ ہیں انھوں نے بھی فرمایا: "اب مسلمانوں میں باہم خون خرابہ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔" سعید بن زید بن عمر بن نفیل بولے: "تم نے عثمان کے ساتھ جو کیا ہے حق یہ ہے کہ اس پر احد پہاڑ کو گر جانا چاہیے۔" صحابۂ کرام کے علاوہ تابعین کے اقوال بھی اسی طرح کے کثرت سے ہیں۔ ابو مسلم الخولانی نے فرمایا: قاتلین عثمان کا حشر وہی ہوگا جو قوم ثمود کا ہوا، کیوں کہ خلیفہ کا قتل اونٹنی کے قتل سے کہیں زیادہ بڑی معصیت ہے۔[۲]

مراثی

حضرت عثمان کے مرثیے بھی کثرت سے لکھے گئے۔ صحابہ میں سے حسان بن ثابت الانصاری، کعب بن مالک اور دوسرے حضرات میں سے ولید بن عقبہ، لیلی الاخیلیہ، الراعی، فرزدق اور الاصمعی کے مرثیوں کے کچھ کچھ اشعار طبری، ابن کثیر اور مبرد نے نقل کیے ہیں۔ اصمعی کا ایک شعر حقیقت کا کیسا ترجمان ہے۔

العبد عثمان ترجو الخیر امتہ؟

وکان آمن من یمشی علی ساق "[۳]

---

[۱] یہ سب اقوال طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۵۵-۵۸ سے ماخوذ ہیں

[۲] یہ اقوال البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۹۴ و ۱۹۵ سے ماخوذ ہیں

[۳] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۰

عثمان دنیا کے لوگوں میں سب سے زیادہ امن پسند تھے، تو کیا اب ان کے بعد بھی ان کی امت خیر کی توقع کر سکتی ہے؟

شہادت کے نتائج

اس شہادت کا نتیجہ وہی ہوا جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد اقوال میں اشارہ فرمایا اور حضرت عثمان بھی بار بار باغیوں کو اس پر متنبہ اور خبردار کر چکے تھے۔ یعنی اسلامی وحدت اور مسلمانوں کی یکجہتی کی دیوار میں جو رخنہ پیدا ہوا اس کا بند ہونا کجا، روز بروز قیامت تک وسیع ہوتا رہے گا مسلمانوں میں فرقہ بندی، طبقاتی عصبیت، اور خانہ جنگی کا دروازہ شہادت سے ہی کھلا، باغیوں کے مصر، کوفہ اور بصرہ کے تین گروہ تھے۔ اور اگرچہ یہ تینوں خلیفہ ثالث کے خلاف بغاوت پر متفق تھے، لیکن اندرونی طور پر ہر ایک گروہ کا قبلہ مقصود الگ الگ تھا، مصر کے لوگ حضرت علی کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور کوفہ اور بصرہ کے علی الترتیب حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت زبیر بن عوام کو، مگر انجام کیا ہوا؟ اول الذکر ایک خارجی کے ہاتھوں مارے گئے اور موخر الذکر دونوں بزرگ شہادت عثمانی کے کچھ دنوں بعد ہی جنگ جمل میں شہید ہوئے، جس میں ابن سعد کے بیان کے مطابق طرفین سے تیرہ ہزار فرزندانِ توحید قتل ہوئے [1] پھر شہادت عثمانی کے ایک برس بعد ہی صفین کے میدان میں حضرت علی اور امیر معاویہ کی فوجیں جن میں اکابر صحابہ، بدریین اور مہاجرین شریک تھے باہم نبرد آزما ہوئیں تو چند روز کی مسلسل جنگ میں دونوں طرف کے ستر ہزار افراد کام آئے [2] پھر صفین کے بعد ہی نہروان کا حادثہ پیش آگیا جس میں خوارج کے ساتھ نہایت سخت اور خوں ریز جنگ ہوئی اور لوگ کثیر تعداد میں قتل ہوئے، غرض کہ حضرت علی کا زمانہ خلافت چار برس اور

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۰

[2] تاریخ ابو الفدا ج ۱ ص ۱۷۵

نو مہینے ہے اور یہ پورا زمانہ خانہ جنگیوں کی نذر ہو گیا جن میں فرزندان اسلام کی جانیں اس بہتات سے تلف ہوئیں کہ خلفائے ثلاثہ کے عہد میں کفر اور اسلام کی تمام معرکہ آرائیوں میں بھی کام نہ آئیں ہوں گی، پھر آگے چل کر حضرت علی کے دو جگر گوشوں کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا؟ امام حسن کی وفات زہر سے ہوئی اور امام حسین مع اپنے اعوان و انصار کے میدان کربلا میں شہید ہوئے۔

غور کرنا چاہیئے کہ یہ سب کچھ کیا عثمان ذوالنورین کے خون ناحق کا وہ تاوان نہیں ہے جو خاندان بنو ہاشم کو اور ان کے ساتھ پوری امت کو بھگتنا پڑا۔

۶۳ھ میں یزید بن معاویہ کے حکم سے مدینہ میں مسلم بن عقبہ نے جو قتل عام کیا تھا۔ ایک مرتبہ عبداللہ بن عمر نے اس کے متعلق فرمایا: "بفعلهم بعثمان ورب الكعبه"

ترجمہ: رب کعبہ کی قسم! اہل مدینہ نے حضرت عثمان کے ساتھ جو سلوک کیا تھا واقعہ الحرۃ[1] کا قتل عام اس کی وجہ سے ہوا ہے

حضرت علی اور معاویہ میں جنگ شروع ہوئی تو حضرت عبداللہ بن عباس نے شروع میں ہی پیش گوئی کر دی کہ: اس جنگ میں معاویہ اور ان کے ساتھی علی اور ان کے اصحاب پر غالب آجائیں گے۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لوليه سلطانا۔ اور جو شخص مظلوم قتل کیا جاتا ہے، ہم اس کے ولی کو طاقت عطا فرما دیتے ہیں۔

---

[1] حرہ مدینہ کے قریب ایک سنگلاخ اور چٹیل میدان کا نام ہے یہ جنگ چوں کہ اہل مدینہ اور یزید کی فرستادہ فوج کے درمیان ماہ ذی الحجہ ۶۳ھ میں اس میدان میں ہوئی تھی اس لیے اس واقعہ کو حرہ کہتے ہیں، جنگ کا سبب یہ تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر جنھوں نے حجاز میں اقتدار قائم کر لیا تھا ان کے زیر اثر ہونے کے باعث (باقی صفحہ ۔۔ پر)

ہاں بیشک امیر المومنین نے تلوار اٹھانے کی ممانعت کر دی تھی۔ لیکن باغی تعداد میں تھے کتنے تھے؟ اور کیا ان کے پاس اٹیم بمب تھے؟ ابن سعد کے ایک راوی کے بقول مدینہ میں صحابہ اس کثرت سے تھے کہ اگر باغیوں پر مٹی بھی پھینکتے تو وہ ناکام ہو کر بھاگ جاتے ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ گھروں سے کیوں نہیں نکلے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہٖ تم میں سے جو شخص کوئی منکر چیز دیکھے اسے چاہیئے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے۔ الحدیث

تو یہ ڈیڑھ مہینہ سے کاشانۂ خلافت پر جو ہنگامہ ہو رہا تھا کیا اہل مدینہ کے نزدیک یہ منکر نہیں تھا اور اگر تھا تو پھر کیا ان کو یہ ارشاد نبوی یاد نہیں رہا تھا؟ حضرت علی یہ تو فرماتے ہیں کہ: خدایا! تو گواہ رہ کہ قتل عثمان سے میں بری ہوں: لیکن یہ کیا ہے کہ محمد بن ابی بکر، اشتر نخعی، اور عبدالرحمن بن عدیس جیسے اشخاص جن کے ہاتھ خلیفۃ المسلمین کے خون بے گناہ سے رنگین ہیں، خلیفۂ چہارم کی فوج میں اور ان کے مقربین کے زمرہ میں نظر آتے ہیں، حضرت علی کو خوارج سے نہایت سخت جنگ کرنی پڑی، لیکن یہی وہ گروہ تھا جو حضرت عثمان سے باغی تھا، حضرت علی اس طبقہ کو اسی وقت پہچان لیتے جب وہ کاشانۂ خلافت پر حملہ آور تھے تو ان کو اپنی خلافت میں ان لوگوں سے جنگ کی نوبت کیوں آتی اور اس کے ایک فرد ابن ملجم،

(بقیہ حاشیہ) اہل مدینہ نے یزید کی بیعت کرنے سے نہ صرف یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا بلکہ مدینہ میں یزید کی طرف سے جو گورنر مقرر تھا اس کو اور امویوں کو مدینہ سے خارج البلد کر دیا تھا، یزید کو اس کا علم ہوا تو مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں ایک فوج گراں بھیجی، یزید کے حکم اور ہدایت کے مطابق مدینہ پہونچ کر مسلم بن عقبہ نے یزید سے بیعت کا مطالبہ کیا، لیکن جب اہل مدینہ اس پر راضی نہیں ہوئے تو فریقین میں جنگ چھڑ گئی جس میں کم وبیش دس ہزار صحابہ اور تابعین کام آئے اور اہل مدینہ کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے بعد یزید کی ہدایت کے ہی مطابق مسلم بن عقبہ نے (باقی صفحہ پر)

کے ہاتھوں خود کیوں شہید ہوتے۔

علی اور ان کے ساتھ دوسرے ارباب مدینہ سے اس وقت جو بھول چوک ہوئی جب شہادت کے نہایت بھیانک اور خطرناک نتائج ان کے سامنے آئے تو خود حضرت علی کو اس پر تنبہ ہوا اور فرمایا۔

"اگر میں عثمان کی مدد کرتا تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا، پھر فرمایا: "میری اور عثمان کی مثال ان تین بیلوں کی سی ہے جو تین مختلف رنگ رکھتے تھے اور جنگل میں ایک شیر کے ساتھ تھے۔ شیر نے پہلے دو بیلوں کو تیسرے بیل کے خلاف بھڑکایا اور اسے کھا گیا، اس کے بعد ایک بیل کو دوسرے بیل کے خلاف اکسایا اور اسے ہڑپ کر گیا، اب صرف ایک بیل رہ گیا تھا اس کا ختم کرنا کیا مشکل تھا، آخر کار اسے بھی لقمہ بنالیا[1]

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علی نے خود اقرار فرمایا کہ:

واللہ ما قتلت ولا امرت ولکن غُلِبتُ یقول ذالک ثلاث مرات[2]	خدا کی قسم! میں نے نہ عثمان کو قتل کیا اور نہ ایسا کرنے کا کسی کو حکم دیا۔ البتہ ہاں! میں (باغیوں سے) مغلوب ہو گیا تھا۔ اس آخری فقرہ کو تین مرتبہ دہرایا۔

مگر اب پچھتانے اور نادم و پشیمان ہونے سے کیا ہو سکتا تھا: وقت کا قاضی اپنا فیصلہ لکھ کر قلم رکھ چکا تھا۔ فآهاً ثم آهاً

(بقیہ حاشیہ) تین دن تک مدینہ میں قتل عام اور غارت گری کا بازار گرم رکھا جس کے باعث مدینۃ الرسول میں خاک اڑنے لگی اور وہ ویرانہ حسرت و نامرادی بن گیا، تاریخ میں اس واقعہ کی تمام تفصیلات مذکور ہیں ہم نے صرف خلاصہ لکھا ہے۔

[1] العقد الفرید ج ۴ ص ۲۹۹

[2] ایضاً

(باقی صفحہ ۔ پر)

خلافت سے دست بردار نہ ہونے کے وجوہ

اب اس بحث کے آخر میں یہ بھی معلوم کرلینا چاہیئے. ممکن ہے کسی شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جب حالات یہ تھے کہ حضرت عثمان محصور تھے، باغی عزل پر مصر تھے، اور حضرت عثمان تشدد کے لیے بالکل رضامند نہیں تھے تو اب حضرت عثمان کے لیے بہتر یہی تھا کہ از خود خلافت سے سبک دوش ہونے کا اعلان کر دیتے، چنانچہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین وغیرہ نے یہ لکھا بھی ہے. لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں.

(۱) سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خلافت عام حکومتوں یا ریاستوں کی طرح محض ایک سیاسی ادارہ نہیں ہے، بلکہ ایک بہت اہم اور مقدس دینی ذمہ داری بھی ہے، یہ ظاہر ہے کہ حضرت عثمان خلیفۂ منتخب تھے اس بنا پر اللہ کی طرف سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ اس ذمہ داری سے روگردان اور از خود سبک دوش نہ ہوں اور چونکہ باغیوں کے مجمع کو ارباب حل وعقد مسلمانوں کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا اس بنا پر اس مجمع کا مطالبۂ عزل ایک باغیانہ نعرہ کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا.

(۲) اگر حضرت عثمان اس وقت خلافت سے دست بردار ہو جاتے تو اس سے آئندہ کے لیے شر پسند اور فتنہ جو لوگوں کے حوصلے بلند ہوتے اور پھر کبھی کوئی حکومت بھی مستحکم نہیں ہو سکتی تھی، ایک بری نظیر قائم ہو جاتی اور خود یہ حضرت عثمان کی کمزوری کی دلیل ہوتی، چنانچہ ابن سعد نے ایک مستقل باب اسی عنوان سے باندھا ہے کہ "حضرت عثمان

(بقیہ حاشیہ) ؎ طبقات ج ۳ ص ۵۰

؎۲ البدایۃ والنہایۃ ج، ص ۱۹۴، ہم نے اوپر حضرت علی کا جو قول اکلت یوم اکل الثور الابیض نقل کیا ہے اس میں بیلوں اور شیر کے اسی قصہ سے تلمیح ہے. ؎۳ طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۵۰

سے خلع (خلافت سے دست بردار ہونا) کے مطالبہ میں کیا کہا گیا ہے اور انھوں نے کیا جواب دیا۔ اس باب میں ابن سعد حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت عثمان نے جب کہ وہ محصور تھے مجھ سے دریافت کیا، باغی مجھ سے خلع کا مطالبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے، آپ کی اس میں کیا رائے ہے؟ عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں، اس سوال کے جواب میں مجھ میں اور حضرت عثمان میں حسب ذیل گفتگو ہوئی:

عبداللہ بن عمر: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ خلافت سے دست بردار ہو گئے تو آپ دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے چھوڑ دیئے جائیں گے؟

امیر المومنین: نہیں!

عبداللہ بن عمر: کیا جنت کی کنجیاں ان لوگوں کے قبضہ میں ہیں؟

امیر المومنین: نہیں!

عبداللہ بن عمر: اگر آپ خلافت سے دست بردار نہیں ہوئے تو کیا یہ لوگ آپ کو قتل کرنے کے سوا کچھ اور بھی کر سکتے ہیں؟

امیر المومنین: اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے ہیں؟

اس سوال وجواب کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر نے امیر المومنین سے فرمایا: پس اگر یہ سب صحیح ہے تو میری رائے میں ہرگز یہ مناسب نہیں ہے کہ خلافت سے مستعفی ہو کر آپ آئندہ کے لیے یہ نظیر قائم کر دیں کہ جہاں کوئی ایک گروہ کسی امیر المومنین سے ناراض ہوا وہ جھٹ اس کے عزل کا مطالبہ لے کر پہونچ گیا، اس کے بعد فرمایا:

لا تخلع قمیصاً قمصکہ اللہ [1] — آپ وہ قمیص (خلافت) نہ اتاریئے جو اللہ نے آپ کو پہنائی ہے

---

[1] طبقات ج ۳ ص ۴۵ و ۶۶

حضرت عبداللہ بن عمر نے یہ جو کچھ فرمایا درحقیقت یہ وہی تھا جس کو وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن چکے تھے، ان کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن عفان سے فرمایا، ایک وقت آئے گا جب کہ لوگ آپ سے اس قمیص کو اتارنے کا مطالبہ کریں گے جو اللہ آپ کو پہنانے والا ہے۔ اس وقت، اس خدا کی قسم جس نے مجھ کو پیغمبر برحق بنا کر مبعوث کیا ہے، اے عثمان! اگر تم نے یہ قمیص اتار پھینکی تو یاد رکھو جنت کے دروازے تم پر بند ہو جائیں گے۔ [۱] بعض روایات میں بجائے قمیص کے سربال کا لفظ آیا ہے، بہرحال معنی دونوں کے ایک ہیں، حضرت عثمان کو اس لفظ کا اتنا اہتمام تھا کہ جب آپ سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

لا انزع سربالاً سربلنیہ اللہ [۲] — میں اس کرتہ کو نہیں اتاروں گا جو مجھ کو اللہ نے پہنایا ہے۔

جو لوگ امیر المومنین سے مطالبۂ عزل کر رہے تھے، یہ کس قماش کے لوگ تھے اور ایک نہایت وسیع مملکت اسلامیہ میں ان کی حیثیت عرفی کیا تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ محاصرہ کے دنوں میں ایک مرتبہ حضرت سعد بن ابی وقاص امیر المومنین سے ملاقات کر کے واپس جا رہے تھے کہ راستے میں باغیوں کے سرغنہ عبدالرحمٰن بن عدیس، اشتر نخعی اور حکیم بن جبلتہ سے مڈبھیڑ ہو گئی، حضرت سعد بن ابی وقاص نے انھیں دیکھتے ہی تالیاں بجائیں، انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور اس کے بعد کچھ فرمایا جس میں ایک جملہ یہ بھی تھا۔

واللہ ان امرا ھٰؤلاء رؤساءہ لامر سوء [۳] — خدا کی قسم! جس تحریک کے سربراہ یہ لوگ ہوں وہ یقیناً بدترین تحریک ہوگی!

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۲۰۶

[۲] طبقات ج ۳ ص ۴۶

[۳] ایضاً ص ۵۰

غور کرنا چاہیئے کہ اس صورت میں ایک خلیفۂ منتخب اور مسلمۂ عام وخاص امیرالمومنین کا فرض منصبی کیا اس کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا جس کو عثمان ذوالنورین نے اختیار فرمایا۔ حضرت سعد نے ان لوگوں کے متعلق جو فرمایا وہ اس شعر کا مصداق تھا:

اذا کان الغراب دلیل قوم

سیھدیھم طریق الھالکینا!

ترجمہ: کوا اگر کسی قوم کا رہنما بن جائے تو وہ ان لوگوں کو ہلاکت کے راستے پر ہی چلائے گا۔

ذاتی حالات وصفات

حُلیہ حضرت عثمان کے نام ونسب اور خاندان کا ذکر آچکا ہے۔ اب آپ کے ذاتی حالات و سوانح اور فضائل وشمائل کا ذکر کیا جاتا ہے۔ آپ کا حلیہ یہ تھا: آپ کا رنگ سفید تھا جس میں کچھ زردی کی آمیزش تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چاندی اور سونا دونوں کو مخلوط کر دیا گیا ہے۔ خوب صورت اور خوش قامت تھے، دونوں ہاتھوں کی کلائیاں خوش منظر تھیں، بال سیدھے تھے یعنی گھنگریلے نہیں تھے، جب عمامہ زیب سر کر لیتے تھے بڑے حسین و جمیل نظر آتے تھے، ناک ابھری ہوئی، جسم کا حصہ اسفل بھاری پنڈلیوں اور دونوں بازوؤں پر بال کثرت سے، سینہ چوڑا چکلا، کاندھوں کی ہڈیاں بڑی بڑی، چہرہ پر چیچک کے کچھ نشانات، دانت ہموار اور خوب صورت، جن کو سونے سے باندھا گیا تھا، داڑھی بڑی گنجان، زلف دراز، اخیر عمر میں زرد خضاب کرنے لگے تھے، جسم کی کھال ملائم اور باریک تھی، بڑھاپے میں پیشاب کی بیماری ہو گئی تھی، اس لیے ہر نماز کے واسطے وضو کرتے تھے [1]

---

[1] حلیہ سے متعلق کوئی چیز کسی کتاب میں ہے اور کوئی کسی کتاب میں، ہم نے (باقی صفحہ ۔ پہ)

لباس بڑے پیمانہ پر تجارت کے باعث دولت مند شروع سے ہی تھے، اس لیے فاما بنعمۃ ربک فحدث کے حکم کے مطابق اللہ کی نعمتوں سے استفادہ آپ کی طبیعت کا شیوہ تھا. چنانچہ لباس بھی عمدہ قسم کا استعمال کرتے تھے. اس زمانہ میں یمنی چادریں بہت وسیع اور قیمتی سمجھی جاتی تھیں، آپ انھیں اوڑھتے تھے، عموماً یہ چادریں زرد رنگ کی ہوتی تھیں اور ان کی قیمت سو درہم کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ صحابۂ کرام عام طور پر اپنی بیویوں کو عمدہ اور خوب صورت لباس پہناتے تھے. حضرت عثمان بھی اس کا اہتمام کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے ایک ریشمین چادر دو سو درہم میں خریدی اور فرمایا: یہ نائلہ کے لیے ہے، وہ اسے اوڑھیگی تو میں خوش ہوں گا۔[1]

غذا غذا بھی عمدہ قسم کی اور پر تکلف استعمال کرتے تھے. آپ پہلے فرماں روا تھے جن کے لئے آٹا چھانا جاتا تھا. عرب میں ایک خاص قسم کا سالن ہوتا تھا جسے خزیرہ کہتے تھے، اس کو بکری کی کلیجی، گردہ اور دل اور گھی و دودھ سے تیار کیا جاتا تھا، حضرت عثمان کو اس کا بہت شوق تھا. عمرو بن امیہ الضمری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں حضرت عثمان کے ساتھ طعام شب میں شریک تھا، خزیرہ سامنے آیا تو حضرت عثمان نے پوچھا: کیسا ہے؟ میں نے کہا: بہت لذیذ اور نفیس ہے، میں نے آج تک ایسا خزیرہ نہیں کھایا۔ اس پر حضرت عثمان بولے: اللہ تعالیٰ عمر بن الخطاب پر رحم فرمائے، تم نے خزیرہ کبھی ان کے ساتھ بھی کھایا ہے؟ میں نے جواب دیا: جی ہاں! میں نے کھایا ہے، لیکن وہ خزیرہ ایسا تھا کہ نہ تو اس میں گوشت تھا اور نہ گھی اور دودھ. حضرت عثمان نے فرمایا: تم سچ کہتے ہو، عمر رضی اللہ عنہ نے جہد و مشقت

(بقیہ حاشیہ) مندرجہ ذیل کتابوں کو سامنے رکھ کر یہ حلیہ مرتب کیا ہے: طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۵۹، البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۹۲، طبری ج ۴ ص ۱۰۴، العقد الفرید ج ۴ ص ۲۸۴

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۰

کی ایسی زندگی بسر کی ہے کہ اس کی پیروی کرنا مشکل ہے، وہ لذیذ و نفیس غذاؤں سے اجتناب کرتے تھے۔ "میں اللہ کی قسم مسلمانوں کے مال سے ایک پیسہ نہیں لیتا۔ جو کچھ کھاتا ہوں اپنی کمائی سے کھاتا ہوں، تم کو معلوم ہے کہ میں قریش میں سب سے زیادہ مال دار تھا اور میرا تجارتی کاروبار سب سے بڑا تھا۔ میں ہمیشہ نرم غذاؤں کا عادی رہا ہوں، اور اب تو میری عمر بھی زیادہ ہوگئی ہے، اس لیے مجھ کو نرم غذاؤں کی اور بھی ضرورت ہے، میں نہیں سمجھتا کہ کسی شخص کو اس معاملہ میں مجھ پر نکتہ چینی کا حق ہے۔ عرب میں ایک اور کھانا جسے دَرمک کہتے تھے بہت نفیس ہوتا تھا۔ یہ بھی طرح طرح کے عمدہ گوشتوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ حضرت عثمان اسے بھی شوق سے تناول فرماتے تھے۔[۱]

سادگی باایں ہمہ مزاج میں بڑی سادگی تھی، اس میں کسی قسم کے تکلف یا تصنع کو ہرگز کوئی دخل نہ تھا۔ شب میں تہجد کی نماز کے لیے اٹھتے تو وضو کا پانی خود لیتے تھے کسی نے کہا: آپ کسی خادم سے کام کیوں نہیں لیتے؟" فرمایا: آخر! رات تو آرام کرنے کے لیے ان کے واسطے بھی ہے"[۲] حسن بصری سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے حضرت عثمان کو دیکھا کہ مسجد میں اپنی چادر کا تکیہ بنائے سو رہے تھے۔ اسی حالت میں دو سقے لڑتے ہوئے آگئے تو آپ نے وہیں ان کا فیصلہ کر دیا۔[۳]

رقّتِ قلب نہایت رقیق القلب تھے، ان کے غلام ہانی کا بیان ہے کہ حضرت عثمان جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ ریشِ مبارک تر ہو جاتی تھی۔[۴]

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۴۰۱

[۲] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۱

[۳] ایضاً و طبری ج ۴ ص ۴۱۸

[۴] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۱۰

جود و سخا جود و سخا آپ کی طبیعت کا جوہر خاص تھا۔ اسلام کے لیے اور فی سبیل اللہ آپ نے جس عالی حوصلگی سے خرچ کیا وہ تو آپ کی کتاب فضائل کا ایک روشن باب ہے ہی، اس کے علاوہ بھی لوگوں کی مالی امداد و اعانت کرنا آپ کا شیوہ خاص تھا۔ حضرت عمر کا معمول تھا کہ جس کسی عامل یا والی کی دولت کو اس کی آمدنی سے زیادہ پاتے تھے اس سے مقاسمہ یعنی بٹائی کر لیتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے ابوسفیان اور عتبۃ بن ابی سفیان سے بٹائی کر کے کچھ رقم لے لی تھی اور اس کو بیت المال میں داخل کر دیا تھا۔ حضرت عثمان جب خلیفہ ہوئے تو اس رقم کو واپس کرنا چاہا مگر ان دو بزرگوں نے رقم واپس لینے سے انکار کر دیا[1]

حضرت عثمان آئے دن لوگوں کو کھانے پر مدعو کرتے رہتے تھے لیکن ان کو امارات کا مکلف کھانا کھلاتے اور خود گھر میں جا کر سرکہ یا زیتون کا تیل تناول فرما لیتے تھے[2]

حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی حضرت عمر کے زمانے سے بحرین و عمان کے گورنر چلے آرہے تھے، حضرت عثمان نے بھی ان کو اس عہدہ پر باقی رکھا، لیکن ۲۹ھ میں انہیں معزول کر دیا اس کے بعد وہ بصرہ میں قیام پذیر ہو گئے، علاوہ ازیں عثمان بن ابی العاص کا مکان مدینہ میں مسجد نبوی سے متصل تھا۔ حضرت عثمان نے جب مسجد نبوی میں توسیع کا ارادہ کیا تو عثمان بن ابی العاص کا مکان مسجد میں ضم کر دیا۔ اور اب معزولی اور مکان دونوں کی تلافی حضرت عثمان نے یہ کی کہ بصرہ میں ایک بڑی جائداد اراضی جو مورخین کے اندازے کے مطابق دس ہزار جریب[3] تھی عثمان بن ابی العاص الثقفی کو ہبہ کر دی اور اس کے لیے ایک پروانہ

---

[1] العقد الفرید ج ۱ ص ۹۴

[2] کتاب صفۃ الصفوہ ج ۱ ص ۱۱۷

[3] ایک جریب کم و بیش ڈیڑھ سو مربع گز کے برابر ہوتا ہے۔

لکھ دیا، اس پروانہ میں عثمان بن ابی العاص الثقفی کو خطاب کر کے تحریر کیا گیا تھا: "یہ اراضی اور جائداد میں نے تم کو اس مکان کے عوض دی ہے جو مدینہ میں توسیع مسجد نبوی کے لیے میں نے تم سے لیا تھا اور جس کو امیر المومنین عمر نے تمہارے لیے خریدا تھا، اس جائداد اور اراضی کی جتنی قیمت تمہارے مکان کی قیمت سے زیادہ ہو اس کو میری طرف سے اپنی معزولی کے مکافات سمجھو۔"[1]

حیاء

حضرت عثمان کی ذات پیکر محامد و فضائل اخلاق تھی۔ لیکن حیا کا وصف معاصرین و رفقا میں طغرائے امتیاز تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ ازراہ بے تکلفی آپ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کا زانو کھلا ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ آئے مگر آپ اسی طرح بیٹھے رہے لیکن جب حضرت عثمان آئے تو آپ نے زانوئے مبارک کو ڈھانپ لیا۔[2] لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو ارشاد فرمایا: "کیا میں اس شخص سے حیاء نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیاء کرتے ہیں"۔[3]

انس بن مالک کہتے ہیں: ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

اصدق امتی حیاءً عثمان — میری امت میں حیا میں سب سے زیادہ سچا عثمان ہے

بنانہ حضرت عثمان کی ایک بیوی کی باندی تھی، اس کا بیان ہے کہ حضرت عثمان کے غسل سے فراغت کے بعد جب میں ان کے کپڑے لیکر حاضر ہوتی تھی تو مجھ سے فرماتے: میرے جسم کی طرف مت دیکھنا، یہ تمہارے لیے جائز نہیں ہے۔[4]

---

[1] معجم البلدان یاقوت حموی ج ۵ ص ۲۶۶، پروفیسر خورشید احمد فاروقی نے اپنی کتاب حضرت عثمان کے سرکاری خطوط (ص ۱۴۰) میں اس جائداد کے حدود اور اس کی تفصیلات مع حل لغات نقل کیے ہیں۔

[2] کتاب المناقب باب فضائل عثمان بن عفان (باقی صفحہ ۔۔ پر)

گفتگو کا انداز حضرت عثمان فطرتاً کم سخن اور کم گو تھے، لیکن جب کسی موضوع پر اظہار خیال فرماتے تو گفتگو سیر حاصل کرتے اور بلیغ کرتے تھے، عبدالرحمن بن حاطب کا بیان ہے کہ اس وصف میں میں نے ان کا کوئی ہمسر نہیں دیکھا۔[۱]

دقیقہ سنجی طبیعت دقیقہ سنج واقع ہوئی تھی۔ کوئی خاص منظر یا کوئی خاص چیز دیکھتے تو اس سے حکیمانہ نکتہ پیدا فرماتے اور لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرتے تھے، ایک مرتبہ آپ منبر مسجد پر مسلمانوں کو افریقیہ (بلاد مغرب) کی فتح کی خبر سنانے کے لیے بیٹھے تو چونکہ حضرت عبداللہ بن زبیر خود اس معرکہ میں شریک تھے اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے آپ کو ہی یہ خوش خبری سنانے کے لیے مدینہ بھیجا تھا اور وہ اس وقت مسجد میں موجود تھے، اس لیے امیرالمومنین نے ان سے فرمایا "تم کھڑے ہو اور مژدۂ فتح سناؤ" عبداللہ بن زبیر نے تعمیل حکم کی، عبداللہ بن زبیر حضرت اسماء کے صاحبزادہ اور اپنے نانا حضرت ابوبکر صدیق سے صورت و شکل میں بہت مشابہ تھے اس لیے حضرت عثمان کی نگاہ ان پر پڑی تو مجمع سے خطاب کر کے فرمایا: لوگو! تم ان عورتوں سے نکاح کیا کرو جو اپنے والدوں اور بھائیوں پر ہوا کریں، میں ابوبکر صدیق کی اولاد میں سے کسی بچہ کو عبداللہ بن زبیر سے زیادہ ان کے ساتھ مشابہ نہیں پاتا۔[۲]

مدینہ پہونچ کر حضرت اوس بن ثابت انصاری کے مہمان ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دونوں میں مواخات بھی کرادی لیکن جب آنحضرت

(بقیہ حاشیہ)

[۳] کنزالعمال ج ۱۵ ص ۵۵

[۴] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۱

[۱] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۳۹

[۲] البیان والتبیین للجاحظ ج ۱ ص ۲۱۰

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور مسجد کے لیے ایک قطعہ آراضی خرید فرمایا تو اس کے قریب ہی حضرت عثمان کے لیے ایک قطعہ منتخب فرمایا۔ یہ درجہ اس درجہ قریب تھا کہ حضرت عثمان کے گھر کی ایک کھڑکی مسجد نبوی کے اس دروازہ کی طرف کھلتی تھی جس سے حضور آتے جاتے تھے[1]

اپنے عہدِ خلافت میں اسی مکان کی توسیع کر کے اسے ایک محل بنا دیا تھا جو مدینہ کی دوسری عمارتوں سے ممتاز تھا۔ مسعودی کے بیان کے مطابق یہ مکان پتھر اور چونے سے تعمیر کیا گیا تھا اس کے دروازے شیشم اور عرعر کی لکڑی سے بنے تھے، اور اس محل کے علاوہ مدینہ میں حضرت عثمان کے باغات اور چشمے بھی تھے[2] مسجد نبوی کی پشت پر گلی کے دوسری طرف ایک مکان کے دروازہ پر اب بھی ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس پر "شہید سیدنا عثمان" کندہ ہے۔

مسجد نبوی کی تعمیر میں شرکت

حضرت عثمان کو مدینہ آنے کے بعد سب سے پہلے ایک اہم شرف یہ حاصل ہوا کہ جب مسجد نبوی کی تعمیر شروع ہوئی تو حضرت عثمان بھی اس میں ایک معمار تھے، حضرت عائشہ سے روایت ہے، فرماتی ہیں، مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو پہلا پتھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھایا اور اس کی جگہ رکھا۔ دوسرا پتھر حضرت ابوبکر نے اٹھایا اور اسی طرح رکھا، اب حضرت عثمان کی باری تھی۔ انھوں نے بھی یہی کیا (ایک دوسری روایت جو مسند ابو یعلی میں ہے اس میں حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمر کا بھی نام ہے) حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں نے یہ دیکھا تو بولی: اے اللہ کے رسول! آپ دیکھ رہے ہیں، یہ دونوں کس طرح آپ کی مدد کر رہے ہیں! ارشاد گرامی ہوا: ہاں اے عائشہ! یہی تو میرے بعد میرے خلیفہ ہونے والے ہیں[3]

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳

[2] مروج الذہب ج ۲ ص ۳۴۱

[3] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۹۶ و ۹۷

مسجد نبوی کی عمارت میں اضافہ

کچھ دنوں کے بعد یہ مسجد ضرورت کے لیے ناکافی اور مختصر ہوگئی تو مسجد کے قریب ہی ایک قطعہ زمین تھا جس میں اس کا مالک کھجوروں کا ذخیرہ رکھتا تھا[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایما ہوا کہ اس قطعہ کو خرید کر اسے مسجد میں شامل کیا جائے۔ حضرت عثمان کو اس کا علم ہوا تو پیش قدمی کر کے ۲۰ یا ۲۵ ہزار درہم میں یہ قطعہ خرید لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر کی، آپ نے خوش ہو کر فرمایا: تم اس کو ہماری مسجد میں شامل کردو اجرہ لک۔ اور اس کا ثواب تم کو ملے گا[2]

تجارت

حضرت عثمان کا اصل ذریعۂ معاش تجارت تھا اور اس میں ان کا تجربہ بڑا وسیع اور پختہ تھا۔ چنانچہ دوسرے تجارت پیشہ مہاجرین، مثلاً حضرت ابوبکر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف وغیرہ ہما کی طرح آپ نے بھی مدینہ کے مشہور اور بڑے بازار سوق بنو قینقاع میں کھجور کی تجارت اعلیٰ پیمانہ پر شروع کردی[3] اللہ تعالیٰ نے اس میں بھی وہ برکت عطا فرمائی کہ وہ جلد ہی مدینہ کے بڑے دولت مندوں اور رئیسوں میں شمار ہونے لگے لیکن ان کی دولت اسلام کی خدمت اور کارہائے خیر کے لیے وقف تھی،

بیر رومہ کی خریداری

مدینہ آنے کے بعد مہاجرین کو میٹھے پانی کی بڑی تکلیف تھی، شہر بیر رومہ کے نام سے ایک کنواں جس کا پانی شیریں تھا لیکن قبیلۂ بنو غفارہ کا ایک شخص اس کا مالک تھا اور وہ اس پانی کی ایک مشک ایک مُد (تقریباً دو سیر) اناج کے بدلہ میں بیچتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو فرمایا:

---

[1] روایت میں لفظ مِرْبَد آیا ہے، مربد اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں اونٹ باندھے جاتے ہیں اور اس کا اطلاق اس جگہ پر بھی ہوتا ہے جہاں کھجور کا اسٹاک رکھا جاتا ہے۔

[2] البدایہ والنہایۃ ج ۷ ص ۱۷۷، یہ روایت مسند امام احمد بن حنبل کی ہے۔ (باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

دیکھیں! بیر رومہ کون خریدتا اور اسے مسلمانوں کے لئے وقف کرتا ہے، اسے جنت ملے گی، حضرت عثمان نے پھر پیش قدمی کی اور ۳۵ ہزار درہم میں اسے خرید کر وقف عام کر دیا۔[۱]

سلامت فطرت

حضرت عثمان طبعاً سلیم الفطرت تھے، چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ کہ میں نے عہد جاہلیت میں بھی نہ کبھی شراب پی۔ نہ کبھی گانے بجانے میں شریک ہوا اور نہ کبھی زنا کا ارتکاب کیا۔[۲] طبری میں اس پر اضافہ یہ بھی ہے کہ "میں نے کبھی قتل بھی نہیں کیا۔

دینی خودداری اور حمیت

اسلام نے اس فطرت کو چمکا کر مجلی اور مصفی کر دیا تھا۔ اس بناء پر دینی عزت نفس اور خودداری آپ میں اس درجہ کی تھی کہ نازک سے نازک موقع پر بھی آپ میں لچک پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ابن سیرین کی مجلس میں حضرت عثمان کا ذکر آیا تو ایک شخص بولا: "انھیں تو لوگ برا بھلا کہتے ہیں" ابن سیرین نے فرمایا: ہائے افسوس! لوگ اس شخص کے حق میں بدکلامی کرتے ہیں جس کی اسلام میں پختگی کا عالم یہ تھا کہ ہجرت حبشہ کے موقع پر مہاجرین نجاشی کے روبرو ہوئے تو سب نے باستثنائے حضرت عثمان ملک کے دستور کے مطابق نجاشی کو جھک کر سلام کیا، جسے سجدہ تعظیمی کہتے ہیں، بادشاہ حبش نے حضرت عثمان سے ان کے ایسا نہ کرنے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: "میں اللہ رب العزت کے سوا کسی دوسرے کے سامنے سر خم نہیں کر سکتا۔"[۳]

عبادت

عبادت قربت الٰہی اور انابت الی اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس لیے اپنے چند در چند مشاغل اور گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود عبادت

بقیہ حاشیہ

[۱] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۶۲

[۲] صحیح بخاری ج ۲ باب فی الشرب۔ ونیز باب اذا وقف ارضا او بیرا۔ (باقی صفحہ ۔ پر)

کثرت سے کرتے اور فرائض و واجبات کے علاوہ مندوبات و نوافل کا بھی اہتمام کرتے تھے حضرت عثمان کے خاندان کی ایک جاریہ رہیمہ کا بیان ہے کہ آپ صائم الدہر اور قائم اللیل تھے. اول شب میں سوتے تھے [۱] قرآن مجید سے آپ کو بڑا شغف اور عشق تھا، بعض اوقات ایک شب میں اور ایک رکعت میں پورے قرآن کی تلاوت کر جاتے تھے، عبد الرحمان بن عثمان کا بیان ہے. ایک مرتبہ میں نے (غالباً حج کے موقع پر) مقام ابراہیم کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنی شروع کردی اور وہ اتنی دراز کردی کہ یہ خیال ہوا اب اس میں مجھ سے کون سبقت لے جائے گا! اتنے میں اچانک ایک شخص آیا، اس نے میرے ٹھونگا مارا تو میں نے پروا نہیں کی، پھر جب اس نے دوبارہ ایسا کیا اور اب میں نے دیکھا تو یہ شخص حضرت عثمان تھے، میں فرط ادب سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور حضرت عثمان وہاں کھڑے ہو گئے. آپ نے ایک ہی رکعت میں قرآن پڑھ ڈالا اور واپس چلے گئے، یہی روایت عطا بن ابی رباح سے ہے مگر اس میں اتنا اضافہ ہے کہ حضرت عثمان نے یہ رکعت منفرداً نہیں پڑھی تھی بلکہ ایک جماعت کی اس میں امامت کی تھی، نیز یہ کہ یہ ایک رکعت وتر کی تھی. اور اسی وجہ سے اس کا نام بتیرا (دم بریدہ) تھا[۲]

(بقیہ حاشیہ) حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ رومہ پہلے صرف ایک چشمہ تھا حضرت عثمان نے خریدنے کے بعد اسے کھودا، اس کی توسیع کی اور اسے ایک بڑا کنواں بنا دیا اسی طرح روایت کے مختلف الفاظ میں تطبیق پیدا ہو جاتی ہے

[۲] کنز العمال ج ۱۵ ص ۲۹

[۳] ایضا

[۱] ایضا

[۲] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۵۳

نماز بے حد خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے، اس میں اس درجہ محویت ہوتی تھی کہ گردوپیش کی کوئی خبر نہیں رہتی تھی، چنانچہ عین اس موقع پر جب کہ محاصرہ کے دنوں میں باغیوں نے قصرِ خلافت کے دروازوں کو آگ لگا دی تو حضرت عثمان اس وقت نماز پڑھ رہے تھے اور انھوں نے سورہ طٰہٰ پڑھنی شروع کی تھی۔ باہر شوروغل ہو رہا تھا لیکن آپ سب سے بے خبر کمال طمانیت و یکسوئی کے ساتھ نماز میں مشغول رہے پھر اسی عالم میں دارو گیر میں نماز ختم کی تو قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف ہو گئے۔ یہاں تک کہ شہادت کا واقعہ پیش آگیا[۱]

شہادت کے بعد حضرت حسان بن ثابت نے جو مرثیہ لکھا تھا اس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

ضحوا باشمط عنوان السجود به　　یقطع اللیل تسبیحاً و قرآناً[۲]

ترجمہ:۔ ظالموں نے ایک ایسے معمر بزرگ کو ذبح کر دیا جن پر سجدہ کا نشان تھا اور جو پوری شب تسبیح اور قرآن خوانی میں کاٹ دیتا تھا:

ادب واحترام نبوی

شمع رسالت کے پروانے سب ہی تھے اور حضرت عثمان کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ شرف دامادی رکھتے اور خود محبوب حبیب خدا تھے۔ لیکن اس کے باوجود ادب واحترام نبوی کا عالم یہ تھا کہ جس ہاتھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی تھی اس سے عمر بھر عضو خاص کو مس نہیں کیا[۳]۔ ایک مرتبہ حضرت عمر نے اپنی صاحبزادی حفصہ سے نکاح کرنے کی پیش کش کی تو حضرت عثمان نے اس کو صرف اس لئے منظور نہیں کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گوشہ خاطر اس طرف تھا اور حضرت عثمان کو اس کا علم تھا[۴]۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش سے بات چیت کرنے کی غرض سے آپ مکہ گئے تو وہاں آپ کے لیے موقع تھا کہ طواف کعبہ سے سرفراز ہوں اور قریش نے آپ کو اس کی

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۳۸۹

[۲] البدایۃ والنہایۃ ج، ص ۲۱۵　　(باقی صفحہ ۔ پر)

اجازت دے بھی دی تھی لیکن حضرت عثمان کی حب وادب نبوی نے گوارا نہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ کا داخلہ ممنوع ہو اور وہ خود تن تنہا طواف مکہ کر آئیں، اس عشق ومحبت اور ادب و احترام نبوی کا ہی یہ نتیجہ تھا جیسا کہ آپ پڑھ آئے ہیں جب مدینہ کے حالات سخت تشویش انگیز ہو گئے تو امیر معاویہ نے امیر المومنین کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ شام تشریف لے چلیں اور اگر یہ گوارا نہ ہو تو انھیں اجازت دیں کہ قصر خلافت کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ بھیج دیں؛ لیکن حضرت عثمان نے ان دونوں صورتوں کو یہ کہہ کر نامنظور کر دیا تھا "کہ میں نہ کسی قیمت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب چھوڑ سکتا ہوں اور نہ یہ گوارا کر سکتا ہوں کہ مدینہ میں فوج اس درجہ کثیر آجائے کہ اس کی وجہ سے شہر رسول کے رہنے والوں کو اشیائے خورد ونوش کی تنگی محسوس ہو

اتباع سنت

عشق ومحبت اور ادب واحترام نبوی کی وجہ سے ہر معاملہ میں مقدور بھر اتباع سنت کا اہتمام کرتے اور اگر کوئی پاس ہوتا تو اسے جتا بھی دیتے تھے تاکہ دوسروں کو ترغیب ہو. چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عثمان مسجد میں وضو کے لیے بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں حمران بن ابان آپ کے لیے پانی لائے. حضرت عثمان نے خوب اچھی طرح وضو کیا اور جب فارغ ہو گئے تو فرمایا:

رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم توضأ وھو فی ھذا المجلس فاحسن الوضوء [۳]	میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی چوکی پر بیٹھ کر اسی طرح خوب اچھی طرح وضو کرتے دیکھا ہے.

(بقیہ حاشیہ) [۱] کنز العمال ج ۱۵ ص ۲۸

[۲] الضیاص ۲۵ وص ۴۹

[۳] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول اللہ یا ایہا الناس ان وعد اللہ حق

ایک مرتبہ حج کے موقع پر آپ مزدلفہ میں فروکش تھے، فجر کی نماز کے وقت روشنی کافی پھیل گئی تو حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: اگر امیرالمومنین اس وقت منی کے لیے روانہ ہو جائیں تو یہ عین سنت کے مطابق ہوگا، حضرت عثمان یہ سنتے ہی ادہر کے اس سرعت سے چل پڑے کہ راوی کا بیان ہے،

فما ادری اقولہ کان اسرع ام دفع عثمان، فلم یزل یلبی حتی رمی جمرۃ العقبۃ یوم النحر[1]

مجھے نہیں معلوم کہ عبداللہ بن مسعود کا قول پہلے تھا یا حضرت عثمان کی یکلخت روانگی! حضرت عثمان قربانی کے دن رمی جمرۃ العقبی کرنے تک برابر تلبیہ کرتے رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ کبھی مسجد میں استراحت فرماتے تو پاؤں پر پاؤں رکھ کر لیٹتے تھے، سعید بن المسیب کا بیان ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان بھی مسجد میں اسی طرح لیٹتے تھے[2]

ایک مرتبہ وضو سے فارغ ہو کر مسکرائے، لوگوں نے اس موقع پر مسکراہٹ کا سبب پوچھا تو فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دفعہ وضو کے بعد اسی طرح تبسم کرتے ہوئے دیکھا ہے[3] ایک مرتبہ مسجد کے ایک دروازہ پر بیٹھ کر بکری کا پٹھا منگوایا، اسے تناول فرمایا اور تجدید وضو کے بغیر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، فراغت کے بعد ارشاد ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک مرتبہ اسی جگہ بکری کا پٹھا نوش جان کیا تھا اور پھر وضو کئے بغیر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے تھے:[4]

---

[1] بخاری کتاب الحج باب متی یصلی الفجر بجمع۔

[2] بخاری کتاب کتاب الصلوۃ باب ا فی المسجد

[3] مسند امام احمد بن حنبل ج ا ص ۵۸

[4] ایضاً ص ۶۲

ایک دفعہ حج کے موقع پر حضرت عثمان اور ایک اور صحابی ساتھ طواف کر رہے تھے صحابی نے طواف کرتے کرتے رکن یمانی کا بوسہ لیا، حضرت عثمان نے ایسا نہیں کیا تو انھوں نے حضرت عثمان کا ہاتھ پکڑ کر ان سے بھی استلام کرانا چاہا۔ اس پر حضرت عثمان نے پوچھا کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکن یمانی کا بوسہ لیتے دیکھا ہے؟ وہ بولے: نہیں۔ آپ نے فرمایا: تو پھر کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سب سے بہتر نہیں ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں بیشک![1]

ارشادِ نبوی کا ادب واحترام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ساتھ پروانہ وار عشق ومحبت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اگر حضور نے کبھی کوئی بات اشارۃً وکنایۃً بھی فرمائی ہے تو حضرت عثمان نے اس کو امر محکم کی طرح گرہ میں باندھ لیا ہے اور اس کی بجاآوری کو اپنا وظیفۂ زندگی سمجھا ہے اس کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ باغیوں کا اصل مطالبہ خلافت سے دست برداری کا تھا۔ اور ذاتی طور پر حضرت عثمان کے لیئے اس میں راحت اور آسائش بھی تھی۔ لیکن آپ نے جان دے دی اور اس مطالبہ کو محض اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان سے اس فتنہ کی پیش گوئی کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ فتنہ پسند ہزار مطالبہ کریں، لیکن خلافت کی جو قمیص اللہ نے ان کو پہنائی ہے اسے وہ ہرگز نہ اتاریں[2] ان کا خود ارشاد ہے کہ جب سے میرے ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے مس ہوئے ہیں میں نے اپنے ہاتھ سے محل

---

[1] ایضاً ص ۷۰ و ۷۱

[2] ملاحظہ کیجیے صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل عثمان بن عفان، ابن سعد ج ۳ ص ۴۲ و ۴۳ و البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۲۰۶

نجاست کو مس نہیں کیا، ایک شخص نے حضرت عثمان سے کہا "آپ لوگوں میں سب سے زیادہ خوب صورت ہیں" آپ نے فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرکے فرمایا "ایسے تو بس آپ ہیں" ۱؎

معاملات کی صفائی

معاملہ کے نہایت صاف تھے، فریق ثانی کی دلجوئی کا برابر خیال رکھتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے کسی شخص سے زمین خریدی۔ مالک بہت دنوں تک قیمت لینے نہیں آیا، ایک روز وہ کہیں مل گیا اور حضرت عثمان نے کہا: "تم اپنی زمین کی قیمت لینے نہیں آئے؟" تو اس شخص نے کہا: مجھ کو زمین کی فروختگی میں دھوکا ہوا ہے، لوگ مجھے برا بھلا کہتے ہیں۔ بیع اگرچہ ختم ہو چکی تھی اور اب بائع کو ارض مبیعہ کے واپس لینے کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن بایں ہمہ حضرت عثمان نے فرمایا اگر ایسا ہے تو تم کو اختیار ہے، اپنی زمین واپس لے لو یا اس کی قیمت لو۔" اس کے بعد یہ حدیث پڑھی: اللہ تعالیٰ اس شخص کو جنت میں داخل کرے گا جو صلح پسند اور نرم خو ہوگا خواہ اس کی حیثیت مشتری کی ہو یا بائع کی، فریاد رس کی ہو یا فریاد کرنے والے کی ۲؎

تقویٰ وطہارت

تقویٰ وطہارت آپ کا جوہر ذاتی تھا، فواحش ومنکرات کا کیا ذکر مکروہات تک سے آپ کو طبعی نفرت تھی، سلیمان بن موسیٰ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان چند لوگوں کے ہاں مدعو تھے۔ لیکن یہ مجمع ایک ناپسندیدہ مشغلہ (غالباً گانا بجانا) میں مبتلا تھا۔ لیکن حضرت عثمان جب وہاں پہونچے تو یہ سب لوگ منتشر ہو چکے تھے۔ آپ کو اس امر قبیح کا علم ہوا تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان لوگوں سے سامنا نہیں ہوا اور بطور کفارہ کے ایک غلام آزاد کیا ۳؎

۱؎ انساب الاشراف ج ۵ ص ۹

۲؎ البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۲۱۶

۳؎ صفۃ الصفوۃ، علامہ جوزی ج ا ص ۱۱۶

تنخواہ نہ لینا خلیفہ ہونے کے بعد اگرچہ آپ کا تمام وقت امور خلافت کی انجام دہی میں گذرتا تھا اور اب اپنے کاروبار کی نگرانی نہیں کر سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود آپ بیت المال سے تنخواہ نہیں لیتے تھے، چنانچہ جیسا کہ ابھی عمرو بن امیہ ضمیری کے بیان میں گزرا۔

عتق رقبہ غلام آزاد کرنا اسلام میں ایک بڑی عبادت اور عظیم کار ثواب ہے حضرت عثمان اس کا بھی بڑا اہتمام کرتے تھے۔ ایک روایت جو کنز العمال (ج ۱۵ ص ۲۸) میں ہے اس میں خود حضرت عثمان کی زبان سے منقول ہے کہ آپ جب سے مسلمان ہوئے تھے ایک غلام سالانہ آزاد کرتے تھے۔ لیکن البدایہ والنہایہ (ج ۷، ص ۲۱۰) میں ایک روایت ہے کہ حضرت عثمان ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے تھے، اور اگر کسی جمعہ میں ایسا نہیں کر سکتے تھے تو اگلے جمعہ کو ایک ساتھ دو غلام آزاد کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک دونوں روایتوں میں تناقض نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے ایک غلام سالانہ آزاد کرنے کا معمول ہو، کیونکہ ابتداً غلاموں کی قلت تھی اور بعد میں جب جاری اور غلاموں کی کثرت ہو گئی تو ایک غلام فی ہفتہ آزاد کرنے کا معمول ہو گیا۔

علم و فضل

علم وفضل میں بھی حضرت عثمان کا ایک ممتاز مقام تھا. عہد جاہلیت میں وہ ان چند نمایاں لوگوں میں شمار ہوتے تھے جو کتابت یعنی لکھنا پڑھنا جانتے تھے. اسی بنا پر اسلام کے بعد آپ کو کتابت وحی کا شرف حاصل ہوا.

کتابت وحی

ام کلثوم بنتِ ثمامہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان کے متعلق جب چہ می گوئیاں زیادہ ہونے لگیں تو ایک دن میں نے حضرت عائشہ سے اس کا ذکر کیا اور ان کے بارے میں ام المومنین کی ذاتی رائے دریافت کی، انھوں نے فرمایا "میں نے خود عثمان کو اس گھر میں دیکھا ہے کہ رات کا وقت ہے، گرمی کا موسم ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہورہی ہے جس کی وجہ سے آپ حسب معمول سخت گرانی محسوس کر رہے ہیں، اسی حالت میں حضرت عثمان آپ کے حکم سے وحی لکھ رہے ہیں، اپنا یہ مشاہدہ بیان کرنے کے بعد ام المومنین نے فرمایا: "ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس درجہ قرب و اختصاص کا شرف اللہ تعالیٰ اسی شخص کو عطا فرما سکتا ہے جو اعلےٰ اخلاق وصفات کا

انسان ہو[1]

قرأت قرآن

حضرت عثمان کو قرآن مجید سے بڑا شغف اور عشق تھا، آپ کثرت سے اس کی تلاوت ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ آپ اس کی تجوید و قراءت کے بھی ماہر تھے، چنانچہ عبداللہ بن عامر الیحصبی جن کی کنیت ابوعمران تھی اور جو قراء سبعہ میں اور تابعین کے پہلے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں انھوں نے تجوید و قرأت کا فن حضرت عثمان سے ہی سیکھا تھا[2] قرآن مجید کے حافظ تو تھے ہی، لیکن کثرت تلاوت و مزاولت کے باعث حال یہ تھا کہ گفتگو کرتے خطبہ دیتے، یا کسی کے نام کوئی خط لکھتے تو بے ساختہ قرآن کی آیات کا حوالہ دیتے جاتے، یہاں تک کہ طبری نے عام مسلمانوں کے نام حضرت عثمان کا ایک طویل مکتوب نقل کیا ہے جو از اول تا آخر قرآن کی آیات سے ہی مرتب ہوا ہے[3]

کلام الٰہی سے اس درجہ عشق اور شغف تھا، ایک مرتبہ فرمایا: اگر ہمارے دل بالکل پاک و صاف ہوجائیں پھر بھی ہم اپنے رب کے کلام سے سیر نہیں ہوں گے، ایک مرتبہ خود اپنے متعلق فرمایا: خدا نہ کرے مجھ پر کوئی دن ایسا گزرے جس میں میں نے قرآن کی تلاوت نہ کی ہو[4] علامہ ذہبی لکھتے ہیں

وھوا فضل من قرأ القرآن علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم[5]

حضرت عثمان ان سب حضرات سے افضل ہیں جنھوں نے قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا ہے۔

---

[1] کنز العمال ج ۱۵ ص ۲۴۴

[2] کتاب الفہرست للندیم تحقیق رضا تجدد ص ۳۱

[3] جلد ۳ ص ۴۰۷، ۴۰۸

[4] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۷ ص ۲۱۵

[5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹

حدیث قرآن کے بعد مرتبہ حدیث کا ہے، حضرت عثمان کو اس سے بھی بڑا شغف اور عشق تھا، اگرچہ اکابر صحابہ کی طرح از راہ ورع وتقویٰ آپ روایت کم کرتے تھے[1] تاہم آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث روایت کی ہیں محدثین نے ان کی تعداد ۱۴۶ بیان کی ہے، جن کو حضرت عثمان سے ان کے صاحبزادوں آبان، سعید اور عمرو اور آپ کے موالی حمران، زید، ابو سہلتہ ابو صالح اور ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں نے روایت کی ہے[2] ان روایات میں تین متفق علیہ ہیں یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں مذکور ہیں، اور آٹھ روایات صرف بخاری اور پانچ صرف مسلم میں ہیں، اسی بنا پر صحیحین میں آپ کی ۱۶ روایات مندرج ہیں۔

فقہ حضرت عثمان کو فقہ میں جو درک تھا اس کی وجہ سے ان کا شمار فقہائے صحابہ میں ہوتا تھا اور جیسا کہ آپ پڑھ آئے ہیں اسی لیے وہ شیخین کے عہد میں مجلس افتاد شوریٰ کے رکن رکین رہے، خصوصاً علم فرائض میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ ابن شہاب الزہری فرماتے تھے، حضرت عثمان اور زید بن ثابت کے انتقال کے بعد اب فرائض کا ایسا جاننے والا کوئی اور نہیں رہا[3]۔ یہی حال علم المناسک کا تھا۔ صحابۂ کرام میں حضرت عثمان اور عبداللہ بن عمر اس فن کے سب سے بڑے ماہر تسلیم کئے جاتے تھے[4]۔

---

[1] چنانچہ صحیح بخاری (کتاب الوضوء باب الوضوء ثلاثاً ثلاثاً) میں ہے کہ حضرت عثمان نے ایک مرتبہ لوگوں کو وضو کر کے دکھایا اور پھر اس سلسلے میں ایک حدیث پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد یہ بھی فرمایا، اگر میں کتمان حق کے جرم کا مرتکب نہ ہوتا قرآن میں جس پر وعید آئی ہے تو یہ حدیث میں تم سے بیان نہ کرتا۔

[2] علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے نام لکھے ہیں۔

[3] کنز العمال ج ۱۵ ص ۲۸

[4] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۱

اجتہادات فقہ حضرت عثمان کا شمار اگرچہ اکابر مجتہدین صحابہ میں نہیں ہوتا، تاہم مجتہد آپ بھی تھے اور کتب تاریخ سیر میں آپ کے مجوزہ احکام و مسائل مذکور ہیں مثلاً

(۱) آپ کی رائے تھی کہ اگر کسی شخص کو کوڑوں کی سزا دی گئی ہے اور اس نے توبہ بھی کر لی ہے تو اس کی شہادت معتبر ہوگی۔[۱]

(۲) گزر چکا ہے کہ حضرت عمر کے انتقام میں ان کے فرزند عبیداللہ نے ہرمزان کو قتل کر دیا تھا تو اس معاملہ میں حضرت علی کے مشورہ کے خلاف حضرت عثمان نے دیت کا حکم دیا اور وہ بھی خود قاتل کی طرف سے ادا کی۔[۲]

(۳) مجامعت بغیر انزال کی صورت میں وضو کر لینا کافی ہے، غسل کی ضرورت نہیں ہے۔[۳]

(۴) بنید کا پینا مباح تھا، لیکن حضرت عثمان کے عہد میں لوگ کثرت سے نشہ آور چیزوں کا استعمال کرنے لگے تھے اور بہانہ یہ تھا کہ بنید پی رہے ہیں۔ امیرالمومنین نے پہلے تو اس پر تنبیہ کی، مگر جب یہ کارگر نہ ہوئی تو لوگوں سے مشورہ کیا اور ان کی رائے کے مطابق بنید پینے پر کوڑوں کی سزا کا اعلان کر دیا۔[۴]

(۵) حضرت عمر فاروق کے عہد میں گم شدہ اونٹوں کے متعلق دستور یہ تھا کہ ان کو سرکاری چراگاہوں میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ وہاں وہ پلتے بڑھتے رہتے تھے۔ حضرت عثمان نے اس کے لیے قاعدہ یہ مقرر کیا کہ گم شدہ اونٹ کی تشہیر کی جائے پھر اگر اونٹ کا مالک نہ آئے تو اس کو فروخت

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۲۷۷

[۲] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۷۵

[۳] بخاری کتاب الوضوع باب من لم یرالوضوء، ومسند ابوعوانہ ج ۱ ص ۲۸۷ [۴] طبری ج ۴ ص ۳۹۸

[۵] موطا امام مالک بیروت اڈیشن ص ۵۳۸

کر کے اس کی قیمت کو بیت المال میں داخل کر دیا جائے اور اس کے بعد اگر مالک آ جائے تو اونٹ کی قیمت اس کے حوالے کر دی جائے۔

(۶) ربیع بنت معوذ کا بیان ہے: ایک مرتبہ میں نے اپنے شوہر سے کہا "میرے پاس جو چیز بھی ہو وہ مجھ سے لے لو اور اس کے بدلہ میں میرا پیچھا چھوڑ دو" شوہر نے کیا کیا! میرا بستر تک مجھ سے لے لیا، اب میں شکایت لے کر حضرت عثمان کے پاس آئی تو آپ نے فرمایا: تم نے خود ہی تو کہا تھا: میری ہر چیز لے لو۔ "الشرط املک" اور شوہر سے کہا: اس کی سب چیزیں لے لو۔[۱]

(۷) اگر کسی آبادی میں کوئی شخص مقتول پایا جائے اور اصل قاتل کا پتہ نہ چلے یعنی کوئی گواہ نہ ہو تو جس شخص پر شبہ نہ ہو اس سے اور اس کے اہل خاندان میں سے پچاس لوگوں سے حلف لیا جائے۔[۲]

(۸) زبیر بن عوام نے ایک غلام خریدا اور آزاد کر دیا۔ اس غلام کے ایک حرہ عورت کے بطن سے چند بیٹے تھے، زبیر بن عوام نے جب غلام کو آزاد کر دیا تو انھوں نے دعوی کیا کہ غلام کے بیٹے ان کے موالی ہوں گے، لیکن ان لڑکوں کی ماں کے موالی نے کہا کہ یہ لڑکے ان کے موالی ہوں گے۔ حضرت عثمان کے سامنے یہ قضیہ پیش ہوا تو آپ نے فیصلہ زبیر کے حق میں دیا۔[۳]

(۹) پہلے جمعہ کی نماز میں ایک اذان اور ایک اقامت کا رواج تھا۔ لیکن حضرت عثمان کے عہد میں آبادی کی کثرت ہو گئی اور بہت پھیل گئی تو آپ نے مقام زوراء میں ایک اور

---

[۱] سیر اعلام النبلاء الذہبی ج ۳ ص ۱۳۲

[۲] طبری ج ۴ ص ۲۷۲

[۳] موطا امام مالک ص ۵۵۶

اذان کا اضافہ کیا اور صحابہ کرام نے اس سے اتفاق کیا [۱]

(۱۰) صلوٰۃ جمعہ کے خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منبر کی جس سیڑھی پر بیٹھتے تھے حضرت ابوبکر ازراہ عنایت ادب واحترام اس سیڑھی سے نیچے والی سیڑھی پر ہی بیٹھنے لگے تھے اس کے بعد حضرت عمر کا عہد آیا تو آپ ایک اور سیڑھی نیچے اتر آئے، لیکن حضرت عثمان نے یہ خیال کر کے کہ یہ سلسلہ کہاں تک چلے گا پھر اسی سیڑھی پر بیٹھنا شروع کر دیا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے [۲] اور غور سے دیکھئے تو اس میں حضور پر نور کے ساتھ عشق ومحبت بیکراں اور جذبۂ اتباع سنت کو بھی دخل ہے۔

(۱۱) قتل خطا کی صورت میں جو دیت واجب ہوتی تھی۔ اس میں اونٹ دینے کا حکم تھا۔ حضرت عثمان نے اس میں سہولت یہ پیدا کی کہ اونٹوں کی قیمت ادا کرنے کی بھی اجازت دیدی [۳]

(۱۲) حج کی ایک قسم تمتع ہے جس میں حج اور عمرہ کے لیے احرام الگ الگ باندھا جاتا ہے، حضرت عثمان کی رائے تھی کہ یہ اس زمانے کے لئے تھا جب کہ دشمن کا خوف ہوتا تھا۔ اب چونکہ خوف نہیں رہا ہے اس لیے تمتع کی ضرورت نہیں ہے، حضرت علی کی رائے اس کے خلاف تھی [۴]

(۱۳) منیٰ میں دو رکعتیں پڑھنے یعنی قصر کا معمول تھا اور حضرت عثمان خود بھی خلافت کے اولیں دور میں ایسا ہی کرتے تھے، لیکن آخر زمانہ میں آپ اتمام صلوٰۃ کرنے لگے، لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا: میں نے مکہ میں گھر بنا لیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ سفر میں قصر کرنا حضرت عثمان کے نزدیک رخصت تھا نہ کہ عزیمت، اس کو تفصیل سے ہم

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجمعہ باب التاذین عند الخطبہ،

[۲] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۴۸

[۳] کتاب الخراج قاضی ابویوسف، مصر ص ۱۹۲

[۴] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۶۱ و صحیح مسلم کتاب الحج باب جواز التمتع

پہلے بیان کر آئے ہیں۔

(۱۴) حضرت عثمان پر بعض لوگوں کا اعتراض یہ بھی تھا کہ عہد رسالت اور اس کے بعد عہد شیخین میں گھوڑے ہمیشہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ رہے، لیکن خلیفہ ثالث نے اس پر بھی زکوٰۃ لگا دی۔[1]

اس سلسلے میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:

"اول تو حضرت عثمان کی نسبت یہ روایت متواتر نہیں ہے اور یہ ثابت نہیں ہے کہ انھوں نے گھوڑوں پر زکوٰۃ لگا دی تھی۔[2] لیکن اگر یہ صحیح بھی ہو تو ہم اس کی یہ تاویل کریں گے کہ عہد رسالت اور عہد شیخین میں گھوڑوں کی تعداد کم تھی اور دوسری طرف اسلامی لشکروں کو ان کی سخت ضرورت تھی کوئی اگر پالتا بھی تھا تو جہاد کی نیت سے پالتا تھا۔ اس لیے گھوڑے زکوٰۃ سے مستثنیٰ تھے، لیکن حضرت عثمان کے عہد میں فتوحات کی کثرت و وسعت کے باعث جب دولت و ثروت کی ریل پیل شروع ہوئی اور اب لوگ گھوڑے تجارت یا شان و شوکت کی غرض سے رکھنے لگے تو ان پر بھی زکوٰۃ لگا دی گئی۔[3] پھر یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ عہد شیخین میں گھوڑوں پر زکوٰۃ نہیں تھی۔ بلکہ حضرت عمر نے سب سے پہلے گھوڑوں پر زکوٰۃ لگائی تھی۔

(۱۵) حالت احرام میں نکاح کرنا اکثر صحابہ کے نزدیک جائز ہے۔ لیکن حضرت عثمان کے نزدیک ناجائز تھا۔ فرماتے تھے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح

---

[1] انساب الاشراف بلاذری ج ۵/ ص ۲۶

[2] اسی بات کو پروفیسر خورشید احمد فارق، دہلی یونی ورسٹی اسی طرح لکھتے ہیں: "یحییٰ بن آدم قرشی مولف کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف کتاب الخراج، ابو عبید قاسم بن سلام مولف کتاب الاموال، امام شافعی مولف کتاب الام، مولف امام مالک مولف الموطا میں سے کسی نے اس بات کی توثیق نہیں کی کہ عثمان غنی نے گھوڑوں کی زکوٰۃ وصول کی حضرت عثمان کے سرکاری خطوط ص ۸۰

[3] الفتنۃ الکبریٰ: عثمان ص ۱۸۰

سنا ہے [۱]

(۱۲) اگر کسی شخص نے کسی سے قرض لیا. لیکن مقروض اس کو ادا کرنے سے پہلے دیوالیہ ہوگیا، اس حالت میں اگر قرض خواہ زبردستی مقروض کی کسی چیز پر اس کے بحکم سرکار دیوالیہ ہونے سے پہلے قبضہ کرلے تو یہ اس کے لیے جائز ہوگا یا نہیں ؟ اس میں فقہا کے درمیان کافی اختلاف ہے، لیکن حضرت عثمان کا فیصلہ یہی تھا کہ صاحب حق کو اس کا اختیار تھا، اس لیے یہ جائز ہے، اسی طرح مثلاً کسی شخص نے اپنی کوئی چیز کسی شخص کے ہاتھ بیعت کی، لیکن مشتری قیمت ادا نہیں کرسکا یہاں تک کہ وہ دیوالیہ بھی ہوگیا، اب اگر بائع مشتری کے دیوالیہ ہونے سے پہلے کسی دن اس کے گھر پہنچا اور وہاں سے اپنی فروخت کردہ چیز اٹھا لایا تو حضرت عثمان کے نزدیک یہ بھی جائز تھا. سعید بن المسیب اس کے راوی ہیں. امام بخاری نے حضرت عثمان کا یہ فیصلہ ترجمۃ الباب میں نقل کیا ہے، اور پھر اسی کے مطابق حسب معمول حدیثیں لائے ہیں. ساتھ ہی فرمایا ہے کہ حضرت عثمان کا جو فیصلہ تھا اس پر فقہائے مدینہ کا اتفاق تھا [۲]

مرض الموت میں طلاق

اگر کوئی شخص مرض الموت میں بیوی کو طلاق دے تو یہ طلاق واقع ہوگی یا نہیں ؟ اس میں اختلاف ہے. ائمہ ثلاثہ یعنی امام ابوحنیفہ امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا تھوڑے تھوڑے فرق سے اس پر اتفاق ہے کہ طلاق واقع نہیں ہوگی اور شوہر کی وفات کے بعد مطلقہ بیوی کو میراث میں حصہ ملے گا، اس کے برخلاف امام شافعی اور علامہ ابن حزم ظاہری کی رائے یہ ہے کہ مریض مرض الموت اور ایک تندرست آدمی، ان دونوں کی طلاق میں کوئی فرق نہیں ہے یہ طلاق واقع ہوگی اور مطلقہ کو

---

[۱] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۶۸

[۲] صحیح بخاری کتاب فی الاستقراض واداء الدیون باب اذا وجد مالہ عند مفلس۔

کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، اس مسئلہ میں حضرت عثمان کا فیصلہ وہی تھا جو ائمہ ثلاثہ کا مسلک ہے۔

چنانچہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ حبان بن منقذ انصاری نے جنھوں نے بنی ہاشم کے خاندان کی ایک خاتون ھند بنت ربیعۃ بن الحارث بن عبد المطلب سے نکاح کر لیا تھا، مرض الموت میں اپنی اس بیوی کو طلاق دے دی جو انصار سے تعلق رکھتی تھی، شوہر کی وفات کے بعد یہ معاملہ حضرت عثمان کے سامنے آیا تو آپ نے حضرت علی اور زید بن ثابت سے مشورہ کیا۔ دونوں نے رائے دی کہ اس طلاق کا اعتبار نہیں ہونا چاہیئے۔ حضرت عثمان نے اس سے اتفاق کیا اور میراث میں ہند بنت ربیعہ کے ساتھ انصاریہ کو بھی شریک قرار دیا اور ہند سے فرمایا: تمہارے چچازاد بھائی یعنی حضرت علی کا یہ فیصلہ ہے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے مرض الموت میں ایک بیوی کو طلاق بائنہ دی، لیکن حضرت عثمان نے حکم دیا کہ مطلقہ کو متوفی کی میراث میں سے اس کا حصہ دیا جائے۔ اس پر کسی شخص نے کہا: آپ کو تو معلوم ہے کہ عبد الرحمٰن بن عوف نے بیوی کو طلاق نہ مطلقہ کو ضرر رسانی کے ارادہ سے دی ہے اور نہ اس کا مقصد اللہ کے حکم سے فرار ہے۔ حضرت عثمان نے جواب دیا: اس حکم (یعنی مرض الموت میں طلاق کے باوجود مطلقہ کو میراث میں اس کا حصہ دلوانا) سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں ایک ایسا قانون بنا جاؤں جس کے باعث لوگ اللہ کے حکم سے فرار اختیار میں خوف محسوس کریں[1]

اکابر صحابہ میں اعتماد و اعتبار

حضرت عثمان کے تفقہ اور اجتہادی بصیرت کے باعث حضرت عثمان کی رائے اور ان کے فتوی کا اکابر صحابہ میں بڑا اعتبار و وقار تھا۔ ایک مرتبہ غسل سے متعلق ایک مسئلہ کے بارے میں کسی شخص نے

---

[1] المحلی ابن حزم ج ۱۰ ص ۲۱۸

حضرت عثمان سے استفسار کیا، اس کے بعد وہ شخص چند دوسرے صحابہ کے پاس گیا اور ان سے بھی وہی استفسار کیا تو سب کا جواب وہی تھا جو حضرت عثمان کا تھا۔[۱]

تحریر و خطابت

حضرت عثمان کو تحریر و تقریر دونوں میں بھی کمال حاصل تھا، ابن سعد کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ آپ کم سخن تھے، لیکن جب کسی موضوع پر بولنا شروع کرتے تھے تو اس کا حق ادا کرتے تھے، بیعت عامہ کے وقت آپ فراوانی جذبات اور خلافت کی ذمہ داریوں کے شدت احساس کے باعث کوئی طویل تقریر نہ کر سکے تھے لیکن اسی میں آپ نے ظاہر کر دیا تھا کہ اب نہ سہی! آئندہ تقریر و خطابت کے بہت سے مواقع آئیں گے، اس وقت دیکھا جائے گا، آپ کی تحریریں اور خطبات حدیث و تاریخ اور ادب کی کتابوں میں محفوظ ہیں، ان پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر المومنین کی تحریر ہو یا تقریر، اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کلام ماقل ودل کا مصداق ہوتا ہے، الفاظ مرصع، اور جملے کے جملے فصاحت و بلاغت کی جان اور نہایت موثر و دلنشیں ہوتے ہیں، پھر وعظ و تذکیر ان کا وصف خاص ہے۔

فرامین و مراسلات

حضرت عثمان نے مختلف لوگوں کے نام وقتاً فوقتاً جو فرامین یا مراسلات لکھے ہیں ان سب کو بڑی محنت و کاوش سے اردو کا جامہ پہنا کر ہمارے فاضل دوست پروفیسر خورشید احمد فارق صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے "حضرت عثمان کے سرکاری خطوط" کے نام سے مرتب کر دیا اور ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو شائع کیا ہے، ترجمہ کی زبان بڑی شگفتہ اور رواں ہے، پھر یہ فقط ترجمہ نہیں ہے بلکہ موصوف نے ایک فاضلانہ مقدمہ کے علاوہ جس میں اسلام کے ابتدائی عہد کی تاریخ نویسی پر بصیرت افروز تبصرہ ہے۔ ہر خط کا تاریخی پس منظر بھی تحقیق اور ژرف نگاہی سے بیان

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الغسل

کیا ہے، شروع میں حضرت عثمان کے مختصر حالات کے علاوہ آپ پر جو اعتراضات کئے جاتے تھے ان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، اگرچہ بعض ناقابل اعتبار روایات کی اساس پر لائق مرتب نے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کی نسبت جس رائے کا اظہار کیا ہے ہمارے نزدیک وہ صحیح نہیں ہے علاوہ ازیں بعض اور مقامات پر بھی جزوی طور پر اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بحیثیت مجموعی کتاب اردو میں حضرت عثمان پر جو لٹریچر موجود ہے اس پر ایک قابل قدر اضافہ ہے:

خطبات

ذیل میں ہم چند خطبات مع ترجمہ کے نقل کرتے ہیں، ان سے خطبات کی فصاحت و بلاغت، زور کلام، جوش بیان اور خلوص و اثر آفرینی کا اندازہ ہو گا۔

(۱) بعیت خلافت کے فوراً بعد جو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا ہے وہ یہ ہے:

اما بعد فانی قد حملت وقد قبلت، الا وانی متبع ولست بمبتدع، الا وان لکم علیّ بعد کتاب اللہ عز وجل وسنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثاً: اتباع من کان قبلی فیما اجمعتم علیہ وسننتم، وسن سنۃ اھل الخیر فیما لم تسنوا عن ملاء، والکف عنکم الا فیما استوجبتم، الا وان الدنیا خضرۃ قد شھیت الی الناس ومال الیھا کثیر منھم، فلا ترکنوا الی الدنیا ولا تثقوا بھا، فانھا لیست بثقۃ فاعلموا انھا غیر تارکۃ الا من ترکھا	حمد و صلوٰۃ کے بعد: مجھ پر خلافت کا بار لادا گیا ہے اور میں نے قبول کر لیا ہے۔ سن لو: میں پیروی کرنے والا ہوں، بدعت آفریں نہیں سن لو: قرآن مجید اور سنت نبوی پر عمل پیرا ہونے کے بعد تم سب لوگوں کے میرے اوپر تین حقوق ہیں (۱) ایک یہ کہ جن امور میں مسلمانوں کا اجماع ہے ان میں اپنے پیشروں کا اتباع (۲) دوسرا یہ کہ جن امور میں مسلمانوں کا اجماع نہیں ہے ان میں اہل خیر حضرات کے مسلک پر چلنا (۳) تیسرا حق یہ ہے کہ میں آپ پر دست درازی نہ کروں، بجز اس وقت کہ جب کہ اپنے کسی فعل کی وجہ سے آپ خود اپنے آپ کو اس کا مستحق نہ بنا دیں سن لو!

(طبری ج ۴ ص ۴۲۲)

دنیا ایک سبز پری ہے جو لوگوں کو مرغوب بنا دی گئی ہے اور بہت سے اس پر فریفتہ ہو گئے ہیں تم دنیا کی طرف نہ مائل ہو، نہ اس طرف جھکو، اور نہ اس پر بھروسہ کرو، کیونکہ وہ لائق اعتماد نہیں ہے اور یاد رکھو، دنیا بس اسی کا پیچھا چھوڑتی ہے جو اسے چھوڑ دے

(۲) ایک اور خطبہ جس کو آپ کا آخری خطبہ کیا گیا ہے یہ ہے:

ان اللہ عز وجل انما اعطاکم الدنیا لتطلبوا بہا الآخرۃ، ولم یعطکموہا لترکنوا الیہا، ان الدنیا تفنی والآخرۃ تبقی، فلا تبطرنکم الفانیہ، ولا تشغلنکم عن الباقیۃ فآثروا ما یبقی علی ما یفنی فان الدنیا منقطعۃ وان المصیر الی اللہ، اتقوا اللہ جل عز، فان تقواہ جنۃ من باسہ ووسیلۃ عندہ ولاذکروا من اللہ الغیر، والزموا جماعتکم، لاتصیروا احزابا، واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔

البدایہ والنہایہ ج ۷ ، ص ۲۱۵
وطبری ج ۴ ص ۴۲۲ و ۴۲۳

خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو دنیا اس لیے دی ہے کہ تم اس کے ذریعہ آخرت کا سامان کرو، اور اس لیے نہیں دی ہے کہ تم اس کے ہی ہو کر رہ جاؤ، بے شبہ دنیا فانی ہے اور آخرت غیر فانی، پس خبردار! کہیں تم فانی پر غرہ کر کے باقی رہنے والی چیز سے کنارہ کش نہ ہو جاؤ، پس باقی کو فانی پر ترجیح دو کیونکہ دنیا کا ساتھ چھوٹ جانے والا ہے اور انجام کار جانا خدا کی طرف ہی ہے، پس اللہ سے ڈرو، یہ خوف خدا ہی خدا کی پکڑ کے لیے سپر کا کام کرتا اور اس کے قرب کا ذریعہ بنتا ہے۔ لوگو! اللہ بڑا غیرت مند ہے اس سے ہوشیار رہو اپنی جماعت کا ساتھ نہ چھوڑو اور اپنی اپنی ٹولیاں الگ نہ بناؤ، قرآن، اللہ کی اس نعمت کو جو تم پر نازل ہوئی مت بھولو کہ اس وقت جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کی رحمت سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔

(۳) ایک اور خطبہ میں حمد و صلوٰۃ کے بعد آپ نے فرمایا:

انکم فی دار قلعۃ و فی بقیۃ اعمار فبادروا آجالکم بخیر ما تقدرون علیہ فلقد اتیتم صبحتم او مسیتم، الا وان الدنیا طویت علی الغرور فاعتبروا بمن مضی، ثم جدوا و لا تغفلوا، فانہ لا یغفل عنکم، این ابناء الدنیا واخوانہا الذین آثاروھا وعمروھا وتمتعوا بہا طویلا، الم تلفظھم! ارموا بالدنیا حیث رمی اللہ بہا، واطلبوا الآخرۃ، فان اللہ ضرب لہا مثلا وللذی ھو خیر فقال عزوجل ۔ واضرب لھم مثل الحیٰوۃ الدنیا کماء انزلناہ من السماء۔

طبری ج ۴ ص ۲۴۳

لوگو! تم سب چل چلاؤ کی منزل میں اپنی باقی عمریں پوری کرنے کے لیے ہو، بس جو مدت باقی رہ گئی ہے اس کو جہاں تک تمہارے امکان میں ہے اچھے کاموں میں بسر کرو، تم اس دنیا میں آئے، تم نے یہاں صبح کی شام کی، یاد رکھو دنیا ایک دھوکے کی ٹٹی ہے جو لوگ گذر گئے ان سے عبرت حاصل کرو، پھر جدوجہد کرو، غافل نہ بنو، کیونکہ تم سے غفلت نہ برتی جائیگی کہاں ہیں وہ دنیا کے فرزند اور اس کے بھائی بند جنھوں نے دنیا کو پسند کیا، اسے آباد کیا اور اس سے ایک طویل مدت تک لطف اندوز ہوئے کیا پھر دنیا نے ان کو باہر نکال نہیں پھینکا؟ تم بھی دنیا کو وہیں پھینک دو، جہاں خدا نے اس کو ڈال رکھا ہے اور طلب آخرت کرو، کیونکہ اللہ نے دنیا اور جو چیز اس سے بہتر ہے (یعنی آخرت) دونوں کی مثال ۔ واضرب لھم الآیۃ میں بیان کی ہے۔"

طبری کے بیان کے مطابق حضرت عثمان نے یہ خطبہ بیعت اہل شوریٰ کے بعد اور بیعت عامہ سے پہلے دیا ہے، اس خطبہ کے بعد ہی لوگوں نے آپ سے بیعت کرنی شروع کر دی، اور جب یہ بیعت ختم ہو گئی تو آپ نے وہ خطبہ دیا جس کا نمبر ایک ہے۔

ان خطبات سے اندازہ ہوگا کہ فصاحت و بلاغت، زور کلام اور جوش بیان کے علاوہ ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان میں مختلف اسالیب بیان سے بڑی قوت کے ساتھ

دنیا کی بے ثباتی بے اعتباری اور عالم آخرت کی بقاد پائداری کا ذکر بار بار اور بالالتزام کیا گیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ یہی اسلوب دعوت وتبلیغ اور ارشاد و ہدایت کے سلسلے میں قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا علاوہ ازیں بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ اور ابتلا یہی تھا کہ فتوحات کی کثرت اور اس کی وجہ سے دولت و ثروت کی بہتات اور افراط زر کے باعث قرن اول کے مسلمانوں کے برعکس اس زمانے کے لوگوں میں عام طور پر دنیا طلبی کا غلبہ آخرت کوشی پر ہونے لگا تھا۔ اور اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہی تھا جس طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بار بار متوجہ کرتے رہتے تھے، حضرت عثمان اول دن سے اس فتنہ کو محسوس کرنے لگے تھے اس بنا پر اپنے خطبات میں تشدد مد سے لوگوں کو اس سے باخبر کرنا آپ کے کمال دور اندیشی و حقیقت رسی کی دلیل ہے۔

لیکن ایک خلیفہ یا فرمانروا محض وعظ و تذکیر پر اکتفا نہیں کر سکتا اگر حالات ناسازگار ہوں اور تفہیم و تلقین بے اثر رہیں تو تہدید اور زجر و توبیخ سے کام لینا اس کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ملک میں جب شورش بڑھی اور نکتہ چینیوں نے خلافت پر زبان طعن دراز کرنی شروع کر دی تو امیر المومنین نے اس وقت جو خطبہ دیا اس کے تیور کچھ اور ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

ان لکل شئ آفۃ، وان لکل نعمۃ عاھۃ فی ھذا الدین عیابون ظنانون یظھرون لکم ما تحبونہ، ویسترون ما تکرھون، یقولون لکم وتقولون، طغام مثل النعام، یتبعون اول ناعق، احب مواردھم الیھم النازح، لقد اقررتم لابن الخطاب باکثر مما نقمتم علی ولکنہ وقمکم وقمعکم، وزجرکم زجر النعام، المخزمۃ، واللہ انی لاقرب ناصراً، واعز نفراً

بے شبہ ہر چیز کے لیے ایک آفت اور ہر نعمت کے لیے ایک آزمائش ہے اس دین میں ایسے لوگ بھی داخل ہیں جن کا کام ہی لوگوں میں کیڑے نکالنا اور ہوائی قلعے بنانا ہے، لوگو! یہ لوگ جب تمہارے سامنے آتے ہیں تو ایسی باتیں کرتے ہیں جن کو تم پسند کرتے ہو اور ان باتوں کو تم سے پوشیدہ رکھتے ہیں جنھیں تم ناپسند کرتے ہو، تم ہیں اور ان میں خوب گفت و شنید رہتی ہے، یہ لوگ

واقمن - ان تلت ھلمّ - ان تجاب دعوتی من عمر، ھل تفقدون من حقوقکم شیئاً فمالی لا افعل فی الحق ما اشاء؟ اذن فلم کنت اماماً

صبح الاعشی ج ۱ ص ۲۱۴ والبیان والتبیین ج ۱ ص ۲۰۰

شتر مرغ کی طرح بے مغز و بے دماغ ہیں، جوان کو پہلے بلاتا ہے اسی کے پیچھے ہو لیتے ہیں، ان کا سب سے پسندیدہ گھاٹ وہ ہے جو خشک ہو، آج میری جو چیزیں بری لگتی ہیں وہی چیزیں کثرت سے عمر و بن الخطاب نے کیں تو تم نے ان کو قبول کرلیا لیکن انھوں نے تم کو جھنجوڑا اور تم کو اس طرح ہنکایا جیسے ناک میں ڈلی ہوئی نکیل والے شتر مرغ کو ہنکاتے ہیں، خدا کی قسم! میرے پاس مددگار بھی زیادہ ہیں، اور لوگ بھی زیادہ معزز ہیں اور میں بہ نسبت عمر کے اس بات کا زیادہ مستحق ہوں کہ میری دعوت سنی جائے، کیا تمہارا کوئی حق ایسا ہے جو تم کو نہیں ملا؟ پھر مجھ کو یہ آزادی کیوں نہیں ہے کہ حق کے معاملہ میں جو چاہوں کروں! ورنہ تو میں امام کیوں ہونے لگا؟

شعر و شاعری عرب میں شعر و شاعری کا مذاق بچہ بچہ کی گھٹی میں پڑا تھا، حضرت عثمان اس سے کس طرح مستثنیٰ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ آپ کو اشعار کثرت سے یاد تھے موقع موقع سے آپ انھیں پڑھتے اور ان سے تمثیل کرتے تھے، ہشام بن عروہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان لوگوں میں سب سے زیادہ اشعار کے روایت کرنے والے تھے، ایک ایک موقع پر پانچ پانچ شعر ایک ساتھ پڑھ جاتے تھے۔[1]

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۸۰

ایک مرتبہ جب حضرت عثمان کے خلاف شورش بپا تھی آپ نے خطبہ دیا جس میں اہل مدینہ کو خبردار اور ہوشیار کیا، پھر کاشانۂ خلافت میں آکر یہ دو شعر مخالفوں کی اور اپنی تمثیل میں پڑھے:

انی عبید قد اتی اشیاعکم   عنکم مقالتکم وشعر الشاعر
فاذا اتتکم ھذہ فتلبسوا   ان الرماح بصیرۃ بالحاسر[1]

مسعودی کا بیان ہے کہ حضرت عثمان خود بھی شاعر تھے اور گفتگو یا تقریر میں اپنے اشعار بھی برمحل کثرت سے پڑھتے تھے، اتنے اشعار پڑھتے ہوئے کسی اور کو نہیں دیکھا۔[2] حضرت عثمان کے اشعار بھی وعظ و تذکیر سے پر ہوتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔

تفنی اللذاذۃ ممن نال صفوتھا   من الحرام ویبقی الاثم والعار
یلقی عواقب سوء من مغبتھا   لاخیر فی لذۃ من بعدھا النار

ترجمہ:- جو شخص حرام چیزوں سے لطف اندوز ہوتا ہے ان چیزوں کی لذت تو فنا ہو جاتی ہے، لیکن ان کا گناہ اور ننگ و عار باقی رہتے ہیں، لذتِ حرام کے غائب ہو جانے کے بعد اس کے نتائج بد فنا نہیں ہوتے، تو پھر اس لذت میں کیا بھلائی ہے جس کا انجام دوزخ ہو۔

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

غنی النفس یغنی النفس حتی یکفھا   وان عضھا حتی یضر بھا الفقر،
وما عسرۃ فاصبر لھا ان تتابعت   بباقیۃ الا سیتبعھا یسر[3]

ترجمہ:- نفس کی تونگری انسان کو بے پروا بنادیتی ہے، خواہ اس کو کیسی ہی تنگدستی

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۸۰
[2] مروج الذہب ج ۲ ص ۳۵۶
[3] زہر الآداب وثمر الالباب ابو اسحق الحصری القیروانی المتوفی ۴۵۳ھ ج ۱ ص ۷۲

ہو، کوئی تنگدستی ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں ہے، عسر کے بعد یسر، ضرور آتا ہے، اس لئے کیسی ہی تنگ دستی ہو اس پر صبر کرو،

ملفوظات فرامین و مراسلات اور خطبات کے علاوہ حضرت عثمان جو نجی گفتگو کرتے تھے اس میں بھی آپ کے ملفوظات فصاحت و بلاغت کی جان اور تلمیحات و کنایات سے پر ہوتے تھے، یہ ملفوظات تاریخ و ادب کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں، مثلاً ایک مرتبہ آپ نے محصور ہونے کے دنوں میں حضرت علی کو ایک پیغام بھیجا تو اس میں آپ نے نہایت فصیح و بلیغ اور پُر جوش و مؤثر عبارت میں فرمایا :

"آپ پر واضح ہونا چاہیئے کہ اب پانی سر سے اُونچا ہو گیا ہے اور اونٹ کے پالان کا تسمہ تھنوں کے پیچھے جا پڑا ہے (یہ دونوں عربی کے مشہور محاورے ہیں جو کسی نہایت سخت حادثہ کے پیش آجانے کے وقت بولے جاتے ہیں) وہ لوگ مجھے قتل کرنے کے درپے ہیں جو خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اے علی! اگر تم کسی بات سے عاجز نہیں ہو اور تم اپنی بات بہر حال منوا سکتے ہو۔ شریفوں کیلئے گھٹیا درجہ کے لوگوں سے عہدہ برآ ہونا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ تم میرے پاس آجاؤ تمہیں اختیار ہے کہ جس ارادے سے چاہو آؤ دوست بنکر یا دشمن، حامی بنکر یا مخالف۔" اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے ایک شعر لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے "اگر میری قسمت میں مقتول ہوتا ہے تو تم مجھ کو قتل کرو، ورنہ آکر مجھے بچا لو اس سے پہلے کہ میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاؤں۔"

اسمیں اختلاف ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو خط لکھا تھا یا ایک معزز قریشی کی معرفت خط سے ملتا جلتا پیغام بھیجا تھا جس میں مذکورہ بالا شعر بھی تھا۔ بہر حال اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کی جوہر فطرت میں فصاحت و بلاغت اور ولولہ انگیز خطابت کا جو ملکہ ودیعت تھا اس کا اظہار بیساختہ اُس موقع پر بھی ہوتا تھا جب کہ سخت جانی حادثہ سے دوچار ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے انسانوں کے ہوش و حواس خطا ہو جاتے ہیں۔

عظیم الشان دینی کارنامہ

"جمع قرآن"

اگرچہ اسلام میں ہر فعل جو احکام خداوندی کے ماتحت ہو اور جس کا مقصد حصول رضائے الٰہی ہو، دینی اور مذہبی فعل ہے اور اس لیے حضرت عثمان کے تمام کارنامے دینی کارنامے ہیں تاہم سب سے بڑا اور نہایت عظیم الشان دینی کارنامہ مصحف عثمانی کی ترتیب و تدوین ہے یہی وہ کارنامہ ہے جس کے باعث قرآن جیسا نازل ہوا تھا ویسا ہی ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا، اس کی تفصیل یہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت تک قرآن کتابی صورت میں مرتب و مدون نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کے اجزا منتشر اور متفرق تھے، خلافت صدیقی میں یمامہ میں مسیلمہ کذاب سے نہایت شدید جنگ ہوئی اور حفاظ و قراء کی ایک بڑی تعداد اس میں کام آگئی، یہ دیکھ کر حضرت عمر کو قرآن مجید کے ضائع ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوا اور آپ نے امیرالمومنین کو مشورہ دیا کہ وہ قرآن کی ترتیب و تدوین کرادیں چونکہ یہ کام عہد نبوت

میں نہیں ہوا تھا اس لیے حضرت ابوبکر کو شروع میں تامل تھا، لیکن پھر راضی ہو گئے اور نہایت اہتمام سے قرآن مجید کو کتابی شکل میں یکجا کر دیا، اس بنا پر قرآن کے جامع اول حضرت ابوبکر ہیں۔

لیکن حضرت عثمان کے عہد میں ایک اور فتنہ پیدا ہوا، اور وہ یہ کہ عرب میں بہت سے الفاظ کا تلفظ سب قبیلوں کا ایک نہیں تھا، بلکہ وہ مختلف تھے، جیسا کہ آج بھی ہے، اور ایک عربی پر کیا موقوف ہے، کم وبیش ہر زبان کا حال یہی ہوتا ہے، اس بنا پر اگرچہ قرآن کا نزول لغت قریش پر ہوا تھا جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تھی لیکن دوسرے قبائل کے لیے آسان نہ تھا کہ وہ اپنے قبائلی تلفظ کو ترک کر کے ان الفاظ کا تلفظ قریش کے تلفظ اور ان کے لہجہ کے مطابق کریں، اس مجبوری کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قبائل کو وقتی طور پر اجازت دے دی تھی کہ الفاظ متعلقہ کا تلفظ وہ اپنے اپنے لہجہ کے مطابق کریں، اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی تھی کہ بڑے شہروں میں قرآن مجید کا درس جو صحابہ کرام دیتے تھے تو وہ درس یا زبانی ہوتا یا ان ناتمام چند اجزا کے ذریعہ ہوتا جو ان صحابہ کے پاس لکھے ہوئے موجود ہوتے تھے پھر قبائل میں اختلاف صرف قرأت اور تلفظ الفاظ کا نہیں تھا۔ بلکہ خود الفاظ کا بھی تھا، یعنی ایک معنی اور مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ایک قبیلہ ایک لفظ استعمال کرتا تھا اور دوسرا قبیلہ دوسرا لفظ بولتا تھا۔ اس بنا پر کسی قبیلہ کے کسی فرد کو لغت قریش پر نازل شدہ کوئی لفظ نامانوس اور زبان پر ثقیل معلوم ہوتا تھا تو وہ بے تکلف اس لفظ کی بجائے اپنے قبیلہ کی زبان کا لفظ تلاوت کرنے لگتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک صورت یہ بھی تھی کہ کسی صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست یا کسی اور صحابی سے قرآن مجید کا کوئی جز سنا اور اپنے صحیفے میں اسے لکھ لیا، لیکن اسی جز میں کوئی لفظ بلغت قریش ایسا تھا جس کے معنی معلوم نہیں تھے اس لیے اپنے صحیفہ میں اس لفظ منزل من اللہ کے ساتھ ایضاح معنی کی غرض سے اپنی زبان کا ایک

لفظ بھی لکھ لیا؛ مثلاً عبداللہ بن مسعود کے صحیفہ میں سورہ القارعہ میں "العہن" کے ساتھ "القطن" بھی لکھا ہوا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اکثریت غالباً انھیں حضرات کی تھی جو قرآن کی تلاوت محض اپنی یاد سے کرتے تھے۔ اس بنا پر قبائل اور ان کی شاخوں کی عظیم اکثریت اور ان کے باہمی لغوی اور لہجاتی اختلافات کے پیش نظر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ پورے قرآن کی تلاوت میں کم وکیف کے اعتبار سے اختلافات کی نوعیت کیا ہوگی؛ خصوصاً اس وقت جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان اختلافات کے ساتھ تلاوت کرنے کی اجازت منقول بھی ہو؟! چنانچہ یہ سب اختلافات موجود تھے، لیکن شدت کے ساتھ ان کا ظہور فتح مکہ کے بعد ہوا جب کہ چند در چند قبائل مشرف باسلام ہوئے، انھوں نے نیا نیا قرآن پڑھنا شروع کیا اور ان کو خدمت نبوی میں رہنے اور مستند قراء صحابہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔

قرآن مجید کی قرأت اور اس کی وجہ سے کتابت میں جو عظیم اختلافات رونما ہوئے متعدد مصنفین نے ان پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، سات کتابوں کا ذکر ندیم[۲] نے کیا ہے،

---

[۱] حدیث: "انزل القرآن علی سبعۃ احرف" صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث میں اتنے مختلف طرق سے اور اس کثرت سے روایت ہوئی ہے کہ مشہور کے درجہ کو پہونچ گئی ہے، لیکن سبعۃ احرف سے مراد کیا ہے؟ اس میں نہایت شدید اختلاف ہے، علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں ۳۵ اقوال نقل کئے ہیں، اور پھر بھی فیصلہ نہیں کر سکے کہ کس قول کو قبول کیا جائے، چنانچہ کہتے ہیں کہ جس طرح آیات متشابہات ہوتی ہیں احادیث بھی ہوتی ہیں اور یہ حدیث انھیں احادیث متشابہات میں شامل ہے۔ اس سلسلے میں عرصہ ہوا راقم الحروف نے "سبعۃ احرف" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جس میں تمام اقوال وآرا پر نقد وتبصرہ کرنے کے بعد اصل مراد کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے واللہ اعلم بالصواب یہ مقالہ "نذر ڈاکٹر ذاکر حسین نئی دہلی" کتاب میں شائع ہو چکا ہے۔

[۲] کتاب الفہرست ص ۳۹

ان میں سے ایک کتاب ابن ابی داؤد السجستانی کی یورپ میں طبع ہو چکی ہے، اختلافات مصاحف پران مستقل اور مبسوط کتابوں کے علاوہ ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ (۲۱۳ - ۲۷۴ھ) نے تاویل مشکل القرآن[1] میں اور جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں بھی ان اختلافات کا ذکر کیا اور ان کے وجوہ واسباب پر گفتگو کی ہے، علاوہ ازیں یہ اختلافات صرف قرات کے نہیں تھے بلکہ قرآن مجید میں کمی بیشی کے بھی تھے، چنانچہ مصحف عبداللہ بن مسعود میں سورۂ فاتحہ اور معوذتین کا اندراج نہیں تھا اور اس کے برعکس مصحف ابی بن کعب میں دعائے قنوت بھی دو صورتوں کی شکل میں مندرج تھی۔ یہ اختلافات مدینہ، حجاز، کوفہ، بصرہ، عراق اور شام سب میں تھے، لیکن کچھ دبے دبے اور غیر نمایاں سے تھے، فوج میں چونکہ ملک کے مختلف حصوں کے لوگ سب ایک ساتھ نماز پڑھتے ہیں اس لیے اس نوع کے اختلافات سب سے زیادہ ایسی ہی جگہوں میں نمایاں ہو سکتے تھے، چنانچہ خلافت عثمانی میں ایسا ہی ہوا،

صحیح بخاری[2] کی روایت ہے: حذیفہ بن الیمان آذربائیجان اور ارمینیہ کی جنگ میں جس میں شام اور عراق کی فوجیں ایک ساتھ تھیں، شریک تھے، وہاں انھوں نے اختلاف قرات کا یہ ہولناک منظر دیکھا تو پریشان ہو گئے، حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: امیر المومنین! خدا کے لیے اُمت کی خبر لیجئے، قبل اس کے کہ قرآن مجید سے متعلق ان کے اختلافات ایسے ہی شدید ہو جائیں، جیسا کہ یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلافات ہیں؛ ظاہر ہے اتنا اہم اور عظیم الشان کام امیر المومنین خود اپنی رائے سے انجام دینے کی جسارت نہیں کر سکتے تھے، اس

---

[1] مطبوعہ دار التراث، قاہرہ

[2] کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن و کتاب البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر ج، ص ۲۱۷، ہم نے دونوں کتابوں کو سامنے رکھ کر یہ خاکہ مرتب کیا ہے۔

لیے آپ نے صحابہ کی مجلس شوریٰ طلب کی، جو کام آپ کرنا چاہتے تھے جب سب ارباب شوریٰ نے متفقہ طور پر اس کی تصویب اور تائید کر دی تو قرآن مجید کا ایک نسخہ جو حضرت ابوبکر کے عہد میں مرتب ہوا اور اب ام المومنین حفصہ کی ملک میں تھا۔ حضرت عثمان نے یہ نسخہ ام المومنین سے عاریتہً لیا اور ایک کمیشن مقرر فرما دیا جو ارکان ذیل پر مشتمل تھا۔

(۱) زید بن ثابت (۲) عبداللہ بن زبیر (۳) سعید بن العاص (۴) عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام، کمیشن کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ حضرت حفصہ کے مصحف کو بنیاد بنا کر قرآن مجید کا ایک نہایت مستند اڈیشن تیار کریں، اس کمیشن میں صرف زید بن ثابت انصاری تھے اور باقی تینوں ارکان نامور ان قریش تھے، اسی بناء پر حضرت عثمان نے کمیشن کو ہدایت کی کہ چونکہ قرآن مجید کا نزول زبان قریش پر ہوا ہے، اس لیے تینوں ارکان کو جہاں زید بن ثابت سے اختلاف ہو وہاں وہ اپنی قرآت کو ترجیح دیں، جب یہ اڈیشن تیار ہو گیا تو حضرت حفصہ کا مصحف واپس کر دیا گیا، اور یہ اڈیشن جس کا نام مصحف عثمانی ہے اس کی متعدد نقلیں تیار کرا کے انھیں مختلف شہروں میں بھیج دیا گیا کہ بس اس کو مستند مانا جائے اور اسی کے مطابق قرأت اور کتابت کی جائے اور مصحف عثمانی کے علاوہ جتنے مصاحف تھے اور جو دستیاب ہو سکے ان کو نذر آتش کرنے کا حکم دیا[۱]

حضرت عثمان کے اس اقدام کی اہمیت

نکتہ چینیوں نے حسب معمول اس پر بھی نکتہ چینی کی اور اسے مورد اعتراض قرار دیا اور دوسری طرف ہمارے مورخین و مصنفین اس واقعہ کا سرسری ذکر کر کے گزر گئے ہیں۔ فرض کیجیے، کسی آبادی میں نہایت شدید قسم کا طاعون پھیل پڑا ہے، قریب ہے کہ پوری آبادی اس کا شکار ہو کر لقمۂ اجل ہو جائے، لیکن اچانک ایک نہایت

---

[۱] مصحف عثمانی کے نسخوں کی تعداد میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک چار بعض کے ہاں پانچ تھے لیکن ابو حاتم نے سات نسخوں کا ذکر کیا ہے جو علی الترتیب مکہ، بحرین، یمن، شام، کوفہ اور بصرہ بھیجے گئے اور ایک نسخہ مدینے میں روک لیا گیا۔

قابل اور مخلص ڈاکٹر جو اس مرض کے علاج میں مہارت خاص بھی رکھتا ہے مع اپنے عملہ کے یہاں پہونچ جاتا ہے اور شب و روز کی محنت، ہمدردی اور خلوص سے کام کر کے وہ آبادی کو وبا کی زد سے بچالیتا ہے، اب دیکھیے اس صورت میں آبادی کے مرد و زن جو ڈاکٹر اور اس کے عملہ کی عظیم الشان خدمت کا براہ راست علم اور تجربہ رکھتے ہیں انھیں تو یقین کیا عین الیقین ہے کہ ڈاکٹر ان سب کا کتنا بڑا محسن ہے اور اس کے کارنامہ کی کیا اہمیت ہے، لیکن ظاہر ہے اس اہمیت کا احساس آئندہ نسل کے لوگوں کو اس درجہ کا نہیں ہوگا، کیونکہ ان کے آباؤ اجداد کے لیے جو چیز دیدہ تھی وہ ان کے لیے محض شنیدہ ہے، اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ، اس بنا پر حضرت عثمان کے اس کارنامہ کی اہمیت کا اندازہ کر لینے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اختلافات قرات کی نوعیت معلوم کر لی جائے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ طاعون کس غضب کا تھا۔

اختلافات قرأت کی نوعیت جو اختلافات شائع و ذائع تھے، ابن قتیبہ[۱] کے بقول اگر ان کا تفحص اور تجزیہ کیا جائے تو وہ حسب ذیل سات قسم کے ملیں گے:۔

(۱) لفظ کی صورت تو بعینہٖ ایک ہی رہتی ہے، مگر اعراب میں اختلاف ہے، اس اختلاف کا اثر معنی پر کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً سورۂ ھود میں: ھٰؤلاء بناتی ھنّ اطھر لکم اور اطھرَ بفتح الراء، سورۂ سبا میں: وھل نُجازی الا الکفور" میں وھل یُجازیٰ۔

(۲) لفظ کے اعراب اور اس کے حرکات میں ایسا اختلاف جس سے معنی بدل جائیں اگرچہ لفظ کی کتابت میں فرق نہ ہو، مثلاً سورۂ سبا میں: ربنا باعد بین اسفارنا" میں باعَدَ، سورۂ النور میں اذ تلقونه بالسنتکم: میں تلقونه، وادّکر بعد امّة (سورۂ یوسف) میں بعد امَہ۔

(۳) لفظ کے حروف میں اختلاف ہو، اگرچہ اعراب میں نہ ہو، اور اس اختلاف سے معنی بدل

---

[۱] تاویل مشکل القرآن ص ۲۶

جائیں: "وانظر الی العظام کیف نُنشِزُھا (سورہ بقرہ) میں نُنشِرُھا، حتیٰ اذا فزّع عن قلوبھم میں فرِّغ"

(۴) الفاظ مختلف ہوں، مگر معنی ایک ہوں مثلاً: ان کانت الا صیحۃ کی جگہ الا زقیۃ، یا کالعھن المنفوش کی جگہ کالصوف المنفوش۔

(۵) الفاظ مختلف ہوں اور ان کے معنی بھی مختلف ہوں، مثلاً وطلع منضود اور طلح منضود

(۶) تقدیم وتاخیر کا اختلاف ہو، مثلاً: وجاءت سکرۃ الموت بالحق اور وجاء سکرۃ الحق بالموت،

(۷) الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف: مثلاً وما عملت ایدیھم، اور وما عملتہ ایدیھم، اور ان اللہ ھو الغنی الحمید" اور ان اللہ الغنی الحمیدُ"

یہ اختلافات تو لفظوں میں محدود تھے، ان کے علاوہ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، مصاحف میں اختلاف سورتوں میں کمی بیشی تک کا تھا، پھر الفاظ کے تلفظ کا اختلاف بھی تھا مثلاً قبیلہ ہذیل کے لوگ حتی کو عتی بولتے تھے چنانچہ حتی حین کو عتی حین پڑھتے تھے، تعلمون اور نعلم میں اسدی کی قرات بکسر التاء یعنی تعلمون وتعلم" ہے، پھر ایک اختلاف یہ بھی تھا کہ عام قاعدہ کے مطابق انَّ، اَنَّ جو حروف بالفعل ہیں ان کا اسم منصوب ہوتا ہے مگر بعض قبیلے اسے مرفوع پڑھتے تھے، مثلاً: ان ھذان لساحران" اور انَّ ھٰذین لساحران۔

اس تفصیل اور تجزیہ سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اختلافات کتنے شدید تھے، اگرچہ قبائل کی سہولت اور آسانی کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداً قبائل کو اس کا اختیار دے دیا تھا کہ لغت قریش پر نازل شدہ کسی آیت میں اگر کوئی لفظ کسی قبیلہ کے لیے عسیر التلفظ یا عسیر الفہم ہو تو وہ اس کے بجائے اپنے قبیلہ کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں، لیکن ظاہر ہے یہ اجازت موقت ہی ہو سکتی تھی دائمی نہیں ہو سکتی، کیونکہ امر جنبی کے زمانے

کے احکام عارضی ہوتے ہیں، دائمی نہیں ہوتے، پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو اختلافات مروج تھے وہ سب وہ نہیں تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت یا آپ کے ارشاد "انزل القرآن علی سبعۃ احرف" کے تحت آتے ہیں، بلکہ وہ اختلافات بھی تھے جن کا باعث قاری کا نسیان، بھول چوک اور غیر شعوری طور پر قرآن کے الفاظ میں ردوبدل تھا۔

اب غور کیجیے، ایک طرف ایک نہایت عظیم و وسیع مملکت اسلامی ہے جس میں چند در چند قومیں جن میں عرب اور غیر عرب، بدوی اور حضری، عالم اور جاہل، مصلح اور مفسد، سب شامل ہیں ملی جلی آباد ہیں اور دوسری طرف مصاحف اور قرأت کے اختلافات کا یہ عالم ہے جس کا ابھی ذکر ہوا، ان سب کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ اگر ان اختلافات کو یوں ہی رہنے دیا جاتا تو قرآن کا حشر بھی وہی نہ ہوتا جو تورات اور انجیل کا ہوا، اس بنا پر کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ جمع قرآن کا کام انجام دے کر اسلام اور دین کی حضرت عثمان نے وہی خدمت انجام دی ہے جو حضرت ابوبکر نے مانعین زکوٰۃ، مرتدین اور مسلیمہ کذاب سے نہایت کامیاب جنگ کر کے اور پھر قرآن کی ترتیب و تدوین کر کے انجام دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کارنامۂ صدیقی کی طرح یہ کارنامۂ عثمانی بھی تتمہ اور تکملۂ کار نبوت کی حیثیت رکھتا ہے: علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔

من نظر فی تحریہ وقت امرہ بجمع القرآن علم مرتبتہ وجلالتہ، .... وھو افضل من قرأ القرآن علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم [1]	حضرت عثمان کے مرتبہ و مقام اور جلالت شان کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس کو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت کا احساس کر کے جمع قرآن کا حکم دیا، اور حضرت عثمان ان سب لوگوں میں افضل تھے جنھوں نے قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا تھا۔

جو مصاحف منسوخ کیے گئے تھے ان میں عبداللہ بن مسعود کا مصحف بھی تھا اس لیے

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹

وہ ابتدأ ناراض تھے، لیکن جب حضرت عثمان نے ان کو یقین دلادیا کہ انھوں نے جو اقدام کیا ہے وہ وقت کا ایک نہایت اہم اور ناگزیر مطالبہ تھا اور انھوں نے اسے تمام صحابہ کے مشورہ اور ان کی تائید سے کیا ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعود نے توبہ کی اور مخالفت ترک کردی [1]

غضب خدا کا! اتنا اہم اور عظیم الشان کارنامہ! دشمنوں نے مصاحف کے نذر آتش کردینے کو بہانہ بنا کر اسے بھی حضرت عثمان کا ایک جرم قرار دے دیا اور اپنے الزامات کی فہرست میں اس کا اور اضافہ کردیا۔ حضرت علی کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: اگر عثمان مصاحف کو نذر آتش نہ کرتے تو میں کرتا، لوگو! عثمان کی شان میں غلو کرنے سے بچو، تم کہتے ہو کہ عثمان نے مصاحف میں تحریف کردی، خدا کی قسم! انھوں نے جو کچھ کیا ہے صحابہ کرام کی رائے اور مشورہ سے کیا ہے، اگر میں حکمراں ہوتا تو اس معاملہ میں میں بھی وہی کرتا جو انھوں نے کیا [2]

ابن عساکر نے مشہور تابعی عبدالرحمن بن مہدی سے روایت کی ہے، فرماتے تھے کہ حضرت عثمان میں دو صفتیں ایسی ہیں جو ان کو شیخین پر بھی ترجیح دیتی ہیں۔ ایک ان کا صبر جس کا انجام شہادت ہوا اور دوسری صفت یہ ہے کہ انھوں نے پوری امت کو ایک قرآن پر جمع کردیا [3] علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

من مناقبه الکبار وحسناته العظیمة انه جمع الناس علی قراءة واحدة [4]

حضرت عثمان کی ایک بڑی منقبت اور ایک عظیم ترنیکی یہ ہے کہ آپ نے لوگوں کو ایک قرات پر جمع کردیا۔

علامہ جلال الدین سیوطی بھی لکھتے ہیں: حضرت عثمان امت میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی بیوی حضرت رقیہ، کے ساتھ ہجرت حبشہ کی اور پوری امت کو ایک قرأت قرآن پر جمع کردیا [5]

---

[1] البدایة والنہایة ج ۷، ص ۲۱۸ [2] ایضاً

[3] تاریخ الخلفا جلال الدین سیوطی تذکرہ حضرت عثمان

[4] البدایة والنہایة ج ۷، ص ۲۱۶ [5] تاریخ الخلفا تذکرہ حضرت عثمان

باب چہارم

فضائل ومناقب

علامہ ذہبی نے حضرت عثمان کی جامع کمالات واوصاف شخصیت کی عکاسی مختصر مگر بڑے بلیغ انداز میں کی ہے، فرماتے ہیں،

ابوعمرو والاموی ذوالنورین ومن تستحی منہ الملائکۃ ومن جمع الامۃ علی مصحف واحد بعد الاختلاف، ومن افتتح نوابہ اقلیم خراسان واقلیم المغرب، وکان من الصادقین القائمین الصائمین المنفقین فی سبیل اللہ، ومن شھد لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالجنۃ وزوجہ بابنتیہ رقیہ وام کلثوم (تذکرۃ الحفاظ تذکرہ عثمان)

عثمان ابوعمرو الاموی ذوالنورین تھے، ان سے فرشتوں کو بھی حیا آتی تھی، انھوں نے ساری امت کو ان میں اختلافات پڑجانے کے بعد ایک قرآن پر جمع کردیا، ان کے عہدہ داروں نے مشرق میں اقلیم خراسان اور مغرب میں مغرب اقصیٰ تک سب فتح کرڈالا وہ بالکل سچے اور کھرے، عابد شب زندہ دار، صائم النہار اور اللہ کے راستے میں بے دریغ خرچ کرنے والے تھے وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی ہے اور آپ نے اپنی دو صاحبزادیوں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم کا نکاح ان سے کیا تھا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمان سے محبت

اولین سابقین ومہاجرین میں سے ہونے اور اسلام کی خدمات جلیلہ کے باعث بارگاہ نبوت اور مجلس صحابہ میں حضرت عثمان کا جو مرتبہ ومقام تھا اس کے شواہد ودلائل کثرت سے موقع بہ موقع گذشتہ صفحات میں گذر چکے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے

لہ کنز العمال ج ۱۵ ص ۳۸

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طبعاً حضرت عثمان سے بڑی محبت تھی آپ ان کا بڑا لحاظ کرتے اور دلجوئی بھی فرماتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ام کلثوم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: فاطمہ کے شوہر (علی) میرے شوہر (عثمان) سے بہتر ہیں! آپ پہلے تو خاموش رہے۔ پھر ارشاد فرمایا:

زوجک یحبه الله ورسوله ویحب الله ورسوله، افرایتک لودخلت الجنة فرأیت منزله لم ترا احداً من الناس یعلوه فی منزله[۱]

بیٹی! تیرا شوہر تو وہ ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول دونوں محبت کرتے ہیں اور وہ بھی اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے، کیا تم کو یہ بات پسند نہیں کہ تم جنت میں داخل ہوگی تو تم دیکھوگی کہ وہاں تمہارے شوہر کا مکان سب لوگوں کے مکان سے اونچا ہے۔

ابو سعید الخدری کا بیان ہے، ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول شب سے طلوع فجر تک آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے یہ دعا فرماتے رہے: اے اللہ! میں عثمان سے خوش ہوں تو بھی اس سے خوش رہ۔[۲] حضرت جابر کی روایت ہے: ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کو گلے سے لگایا اور فرمایا: "انت ولی فی الدنیا ولی فی الاخرة" عثمان! تم دنیا میں بھی میرے ولی ہو اور آخرت میں بھی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت عثمان کے لیے ہاتھ اٹھاکر دعا کرتے تو آپ کے ہاتھ اتنے بلند ہو جاتے کہ آپ کی بغل کا نچلا حصہ ظاہر ہو جاتا تھا۔ اس طرح کسی اور کے لیے دعا مانگتے ہوئے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا[۳]

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلمہ کے گھر میں تھے کہ حضرت عثمان کی طرف سے خبیصة جو عرب کی محبوب غذا ہے بطور تحفہ آیا۔ حضور نے اسے دیکھا تو بے ساختہ

---

[۱] البدایة والنہایة ج ۷، ص ۲۱۳ وکتاب صفة الصفوة ابن جوزی ج ۱ ص ۱۱۴

[۲] البدایة والنہایة ج ۷، ص ۲۱۳ [۳] کنز العمال ج ۱۵ ص ۴۱

آسمان کی جانب دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی: اے اللہ عثمان تیری رضا کا طلب گار ہے، پس تو اس سے راضی ہو جا۔[1] اس غایت محبت اور تعلق خاطر کی وجہ سے اگر کوئی شخص حضرت عثمان سے بغض وعناد رکھتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے سخت کبیدہ خاطر ہو جاتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ایک صحابی کا جنازہ آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھنے سے انکار فرما دیا۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا تو ارشاد ہوا: کان یبغض عثمان فلم اصل علیہ " یہ شخص عثمان سے بغض رکھتا تھا، اس لیے میں نے نماز نہیں پڑھی۔[2]

قرآن میں حضرت عثمان کا ذکر

حضرت عثمان کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والہانہ محبت، ان کا غیر معمولی لحاظ اور توقیر خود حضرت عثمان کے خیر مجسم ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی بعض آیات میں بھی حضرت عثمان کی طرف تلمیح کی گئی ہے، عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ قرآن میں مندرجہ ذیل آیت حضرت عثمان کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

امن ھو قانت آناء اللیل ساجداً وقائما یحذر الاخرۃ ویرجو رحمۃ ربہ[3]

بھلا جو شخص رات کے اوقات تنہائی میں خدا کی بندگی میں لگا ہے کبھی اس کی جناب میں سجدہ کرتا ہے اور کبھی اس کے حضور میں دست بستہ کھڑا ہوتا۔ آخرت سے ڈرتا اور اپنے پروردگار کے فضل کا امیدوار ہے (کہیں ایسا شخص بندۂ نافرمان کے برابر ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت ہے جو عبداللہ بن عباس کے بیان کے مطابق حضرت عثمان کی شان میں نازل ہوئی تھی وہ آیت ہے:

ھل یستوی ھو ومن یامر بالعدل

کیا ایسا غلام اور وہ شخص دونوں برابر ہو سکتے ہیں

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۲۱۳ [2] کنز العمال ج ۱۵ ص ۳۰
[3] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۱

وھو علی صراط مستقیم[۱] جو لوگوں کو حد اعتدال پر قائم رہنے کو کہتا اور خود بھی اعتدال یعنی انصاف کے سیدھے راستہ پر قائم ہے۔

صحابہ کرام میں حضرت عثمان کا مرتبہ و مقام

ان وجوہ کی بناء پر تمام صحابہ کرام کا اس پر اتفاق تھا کہ شیخین کے بعد مرتبہ و مقام حضرت عثمان کا ہی ہے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں

کنا نخیر بین الناس فی زمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنخیر ابا بکر ثم عمر بن الخطاب ثم عثمان بن عفان[۲]

ہم عہد نبوی میں لوگوں کے طبقات اور مدارج بیان کرتے تھے تو حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان کو علی الترتیب درجۂ اعلیٰ میں رکھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر نے ایک اور روایت میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت ابوبکر کا مرتبہ و مقام سب سے اونچا جانتے تھے، اس کے بعد مرتبہ حضرت عمر کا اور پھر حضرت عثمان کا مانتے تھے اور اس کے بعد صحابہ میں تعادل و تفاضل نہیں کرتے تھے[۳]

یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص واقعات میں حضرت ابوبکر و عمر اور حضرت عثمان ایک ساتھ ہی بلا شرکتِ غیرے نظر آتے ہیں، مثلاً مندرجۂ ذیل دو حدیثیں دیکھیے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کی شہادت کی پیش گوئی بھی کی ہے۔

(۱) صحیح بخاری میں حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک باغیچہ میں داخل ہوئے اور مجھ کو حکم دیا کہ اس کے دروازہ کی نگرانی کروں، اتنے میں ایک شخص آیا اس نے اجازت طلب کی تو حضور نے مجھ سے فرمایا، اس شخص کو اندر آنے دو اور اس کو جنت کی بشارت دے دو، اب یہ شخص اندر آیا

---

۱ طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۱
۲ کتاب المناقب باب فضل ابی بکر
۳ صحیح بخاری باب مناقب عثمان

تو دیکھا کہ یہ ابوبکر تھے، اس کے بعد ایک اور شخص آیا تو اس کی اجازت طلبی پر حضور نے پھر وہی فرمایا: اسے اندر آنے دو اور اسے جنت کی بشارت سنا دو، اب دیکھا تو یہ عمر تھے، اس کے بعد ایک اور شخص آیا اور اس نے اجازت طلب کی تو اس مرتبہ ارشاد نبوی ہوا۔

ائذن له وبشره بالجنة على بلوىٰ ستصيبه [۱]

ابوموسیٰ! تم اس شخص کو اندر آنے کی اجازت دے دو اور جو مصیبت اس کو پہونچنے والی ہے اس پر اسے جنت کی بشارت سنا دو۔

اب یہ شخص اندر آیا تو دیکھا کہ یہ عثمان بن عفان تھے۔

اس روایت کو ابوموسیٰ اشعری سے عاصم الاحول نے بھی نقل کیا ہے، اور اس میں مزید یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ایک ایسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے جہاں پانی تھا اور آپ کا گھٹنا کھلا ہوا تھا، جب عثمان اندر آئے تو آپ نے گھٹنا ڈھانپ لیا [۲]

(۲) دوسرا واقعہ یہ ہے، حضرت انس کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر و عمر اور حضرت عثمان کے ساتھ احد پر چڑھے تو پہاڑ لرزنے لگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے پہلے پہاڑ پر پیر مارا اور پھر فرمایا:) اے احد ٹھہر! تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید ہی تو ہیں [۳]

علامہ ابن کثیر نے البدایہ . . . میں حضرت عثمان کے فضائل و مناقب میں کثرت سے روایات نقل کی ہیں۔ ان میں بھی متعدد روایات ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب ثلاثہ ایک ساتھ ہی نظر آتے ہیں۔

---

[۱] صحیح بخاری باب مناقب عثمان

[۲] ایضاً

[۳] ایضاً

ازواج واولاد

حضرت عثمان کا پہلا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی حضرت رقیہ سے ہوا تھا، ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ تھا۔ لیکن ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو کر جلد انتقال ہو گیا۔ اسی کی نسبت سے حضرت عثمان کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت رقیہ سے پہلے بھی عہد جاہلیت میں حضرت عثمان نے ایک خاتون سے نکاح کیا تھا اور اس کے بطن سے ایک لڑکا تھا جس کا نام عمرو تھا، اس مناسبت سے ان کی پہلی کنیت ابو عمرو تھی، حضرت رقیہ سے ولادت کے بعد ان کی کنیت ابو عبداللہ ہو گئی۔ بہر حال حضرت رقیہ کے انتقال کے بعد حضرت عثمان کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحب زادی ام کلثوم سے ہوا۔ ۳ھ میں، غزوہ بدر جس روز ختم ہوا ہے اسی دن ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالباً ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

اس کے بعد حضرت عثمان نے جن خواتین سے نکاح کیا ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) فاختہ بنت غزوان قبیلہ مضر سے تعلق رکھتی ہیں، ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا اس

کانام عبداللہ الاصغر تھا، نوعمری میں انتقال ہوا۔

(۲) ام عمرو بنت جندب، قبیلۂ ازد سے تعلق تھا، ان سے عمرو، ابان، خالد اور عمر چار لڑکے اور مریم ایک لڑکی پیدا ہوئے۔

(۳) فاطمہ بنت الولید، ام عبداللہ کنیت، قبیلۂ بنی مخزوم، ولید، سعید دو لڑکے اور ام سعید ایک لڑکی ان سے پیدا ہوئے۔

(۴) اسماء بنت ابی جہل بن ہشام: ان سے ایک لڑکا مغیرہ پیدا ہوا۔

(۵) ملیکہ بنت عنیبۃ بن حصن الفزاری، کنیت ام البنین، ان سے صرف ایک لڑکا عبدالملک پیدا ہوا۔ اور جلد ہی انتقال ہوگیا۔

(۶) رملہ بنت شیبۃ بن ربیعۃ: ان سے تین لڑکیاں ہوئیں۔ ام ابان، ام عمرو اور عائشہ

(۷) نائلۃ بنت القرافصۃ الکلبی، ان سے حسب ذیل اولاد ہوئی۔ مریم الصغری، ام خالد، اروی، ام ابان الصغری، اور عنبۃ۔

حضرت عثمان کی شہادت کے وقت یہی موجود تھیں، حضرت عثمان پر قاتلوں نے جب حملہ کیا تو شوہر نامدار کو بچانے کی کوشش میں انھوں نے تلوار کا وار اپنے ہاتھ پر لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی انگلیاں شہید ہوگئیں [۱]

حضرت نائلہ کو اپنے شوہر والا گہر سے اس درجہ محبت اور ان کی مظلومانہ شہادت کا اس درجہ رنج اور صدمہ تھا کہ اگرچہ عرب میں بیوہ عورتوں کے نکاح کرنے کا رواج عام تھا، اس میں نہ مرد کو تکلف ہوتا تھا اور نہ عورت کو، لیکن اس کے باوجود

---

[۱] ہم نے یہ معلومات طبری ج ۴ ص ۴۲۰ و ۴۲۱ اور انساب الاشراف بلاذری ج ۵ ص ۱۰۵ و ۱۰۶ سے اخذ کی ہیں، دونوں کتابوں کی روایات میں کچھ اختلاف تھا ہم نے ان کو جمع کر دیا ہے۔

امیر معاویہ نے حضرت نائلہ کو جو حسن و جمال میں ممتاز و منتخب تھیں نکاح کا پیغام بھیجا تو آپ نے صاف انکار کر دیا اور جب ادھر سے اصرار شدید ہوا تو آپ نے اپنے دو دانت اکھیڑ کر امیر معاویہ کے پاس بھیجدیئے، [۱] مطلب یہ تھا کہ اب تو میں بدصورت ہوگئی، اب آپ کے کس کام کی ہوں۔

نائلہ بنت القرافصہ کے ساتھ حضرت عثمان کے نکاح کے سلسلہ میں ایک عجیب و غریب روایت ابوالفرج الاصفہانی نے لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں: سعید بن العاص نے کوفہ کا گورنر ہونے کے بعد ایک شریف عرب خاندان میں نکاح کیا، یہ خاندان عیسائی تھا، اس کے کچھ افراد مسلمان تھے اور کچھ عیسائی، جس لڑکی سے سعید بن العاص نے نکاح کیا تھا یہ نائلہ بنت القرافصہ کی بہن تھی، اور حسن صورت و سیرت میں انتخاب تھی، حضرت عثمان کو اس کا علم ہوا تو سعید بن العاص کو لکھا کہ اگر تمہاری بیوی کے کوئی بہن ہو اور نا کتخدا ہو تو اس سے میرا نکاح کرا دو" سعید بن العاص نے تعمیل کی اور اپنے خسر القرافصہ سے کہہ سن کر اپنی سالی یعنی نائلہ کا نکاح حضرت عثمان سے کرا دیا [۲]

لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ سعید بن العاص ۳۰ھ میں، یعنی حضرت عثمان کی شہادت سے صرف پانچ برس پہلے کوفہ کے گورنر مقرر ہوئے ہیں اور ایک محتاط اندازے کے مطابق حضرت عثمان کی عمر اس وقت ۷۵ سے کم نہ ہوگی، تو اب سوال یہ ہے کہ آخر اس عمر میں جب کہ تین بیویاں پہلے سے موجود بھی تھیں حضرت عثمان کو مزید ایک اور نکاح کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی، پھر بلاذری کا بیان یہ ہے کہ نائلہ کے بطن سے چار اولادیں ہوئیں، طبری نے ہشام بن الکلبی اور واقدی کی روایت سے دو اور لادوں کا پتہ دیا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو پانچ برس کی مدت میں چھ اولادوں کا ہونا عادتاً مستبعد ہے اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ محمد بن حبیب البغدادی

---

[۱] کتاب المحبر ابن حبیب ص ۳۹۶ [۲] الاغانی ج ۱۵ ص ۷۰ و ۷۱

کے بیان کے مطابق حضرت عثمان کی صاحبزادی ام ابان کا نکاح مروان بن الحکم سے ہوا تھا اور ام ابان حضرت نائلہ کے بطن سے تھیں، اگرچہ اسی نام کی ایک لڑکی رملہ بنت شیبہ کے بطن سے بھی تھیں۔

بہرحال یہ قرائن ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نائلہ بنت الفرافصہ کا نکاح حضرت عثمان سے سعید بن العاص کے کوفہ کی گورنری سے پہلے ہوا تھا نہ کہ اس کے بعد جس کو اغانی نے ایک افسانہ کا رنگ دے دیا ہے۔

داماد

حضرت عثمان کی صاحب زادیوں کا جن حضرات سے رشتۂ ازدواج ہوا اس کا حال نقشۂ ذیل سے ہوگا۔

نمبر	صاحب زادی کا نام	شوہر کا نام
۱	مریم	عبدالرحمن بن ہشام بن المغیرہ
۲	ام عثمان	عبداللہ بن خالد بن اسید
۳	عائشہ	الحارث بن الحکم بن ابی العاص، حارث کے انتقال کے بعد عائشہ کا نکاح عبداللہ بن زبیر سے ہوا
۴	ام ابان	مروان بن الحکم بن ابی العاص
۵	ام عمرو	سعید بن العاص
۶	ام خالد	عبداللہ بن خالد بن اسید ام عثمان کے انتقال کے بعد انکی بہن ام خالد سے نکاح کیا۔
۷	اروی	خالد بن الولید بن عقبہ
۸	ام البنین	ابوسفیان بن عبداللہ بن خالد[۱]

اولاد مذکور میں حضرت ابان بن عثمان بڑے پایہ کے محدث تھے، انھوں نے سیرت میں ایک کتاب بھی لکھی تھی، ہم نے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

---

[۱] کتاب المحبر ابن حبیب ص ۵۵

عہدہ دارانِ خلافت عثمانی

حضرت سعد بن ابی وقاص

سعد نام ابواسحق کنیت، والد کا نام مالک اور ابو وقاص کنیت تھی، قریش کے خاندان بنو زہرہ سے تعلق رکھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ننھیال اسی خاندان میں تھی۔ اس رشتے سے سعد بن ابی وقاص آپ کے ماموں ہوتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس رشتے کا متعدد بار اظہار فرمایا تھا۔ انیس برس کے تھے کہ اسلام کی صدائے سامعہ نواز سے کان آشنا ہوئے تو ایک دن حضرت ابوبکر صدیق کی معیت میں خدمت نبوی میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے، ابتداً مسلمان ہونے والوں میں ان کا نمبر کونسا ہے؟ اس میں اختلاف ہے، لیکن ان کے سابقین اولین میں سے ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اس بناء پر ظہور اسلام کے بعد مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانثاروں کو جن عظیم شدائد و مصائب انگیز کرنے پڑے حضرت سعد ان میں برابر شریک رہے اور پائے استقامت میں کبھی جنبش پیدا نہ ہوئی، پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا

اذن عام دیا تو حضرت سعد بھی ترک وطن کر کے مدینہ آ گئے اور اپنے بھائی عتبہ بن ابی وقاص کے مکان پر فروکش ہوئے جو پہلے سے ہی مدینہ میں آ بسے تھے۔

اب وقت آیا تھا کہ حضرت سعد کے ذاتی اوصاف اور علمی و عملی کمالات جن کو اسلام نے جلا دے کر زر خالص بنا دیا تھا اپنی پوری آب و تاب سے نمایاں ہوں۔ چنانچہ حضرت سعد ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس شوریٰ کے نہایت اہم رکن اور معتمد الیہ تھے تو دوسری جانب میدان جنگ کے نامور شہسوار اور افواج کے بلند پایہ قائد اور کمانڈر بھی تھے، ان دونوں حیثیتوں سے انھوں نے اسلام کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں ان کے مفصل تذکرے تاریخ و سیر کی کتابوں کے جلی عنوانات ہیں، عہد نبوی میں جو غزوات و سرایا پیش آئے ان سب میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا اور کارنامہائے نمایاں انجام دیئے۔ غزوہ احد میں جب ایک موقع پر مجاہدوں کے قدم اکھڑ گئے اور لشکر میں افراتفری پیدا ہو گئی تھی حضرت سعد اس عالم میں بھی ثابت قدم رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کے نرغہ میں تھے اور آپ کے پہلو میں سعد بن وقاص عزم و استقامت کی متحرک تصویر بنے کھڑے تھے وہ قدر انداز غضب کے تھے، سرور کائنات ترکش سے تیر نکال نکال کر سعد کو دیتے جاتے اور فرماتے: یا سعد ارم، فداک ابی وامی، سعد! تم قدر اندازی کرو، میرے والدین تم پر قربان! حضرت سعد نے دشمنوں پر تیر اس چابک دستی سے برسائے کہ اب مطلع صاف تھا۔

عہد نبوی کے بعد خلافت فاروقی میں عراق کی فتح کے سلسلے میں جو عظیم الشان مہمات جنگ ہوئیں ان میں سے اکثر و بیشتر مہمات میں کامیابی کا سہرا حضرت سعد بن ابی وقاص کی غیر معمولی شجاعت و قیادت کے سر ہے، علاوہ ازیں ان میں انتظامی صلاحیت بھی بدرجہ اتم تھی اور وہ اصابت رائے کے لیے مشہور تھے، اس بناء پر حضرت عمر نے عراق و عرب کے مفتوح ہونے کے بعد ان تمام علاقوں کا نظم و نسق بھی آپ کے سپرد کر دیا اور اب آپ سپہ سالار سے ایک عالی مرتبت گورنر ہو گئے، اس حیثیت سے آپ نے متعلقہ علاقوں میں بڑی مفید اور اہم اصلاحات

کیں، پھر عمار بن یاسر کوفہ کی گورنری سے معزول کئے گئے تو حضرت عمر نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کی گورنری پر مامور فرمادیا۔ لیکن ایک انتظامی مصلحت سے وہ اس سے سبک دوش کردیئے گئے، حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو حضرت عمر کی وصیت کے مطابق آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر دوبارہ بنادیا۔ لیکن تین برس کے بعد یعنی ۲۶ھ میں آپ اس خدمت سے سبکدوش کردیئے گئے، ہم کتاب میں اس پر مفصل بحث کرچکے ہیں۔ اب حضرت سعد بن ابی وقاص خانہ نشین ہوگئے۔ فتنہ کے زمانہ میں ناطرفدار رہے، مدینہ سے دس میل کے فاصلہ پر عقیق نامی ایک مقام میں آپ نے ایک عالیشان محل تعمیر کرلیا تھا۔ خانہ نشینی کی پوری زندگی یہیں گزاردی۔ اخیر عمر میں بہت ضعیف اور کمزور ہوگئے تھے، ۵۵ھ میں وفات پائی۔ جنازہ مدینہ لایا گیا اور جنت البقیع میں تدفین عمل میں آئی [1]

حضرت عبداللہ بن مسعود

مشہور صحابی ہیں، فقہائے مدینہ میں ان کا شمار ہوتا ہے، خلافت عثمانی میں بیت المال کے انچارج تھے، حضرت عثمان اور ان کے تعلقات کا تذکرہ کتاب میں گذرچکا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری

اکابر مہاجرین میں سے ہیں، عبداللہ نام اور ابوموسیٰ کنیت تھی۔ والد کا نام قیس اور والدہ کا نام طیبہ تھا۔ یمن کے مشہور قبیلہ اشعریین سے تعلق تھا اس لیے اشعری کہلاتے

---

[1] دیکھیے اسدالغابہ، استیعاب، طبقات ابن سعد اور فتوح البلدان بلاذری، طبری۔ البدایۃ والنہایۃ

تھے. مکہ میں اسلام کا غلغلہ بلند ہوا تو طلب حق میں یمن سے چل کر مکہ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلی ملاقات میں ہی مشرف باسلام ہوئے اور وطن واپس جاکر دعوت و تبلیغ کے کام میں مصروف ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو خیر آباد کہہ کر مدینہ میں قیام اختیار فرمایا تو حضرت ابوموسیٰ اشعری بھی اپنے قبیلہ کے پچاس حلقہ بگوشان اسلام کے ساتھ ترک وطن کر کے بحری راستے سے عازم مدینہ ہوئے، لیکن باد مخالف نے اس قافلہ کو مدینہ کے بجائے حبشہ پہونچا دیا۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد جب مہاجرین حبشہ مدینہ آئے تو ان کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ اشعری اور ان کے ساتھی بھی آئے یہ وہ وقت تھا جب کہ لشکر اسلام خیبر فتح کر کے واپس ہو رہا تھا۔

مدینہ میں قیام پذیر ہو جانے کے بعد حضرت ابوموسیٰ اشعری نے فتح مکہ، غزوہ حنین، غزوہ تبوک اور بعض مہمات میں شرکت کی، پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اقصائے یمن کا رجس میں جند اور عدن شامل تھے، عامل حضرت معاذ بن جبل کو مقرر فرمایا تو ادنائے یمن کی عمل داری حضرت ابوموسیٰ اشعری کی تحویل میں دی اور دونوں کو رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی۔

یسرا ولا تعسرا، بشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا ۱ — تم دونوں لوگوں پر آسانی کرنا، سختی نہ کرنا، ان کو خوشخبریاں سنانا، نفرت پیدا کرنے والی باتیں نہ کہنا، اور باہم مل جل کے رہنا اختلاف نہ کرنا

حضرت ابوموسیٰ اشعری اپنے قبیلہ کے رئیس، نہایت مدبر اور معاملہ فہم انسان اور سب سے بڑی بات یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد علیہ تھے اسی لیے وفات نبوی کے بعد شیخین کے عہد خلافت میں بھی وہ اس عہدہ پر قائم رہے اور اپنے فرائض منصبی خوش اسلوبی

---

۱ صحیح بخاری باب بعث ابی موسیٰ ومعاذ الی الیمن

سے انجام دیتے رہے، لیکن ۱۷ھ میں حضرت عمر نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو بصرہ کی گورنری سے معزول کیا تو ان کی جگہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بصرہ کا گورنر مقرر فرمایا۔ لیکن جب کوفہ والوں کی شکایت پر ۲۲ھ میں حضرت عمار بن یاسر کوفہ کی گورنری سے معزول کئے گئے تو اب حضرت عمر نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو خود اہل کوفہ کی درخواست پر منتقل کر دیا۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد وہ پھر بصرہ بھیج دیے گئے، چنانچہ حضرت عمر کی شہادت (ذی الحجہ ۲۳ھ) کے وقت وہ بصرہ کے ہی گورنر تھے، پھر جب حضرت عثمان مسند آرائے خلافت ہوئے تو فاروق اعظم کی وصیت کے مطابق آپ نے بھی ان کو اسی عہدہ پر قائم رکھا اور وہ ۲۹ھ تک بصرہ کے گورنر رہے۔ آخر عمر میں، واقعہ تحکیم کے بعد، وہ مکہ مکرمہ میں خانہ نشین ہو کر بیٹھ گئے تھے، یہیں ۴۴ھ میں بیمار پڑے اور اسی سال کے ماہ ذی الحجہ میں وفات پائی۔ اس وقت عمر ۶۱، ۶۲ کے لگ بھگ ہوگی [۱]

حضرت ابوموسیٰ اشعری ان خوش نصیب صحابۂ کرام میں شامل تھے، جن کو دربار نبوت میں تقرب خاص حاصل تھا اس بنا پر علم و فضل، اصابت رائے، اور تقویٰ و طہارت کے اعتبار سے وہ نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کتب حدیث میں ان کے بڑے بڑے فضائل و مناقب مذکور ہیں، خلافت عثمانی میں گورنری سے معزولی کے بعد بھی کوفہ میں نماز کی امامت انہی کے سپرد رہی [۲]

امیر معاویہ بن ابی سفیان

حضرت معاویہ ابوسفیان بن حرب کے بیٹے تھے، ان کا نسب پانچویں پشت پر عبد مناف

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ، ذہبی ج ۱ ص ۲۱

[۲] طبری ج ۴

کے واسطہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے، فتح مکہ کے موقع پر اپنے والد کے ساتھ مشرف باسلام ہوئے، یہ عہد نبوی کا آخری زمانہ تھا، اس بنا پر کتابت وحی کی خدمت انجام دینے کے باوجود انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت و تربیت سے بہرہ مند ہونے کا موقع زیادہ نہیں ملا۔ تاہم اسلام ایک پارس کی پتھری ہے، جس شخص میں جو فضائل اخلاق فطری اور جبلی طور پر ہوتے ہیں اسلام ان کو جلا دے کر زر خالص بنا دیتا اور ان کی آب و تاب بڑھا دیتا ہے، اس بنا پر سیاسی فہم و تدبر، حکمرانی، کشورکشائی اور سپہ سالاری ان کے خاندانی اور موروثی اوصاف و کمالات اور ان کے جوہر ذاتی تھے اسلام نے اس کو بادۂ سہ آتشہ بنا دیا۔ اس بنا پر حضرت ابوبکر صدیق نہ صرف معاویہ کے بلکہ ان کے پورے خاندان کے بڑے معترف اور قدردان تھے، اس معاملہ میں حضرت عمر بھی کم نہ تھے، چنانچہ عہد صدیقی اور پھر عہد فاروقی میں شام اور عراق میں جو عظیم الشان معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں ان میں حضرت امیر معاویہ کے نہایت شاندار کارنامے اسلامی فتوحات کی قبائے رنگین کا تکمۂ زریں ہیں، جہاں تک شام میں فتوحات کا تعلق ہے ان میں امیر معاویہ اور ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان دوش بدوش نظر آتے ہیں، خلافت فاروقی میں ان علاقوں کا نظم و نسق بھی حضرت یزید بن ابی سفیان کے سپرد تھا، ۱۸ھ میں جب ان کا انتقال ہو گیا تو حضرت عمر نے ان کی جگہ حضرت معاویہ کو دمشق کا گورنر مقرر فرمایا، پھر حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو جیسا کہ آپ کتاب میں پڑھ آئے ہیں آپ نے امیر معاویہ کو پورے ملک شام کا گورنر بنا دیا جس پر آپ خلافت عثمانی کے اختتام تک رہے اور پھر جب خود خلیفہ ہوئے تو شام کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ خلافت عثمانی میں امیر معاویہ نے جو عظیم الشان حربی اور انتظامی خدمات انجام دیں ان کا مفصل تذکرہ کتاب میں آ چکا ہے، امیر معاویہ نے اپنے سیاسی حریفوں کو شکست دینے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان کو جزوی طور پر قابل اعتراض کہا جا سکتا ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ملک میں جو طوائف الملکی اور انارکی

پیدا ہو گئی تھی امیر معاویہ نے جس عزم و استقامت کے ساتھ اسے ختم کر کے مملکت اسلامیہ میں استحکام پیدا کیا ہے اس نے مسلمانوں کو بیرونی حملوں اور اندرونی فتنہ انگیزیوں کے خطرات سے محفوظ کر لیا۔

انتقال کا وقت قریب آیا تو اہل خاندان کو وصیت کی کہ خدا کا خوف کرتے رہیں، جو خوف خدا نہیں کرتا خدا بھی اس کا مددگار نہیں ہوتا، ساتھ ہی وصیت کی کہ انتقال کے بعد ان کے اموال متروکہ میں سے آدھا مال بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔

رجب سنہ ۶۰ھ میں ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کی وصیت کے مطابق تجہیز و تکفین اسی قمیص مبارک میں ہوئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں عطا فرمائی تھی اور جسے انھوں نے حرز جان بنا کر رکھا تھا، پھر حضور کے موئے مبارک اور ناخن بھی ان کے پاس ایک شیشہ میں بڑی احتیاط سے محفوظ چلے آ رہے تھے وصیت کے مطابق وہ بھی میت کی آنکھ اور دہن میں رکھ دیے گئے، دمشق میں ہی تدفین ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح

قریش کی شاخ بنو عامر بن لوئی سے تعلق رکھتے تھے، شہسواری اور مردانگی میں مشہور تھے، چنانچہ ایک طرف فارس بنی عامر کہلاتے تھے اور دوسری جانب ابطال صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے اور فاتح افریقیہ کے لقب سے شہرت رکھتے ہیں، مکہ ان کا وطن تھا، فتح مکہ سے قبل مشرف باسلام ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو کتابت وحی کی خدمت سپرد کی تھی ان میں یہ بھی شامل تھے، حضرت عمرو بن العاص نے خلافت فاروقی میں جب مصر پر فوج کشی کی ہے تو عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اس فوج کے میمنہ کے کمانڈر تھے پھر حضرت عثمان کے عہد میں مصری فوج کے کمانڈر ان چیف، گورنر اور امیر البحر ہونے کی

کی حیثیت سے جو عظیم الشان جنگی اور انتظامی خدمات انجام دی ہیں ان کا تذکرہ آپ کتاب میں پڑھ ہی چکے ہیں، ۳۴ھ میں ذات الصواری کی مہم سے فارغ ہو کر مشرق کی طرف لوٹ رہے تھے، راستے میں انھیں علم ہوا کہ حضرت عثمان شہید ہو گئے ہیں اور حضرت علی نے مصر کا گورنران کی جگہ قیس بن سعد بن عبادہ کو بنادیا ہے، یہ سنتے ہی انھوں نے اپنا ارادہ فسخ کر دیا اور شام چلے گئے، یہاں یہ گوشہ نشین ہو گئے، حضرت علی اور امیر معاویہ کے درمیان صفین کا جو معرکہ ہوا اس میں کوئی حصہ نہیں لیا، کچھ دنوں کے بعد عسفان میں منتقل ہو گئے، یہیں ایک دن کھڑے نماز ادا کر رہے تھے کہ اچانک روح پرواز کر گئی، رحمہ اللہ

اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۷۳، البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۲۵۰،

اعلام الرجال زرکلی ج ۴ ص ۲۲۰

حضرت ابوالدرداءؓ

عویمر نام تھا، ابوالدرداؓ کنیت تھی، قبیلۂ خزرج کی شاخ عدی بن کعب سے تعلق رکھتے تھے اور اس لیے انصاری تھے، شروع سے طبیعت کے نہایت صالح اور نیک تھے، ۲ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تو عبادت و ریاضت میں اس درجہ استغراق ہوا کہ تجارت جو ان کا ذریعۂ معاش تھی اسے یک قلم ترک کر دیا اور توکلاً علی اللہ زندگی بسر کرنے لگے، لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا: قیامت کے حساب کا ڈر ہے، غزوۂ احد اور بعض دوسرے غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ میں جی نہ لگا اور شام میں سکونت اختیار کر لی اور حضرت عمر کے حکم سے یہاں قرآن و حدیث کا درس دینے لگے، یہ درس اس درجہ مقبول ہوا کہ مرجع عوام و خواص ہو گئے اور طالبان علم کا ہر وقت ہجوم رہنے لگا، قرآن و حدیث میں مہارت اور بالغ نظری کے باوصف فقہ میں بھی ان

کو بڑا کمال تھا۔ اسی وجہ سے خلافت عثمانی میں ان کو دمشق کا قاضی مقرر کیا گیا تھا، نہایت حق گو اور صاف گو تھے، جو فیصلہ کرتے اس کا ادب واحترام اکابر صحابہ اور خود حضرت معاویہ جو شام کے گورنر تھے کرتے تھے، زندگی نہایت سادہ اور درویشانہ تھی، بایں ہمہ ہر وقت ہشاش وبشاش رہتے اور لوگوں سے خندہ روی سے پیش آتے، بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے اور تبسم روئے مبارک پر کھیلتا رہتا، ایک مرتبہ آپ کی بیوی نے کہا: آپ گفتگو کے وقت تبسم کرتے ہیں، یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا، لوگ کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیں، فرمایا: اس میں اعتراض کی کیا بات ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بات کرتے وقت تبسم فرماتے تھے، دمشق کے قاضی القضاۃ اور برگزیدہ عالم وفقیہہ ہونے کے باوجود انہیں معمولی سے معمولی کام میں عار نہ آتی تھی، لوگ اس پر تعجب کا اظہار کرتے تو فرماتے: بھلا اس میں تعجب کی کیا بات ہے، یہ تو ثواب کے کام ہیں، حضرت ابو الدرداء کی کوئی بات حکمت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ راہ میں چلے جا رہے تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ لوگ اسے دشنام دے رہے ہیں، آپ نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے۔ اس پر آپ نے کہا کیا عجیب حکیمانہ بات کہی ہے! ارشاد فرمایا: اگر ایک شخص غلطی سے یا جان بوجھ کر کنوئیں میں گر پڑے تو اس کو نکالنا چاہیے، برا بھلا کہنے سے کیا فائدہ؟ تم اس بات کو ہی غنیمت سمجھو کہ تم اس سے محفوظ رہے، لوگوں نے کہا: تو کیا آپ اس کو برا نہیں جانتے؟ فرمایا: اس شخص میں طبعاً تو کوئی برائی نہیں، البتہ اس کا یہ عمل برا ہے، جب یہ چھوڑ دے گا پھر میرا بھائی ہے

اسد الغابہ ج ۴

حضرت زید بن ثابت

مشہور اور بلند مرتبہ صحابی ہیں، زید نام تھا، ابو سعید اور ابو عبد الرحمن کنیت تھی، قبیلہ

خزرج کی شاخ نجار سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے انصاری ہیں، ان کے والد ہجرت سے پانچ برس پہلے مدینہ میں جو جنگ بعاث ہوئی تھی اس میں مارے گئے تھے، زید نو عمری میں مشرف باسلام ہوئے. قرآن مجید سے خاص شغف تھا، پڑھتے بھی خوش الحانی سے تھے، مدینہ کے پڑھے لکھے لوگوں میں ان کا شمار تھا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت وحی کی خدمت ان کے سپرد کی تھی. کتابت وحی کے علاوہ دربار رسالت میں میر منشی کا عہدہ بھی ان کے سپرد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مختلف زبانوں میں خطوط آتے تھے اور آپ کو انہی زبانوں میں جواب لکھوانا ہوتا تھا۔ اس لیے حضرت زید بن ثابت نے ارشاد نبوی کی تعمیل میں عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھنی شروع کیں تو دو ہفتوں میں اس لائق ہو گئے کہ ان دونوں زبانوں میں بے تکلف تحریر و تقریر کر سکتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے معتمد الیہ تھے، اس لیے پراسرار اور خفیہ خطوط بھی آپ ان سے لکھواتے تھے۔

ماہر بن لسانیات ہونے کے علاوہ علم و فضل میں بھی نمایاں مرتبہ و مقام کے مالک تھے فقہ اور فرائض میں بڑا ادراک و کمال رکھتے تھے، ان کی قرأت قرآن قریش کے لب و لہجہ کے مطابق تھی اور وہ حافظ قرآن بھی تھے، اس لیے حضرت ابو بکر اور پھر حضرت عثمان نے قرآن مجید کی ترتیب و تدوین اور تعین قرأت کی غرض سے علی الترتیب جو کمیٹیاں بنائی تھیں حضرت زید بن ثابت ان کے اہم رکن تھے، علم و فضل کے باعث عہد شیخین میں افتا اور قضا دونوں منصبوں پر فائز رہے، پھر جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو آپ نے بھی ان کو ان عہدوں پر قائم رکھا، فقہ اور فرائض دونوں میں وہ مجتہد کا مرتبہ رکھتے اور اکابر صحابہ ان کے استنباط اور رائے کا بڑا احترام اور لحاظ کرتے تھے، ۴۵ھ میں جب کہ ان کی عمر چھپن چھپن سال کے لگ بھگ ہوگی مدینہ میں وفات پائی۔

عبدالرحمٰن بن خالد بن الولید

اسلام کے مشہور سپہ سالار حضرت خالد بن الولید مخزومی کے صاحبزادے تھے اس لیے اسلامی حمیت وغیرت اور شجاعت وجوانمردی کے اوصاف ورثہ میں ملے تھے چنانچہ حضرت معاویہ کے عہد خلافت میں قسطنطنیہ کا جو مشہور معرکہ ہوا ہے اس میں اسلامی فوج کے کمانڈر انچیف یہی تھے (سنن ابوداؤد ج ا کتاب الجہاد) خلافت عثمانی میں جب شام کو مختلف صوبوں میں تقسیم کر کے ہر صوبہ کا الگ الگ ایک عامل مقرر کیا گیا تو حضرت امیر معاویہ جو پورے شام کے گورنر تھے انھوں نے عبدالرحمٰن بن خالد بن الولید کو حمص کا عامل مقرر کیا۔

حضرت ابوذر غفاری

مشہور اور بلند پایہ صحابی اور سابقین اولین میں سے ہیں، ان کی شہرت زیادہ تر فقر و درویشی اور زہد و ترکِ دنیا کی وجہ سے ہے جس کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو "مسیح الاسلام" کا خطاب عطا فرمایا تھا، لیکن درحقیقت علم و فضل اور تفقہ کے اعتبار سے بھی آپ بلند مرتبہ و مقام کے مالک تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کوئی روایت نقل کرتے تھے تو حضور کے ساتھ غایت محبت اور احساس یگانگت کے باعث آپ کو "خلیلی" میرے دوست "کہتے تھے، شب و روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بسر کرتے، جو کچھ آپ سے سنتے اور آپ کا جو عمل دیکھتے اسے سینہ میں محفوظ کر لیتے، پھر خود بھی چھوٹے بڑے امور کی نسبت سوالات کرتے رہتے تھے اس بنا پر آپ کا سینہ علم نبوت کا گنجینہ ہو گیا تھا، حضرت علی جو خود علم کے بحرِ بے کراں تھے فرماتے تھے " ابوذر نے اتنا علم حاصل کر لیا ہے کہ دوسرے لوگ اس کے حاصل کرنے سے عاجز تھے اور اس تھیلی

کو اس طرح سربمہر کر دیا ہے کہ اس سے کچھ بھی کم نہ ہوا (تذکرۃ الحفاظ ترجمہ ابوذر)
چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو حضرات مدینہ میں ارباب فتویٰ کہلاتے
تھے ان میں حضرت ابوذر غفاری کا بھی نام تھا۔ حضرت عثمان کے عہد میں بھی مفتی کے
منصب پر فائز رہے۔

سیر اعلام النبلاء ج ۱ ص ۳۱

سعید بن قیس

انصاری ہیں، انصار میں سے غزوۂ بدر میں شریک ہونے والوں کے جو نام
حضرت عروۃ بن زبیر سے مروی ہیں اس کے راوی یہی سعید بن قیس ہیں۔

اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۱۵

حضرت عثمان کے عہد میں مالک بن حبیب، ہمدان النسر اور رے (جس کی طرف
نسبت کی وجہ سے امام فخر الدین رازی کہلاتے ہیں) ان کے کلکٹر تھے، یہ ایران کے علاقے ہیں۔

جیش بن دلجہ

۶۵ھ میں وفات پائی، شام کے علاقہ اردن کے رہنے والے تھے۔ اسلامی لشکر
کے نامور قائدین میں ان کا شمار ہوتا ہے، ماسبذان ایران کا ایک شہر جو خلافت فاروقی
میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے زیر قیادت ضرار بن الخطاب کے ہاتھوں فتح ہوا تھا۔
جیش بن دلجہ حضرت عثمان کے عہد میں اس کے کلکٹر تھے۔

حضرت ثمامتہ بن عدی

قریشی تھے، لیکن اس کی کس شاخ سے منسوب تھے اس کا پتہ نہیں چلتا، ان کا نام نامی سابقین اولین کی فہرست میں مذکور ہے، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ہی مسلمان ہو گئے تھے، ہجرت کے بعد غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور اس میں نمایاں حصہ لیا۔ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں صنعاء (یمن) کے گورنر تھے، یہیں آپ کو خلیفہ سوئم کی دردناک شہادت کا علم ہوا تو بے چین ہو گئے، اسی عالم میں لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دینا چاہا تو وفور گریہ سے آواز گلوگیر ہو گئی۔ بڑی مشکل سے صرف اس قدر کہہ سکے: لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں آج خلافت کی جگہ بادشاہت نے لے لی، اب جو شخص جس چیز پر قابض ہو گا وہ اسے ہضم کر جائے گا[1]

جابر بن عمرو المزنی

خلافت عثمانی میں عراق کی ارض سواد سے خراج وصول کرنے کے انچارج تھے اور اس سے پہلے حضرت عمر کی طرف سے بھی اس خدمت پر مامور رہ چکے تھے[2]

سعید بن العاص

سعید بن العاص بن سعید بن العاص بن امیہ، خاندان قریش کے ان نامی گرامی اشراف میں سے تھے جو اپنی فصاحت و بلاغت، شجاعت و دلیری اور جود و سخا کے باعث نہایت نیکنام

---

[1] اصابہ ج ۱ ص ۵۴، استیعاب ج ۱ ص ۹، و اسد الغابہ ج ۱ ص ۲۴۹ [2] طبری ج ۵ ص ۱۳۹

اور مشہور تھے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔

وکان امیراشریفا، جواداً، ممدحاً حلیماً، وقوراً، ذاحزم وعقل یصلح للخلافۃ۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۹۴)

وہ لوگوں کے سردار تھے، شریف اور سخی تھے، ممدوح انام تھے، بردبار اور نہایت باوقار تھے، بڑی سوجھ بوجھ کے اور عقلمند تھے اور خلیفہ بننے کے اہل تھے۔

سخاوت کا عالم یہ تھا کہ کوئی سائل ان کے در سے محروم نہ جاتا۔ اگر عند الطلب مطلوبہ چیز ان کے پاس نہ ہوتی تو سائل کو ایک پروانہ لکھ کر دیدیتے کہ جب وہ چیز ان کے پاس آئے گی وہ اس کو سائل کے حوالے کردیں گے، شمشیر زن اس غضب کے تھے کہ ایک مرتبہ جرجان (ایران) کی جنگ میں انھوں نے ایک دشمن کو تلوار کا وار کیا تو تلوار کاندھے پر سے گذرتی ہوئی اس کی کلائی سے برآمد ہوئی۔ ہجرت نبوی کے برس یا ۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ولید بن عقبہ کی معزولی کے بعد کوفہ کے گورنر ہوئے، پانچ برس کچھ مہینے کم اس عہدہ پر فائز رہے، اس مدت میں جنگ کر کے طبرستان اور جرجان کو فتح کیا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جو خانہ جنگیاں ہوئیں ان میں بالکل غیر جانبدار رہے، امیر معاویہ کے عہد خلافت میں مدینہ کے گورنر مقرر کئے گئے۔ ۵۹ھ میں وفات پائی۔ (اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۱۰ و ۳۰۹)

قعقاع بن عمرو التمیمی

ارض سواد یعنی عراق میں جو جنگی کارروائیاں ہوئیں حضرت عثمان کی طرف سے ان کے انچارج تھے، عہد فاروقی میں ایرانیوں سے جو معرکہ آرائیاں قادسیہ میں ہوئیں ان میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے، میدان جنگ میں رن پڑتا تھا تو شیر کی طرح غراتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر نے فرمایا: لشکر میں قعقاع کی آواز ایک ہزار مردوں کی آواز پر بھاری ہے، ان کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت موجود تھا۔ (اسد الغابہ ج ۴ ص ۲۰۷)

عبداللہ بن عامر بن کریز: خلافت عثمانی کے نہایت نامور اور فاتح گورنر تھے۔ حضرت عثمان کے ماموں زاد بھائی تھے، بچپن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیے گئے تو ارشاد قدسی ہوا: "یہ بچہ ہم سے ملتا جلتا ہے" یہ فرماکر حضور نے اپنا لعاب دہن بچہ کے منہ میں ڈالا اور اس کے لیے اثر بد سے محفوظ رہنے کی دعا فرمائی۔ طبعاً نہایت سخی اور فیاض تھے اور بہادر کس غضب کے تھے؟ اس کا حال کتاب میں گذر چکا ہے۔ ۲۹ھ میں جب یہ بصرہ کے گورنر مقرر ہوئے ہیں ان کی عمر ۲۴ یا ۲۵ برس تھی، رفاہِ عام کے کاموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ بصرہ میں ایک بازار بنانے کا ارادہ کیا تو اس مقصد کے لیے بہت سے گھر خریدے اور منہدم کئے (اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۹۱)

جریر بن عبداللہ البجلی: قرقیسیا ایران کا ایک شہر جس کا اصل نام کرکیسیا تھا معرب ہو کر قرقیسیا ہوگیا، ۱۶ھ میں حضرت سعد بن وقاص نے مدائن سے عمرو بن مالک الزہری کی قیادت میں ایک لشکر بھیج کر اس شہر کو صلحاً فتح کیا تھا (معجم البلدان ج ۴ ص ۳۲۸) جریر بن عبداللہ البجلی اس شہر کے عامل یعنی کلکٹر تھے: بجیلہ یمن کا ایک قبیلہ ہے اس سے تعلق رکھنے کے باعث بجلی کہلاتے ہیں۔ بڑے پایہ کے صحابی ہیں، خوب صورت اور حسین و جمیل اس درجہ کے تھے کہ حضرت عمر ان کو یوسف ھٰذہ الامۃ کہتے تھے، ۵۱ھ میں وفات ہوئی۔

اسد الغابہ ج ۱ ص ۲۸۰

اشعث بن قیس: یہ قبیلہ کندہ کے سردار تھے، غلبۂ اسلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف باسلام ہوئے، جنگ یرموک میں یہ بھی شریک تھے۔ فتنۂ مانعین زکوٰۃ میں ملوث ہونے کے باعث جب یہ گرفتار ہوکر مدینہ آئے تو حضرت ابوبکر صدیق نے انھیں رہا کیا اور اپنی بہن ام فروہ کو ان کے نکاح میں دیدیا۔

خلافت عثمانی میں ایران کے علاقے آذربائیجان کے گورنر تھے، نہایت بہادر، مدبر، اور اعلیٰ درجہ کے شہسوار تھے، صحیح بخاری اور مسلم میں ان کی روایت کردہ احادیث کی تعداد انیس ہے۔ ۴۰ھ میں وفات ہوئی۔ (اسد الغابہ ج ۱ ص ۹۷)

عبداللہ بن ابی ربیعۃ القرشی المخزومی: عہد جاہلیت میں اس کا نام بحیر تھا، فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام عبداللہ رکھا، بڑے قبول صورت اور خوش منظر تھے، عہد نبوی میں یمن کے علاقہ میں جند نامی مقام اور اس کے اطراف واکناف کے گورنر مقرر ہوئے۔ وہ اس عہدہ پر خلافت شیخین میں بھی رہے۔ البتہ حضرت عمر نے یمن کا دار الحکومت صنعا بھی ان کی تحویل میں دے دیا تھا، حضرت عثمان جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے بھی ان کو اس عہدہ پر برقرار رکھا، نہایت شجاع اور بہادر تھے حضرت عثمان کے محصور ہونے کی خبر سنی تو فوراً مدد کرنے کی نیت سے روانہ ہو گئے، مکہ کے قریب پہونچے تھے کہ اچانک گھوڑے پر سے گرے اور جاں بحق ہو گئے۔

(اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۵۵)

عقبہ بن عامر: اس نام کے دو صحابی ہیں۔ ایک کی نسبت جھنی ہے اور دوسرے کی الانصاری السلمی، یہاں مراد اول الذکر ہیں۔ کیونکہ عقبۃ بن عامر الانصاری السلمی جنگ یمامہ میں جو خلافت صدیقی میں ہوئی شہید ہو گئے تھے، حضرت عثمان نے ان کو بیت المال کا انچارج مقرر کیا تھا۔ انھوں نے خود اپنے مسلمان ہونے کا واقعہ بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو میں اس وقت بکریاں چرا رہا تھا۔ حضور کو دیکھتے ہی لپک کر خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور بیعت کر لینے کی

درخواست پیش کی۔ آپ نے دریافت فرمایا: "تم کون ہو؟" میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اب آپ بیعت کر لینے پر رضا مند ہو گئے تو ارشاد ہوا: "تم کیسی بیعت کر رہے ہو، یعنی اعرابیوں کی سی یا مہاجرین جیسی" میں نے عرض کیا: مہاجرین کی بیعت جیسی!" اب آپ نے ان سے بیعت لی۔ قرآن مجید بڑی خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ ان سے متعدد صحابہ اور تابعین نے احادیث روایت کی ہیں (اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۷۰)

یعلی بن امیہ بن ابی عبیدہ التمیمی الحنظلی: یہ موروثی طور پر صاحب اقتدار تھے اور سخی اور دولت مند بھی، فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور طائف، حنین اور تبوک کے غزوات میں شریک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ نگاری شروع کی ہے۔ مکہ کے باشندے تھے عہد صدیقی میں حلوان کے کلکٹر تھے، حضرت عمر نے ان کو نجران کا کلکٹر بنایا، پھر حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو آپ نے اسی عہدہ پر ان کو یمن بھیج دیا۔ اور یہ صنعا میں قیام پذیر رہے۔ کہتے ہیں: یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے یمن میں کلکٹری کے زمانہ میں حضرت عثمان کے حکم سے کعبہ کو دو غلاف پہنائے تھے۔ ۳۷ھ میں وفات پائی۔

(اسد الغابہ ج ۵ ص ۱۲۸ و سیر الاعلام النبلاء ج ۳ ص ۶۲)

السائب بن الاقرع: قبیلہ بنو ثقیف سے تھا۔ ان کے شرف و مجد کے لیے یہی کیا کم ہے کہ جب ان کی والدہ بچپن میں انھیں خدمت نبوی میں لے کر حاضر ہوئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر دست مبارک پھیرا اور دعا فرمائی خلافت عثمانی میں اصفہان کے کلکٹر تھے وہیں ان کا انتقال ہوا اور ان کی نسل وہیں آباد ہو گئی۔

(اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۴۹)

حبیب بن مسلمۃ بن مالک الفہری المتوفی ۴۲ھ: کنیت ابو عبد الرحمٰن تھی مکہ میں پیدا ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تھی، ان کا شمار حضرت خالد بن ولید اور حضرت ابو عبیدہ

بن جراح کی طرح نامور سپہ سالاروں اور جنگ آزماؤں میں ہوتا ہے، خلافت صدیقی میں حضرت ابوعبیدہ کے لشکر کے ساتھ شام گئے اور داد شجاعت دی اور ان کے ساتھ دمشق میں داخل ہوئے، جنگ یرموک میں بھی شریک تھے۔ حضرت ابو عبیدہ نے انطاکیہ کا انتظام ان کے سپرد کر دیا تھا، عہد فاروقی میں سرزمین ایران ان کے تاخت وتاراج کی آماج گاہ بنی، بعد میں حضرت عمر نے انھیں جزیرہ کا گورنر مقرر کیا اور ارمینیہ بھی ان کی تحویل میں دے دیا تھا۔ خلافت عثمانی میں آذربائیجان میں بغاوت ہوئی تو اس کو ختم کرنے کے لیے حضرت عثمان نے انھیں کو بھیجا تھا۔

ابوالاعور بن سفیان حضرت عثمان کے حکم سے شام کا ملک مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، امیر معاویہ پورے ملک کے گورنر تھے۔ انھوں نے ملک کے ان صوبوں کے لیے الگ الگ جو عامل مقرر کئے تھے ان میں سے ایک ابوالاعور بن سفیان بھی تھے جو اردن کے عامل مقرر کئے گئے تھے ان کا نام عمرو بن سفیان تھا مگر کنیت سے مشہور ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ان کو شرف صحبت نبوی حاصل تھا، لیکن ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ یہ صحابی نہیں ہیں، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست روایت کی ہوئی ان کی حدیثیں مرسل ہیں۔ کہتے ہیں کہ غزوۂ حنین میں بحالت کفر شریک تھے۔ بعد میں مسلمان ہوئے۔

(اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۰۹ و ج ۵ ص ۱۳۸)

عبداللہ بن الحضرمی: مکہ میں عامل تھے

القاسم بن ربیعۃ الثقفی: طائف میں عامل تھے جو مکہ مکرمہ سے بارہ فرسخ کے فاصلہ پر نہایت سرسبز وشاداب مقام ہے۔ بنو ثقیف یہیں رہتے تھے۔

کتابیات

قرآن و حدیث و فقہ

(۱)	القرآن المجید		
(۲)	الاتقان فی علوم القرآن	جلال الدین سیوطی	
(۳)	تاویل مشکل القرآن	ابو محمد بن قتیبہ	دار التراث، قاہرہ
(۴)	الجامع الصحیح	امام بخاری	دہلی
(۵)	الجامع الصحیح	امام مسلم	
(۶)	سنن ابوداؤد		
(۷)	سنن ترمذی		
(۸)	مسند امام احمد بن حنبل		مصر
(۹)	مسند ابی عوانہ		حیدرآباد
(۱۰)	مستدرک حاکم		"
(۱۱)	فتح الباری	ابن حجر العسقلانی	مصر
(۱۲)	موطاء امام مالک		
(۱۳)	المصفی شرح موطاء شرح امام مالک	شاہ ولی اللہ	
(۱۴)	ازالۃ الخفا	شاہ ولی اللہ	
(۱۵)	المحلی	ابن حزم الظاہری	
(۱۶)	کنز العمال	محمد طاہر الفتنی	

تاریخ و سیر

(۱)	تاریخ طبری	ابن جریر طبری	قاہرہ

(۲)	تاریخ کامل ابن اثیر	ابن اثیر
(۳)	طبقات ابن سعد	ابن سعد
(۴)	فتوح الشام	واقدی
(۵)	سیرت ابن ہشام	ابن ہشام
(۶)	البدایۃ والنہایۃ	ابن کثیر
(۷)	فتوح البلدان	بلاذری
(۸)	الامامۃ والسیاسۃ	ابن قتیبہ
(۹)	الدرر فی المغازی والسیر	ابن عبدالبر
(۱۰)	عیون الاخبار (قلمی)	
(۱۱)	تاریخ بغداد	خطیب بغدادی
(۱۲)	تہذیب التہذیب	ابن حجر العسقلانی
(۱۳)	المحبر	ابن حبیب
(۱۴)	اسواق العرب فی الجاہلیۃ والاسلام	سعید الافغانی
(۱۵)	الفخری	ابن طقطقا
(۱۶)	مروج الذہب	مسعودی
(۱۷)	تاریخ یعقوبی	یعقوبی
(۱۸)	معجم البلدان	یاقوت حموی
(۱۹)	وفاء الوفاء	سمہودی
(۲۰)	فتوح مصر واخبارہا	ابن عبدالحکم
(۲۱)	تاریخ الخمیس	
(۲۲)	تاریخ ابن خلدون	ابن خلدون
(۲۳)	الاصابہ فی احوال الصحابہ	حافظ ابن حجر العسقلانی

(۲۴) اسد الغابہ — ابن اثیر

(۲۵) الاستیعاب — ابن عبدالبر

(۲۶) انساب الاشراف — بلاذری — بیت القدس

(۲۷) تذکرۃ الحفاظ — ذہبی — حیدرآباد دکن

(۲۸) کتاب الفتوح — ابن اعثم الکوفی — حیدرآباد دکن

(۲۹) اعلام الرجال — خیرالدین زرکلی

(۳۰) دائرۃ المعارف — فرید وجدی — قاہرہ

(۳۱) الکنیٰ والاسماء

(۳۲) الاسلام والحضارۃ العربیہ — کرد علی

(۳۳) موارد تاریخ طبری مقالۃ جواد علی فی مجلۃ المجمع العلمی العراقی ج ۳

(۳۴) البدءِ والتاریخ

(۳۵) التاریخ الکبیر — امام بخاری — حیدرآباد دکن

(۳۶) سیر اعلام النبلاء — ذہبی

(۳۷) مقدمہ ابن خلدون — ابن خلدون دار احیاء التراث العربی، بیروت

(۳۸) الدولۃ العربیہ الاسلامیہ — علی حسن الخربوطلی — قاہرہ

(۳۹) فجر الاسلام — احمد امین — مصر

(۴۰) ضحی الاسلام — احمد امین — مصر

(۴۱) الذکری الالفیہ للشیخ الطوسی — ایران

(۴۲) کتاب الفہرست — ندیم

(۴۳) کشف الظنون — حاجی خلیفہ

(۴۴) ظہر الاسلام — احمد امین